www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیوار کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے درختوں پر چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

یہ چڑیاں سب اس کی دیکھی بھالی تھیں۔ بیلا ان سب کو صبح آنکھ کھلتے ہی آپس میں لڑتے جھگڑتے ایک ایک تنکے کے پیچھے گتھم گتھا ہوتے دیکھتی تھی۔ سورج کی مری مری سی ضیائی کرن سیدھی اس کی آنکھ میں گھستی۔

ہر روز سونے سے پہلے وہ سوچتی تھی' آج کھڑکی کے پٹ بند کر کے سوؤں گی۔ لیکن وہ اس کھڑکی سے نظر آنے والے جھلملاتے نیلے آسمان سے پہلے جدا ہونے کو تیار نہ تھی۔

رات بھر کی تھکان اور رت جگے سے بوجھل سرخ آنکھیں اس نے کھڑکی سے باہر غل مچانے والے پرندوں پر مرکوز کر دیں۔ وہ اس کی بے چینی' اذیت' کرب ہر چیز سے بے نیاز کچی جامنیں توڑ کر فرش پر ڈھیر کر رہے تھے۔ اس نے رات بھر کی مسلی چادر پائنتی پر گرا کر کھڑکی پاٹوں پاٹ کھول دی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے ہلکورے لیتے درخت اور درختوں کے پیچھے بہت آہستگی سے ابھرتا سورج تو اس کا اپنا ہی تھا۔

حالانکہ اب تو اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اس کے دل نے تنبیہہ کی تھی۔ درخت اجڑتے ہیں یا فرش بگڑتے ہیں' اس کی بلا سے۔ اس کو اینٹوں اور سیمنٹ سے بنے اس مکان پر کوئی جذباتی حق نہیں ہونا چاہیے۔

تھکی سستی اور بے زاری سے بے دار ہوتی صبح نے سارے شہر میں تہلکہ مچا کر رکھ دیا۔ اخبار والے' جمعدار' دودھ والے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میونسپل کمیٹی کے ٹرک پر سات آٹھ جمعدار اونچے قد کی جھاڑوئیں لے کر سڑک کو ٹریفک شروع ہونے سے پہلے چمکانے کی جدوجہد میں تھے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ٹریفک کا سیلاب گھروں سے کیچڑ پہیوں میں لپیٹ کر نکلے گا اور سرمئی سڑک کو غلاظت میں لپیٹ کر چل دے گا۔

یہ سڑک بھی اس کی ساتھی تھی۔

اور سائیکلوں پر سوار ٹین کے ڈبوں میں دودھ بیچنے والے بھی۔

تیز تیز پیڈل مارتا وہ جواں ہمت اخبار والا بھی۔ جو بچوں کے جہاز کی طرح ایک اڑان میں اخبار دیوار سے اوپر چھت تک پھینک ڈالتا۔ ہاں ایک وقت تھا جو اس کو اخبار کی شدت سے ضرورت تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی اخبار اٹھا کر سیڑھیاں چڑھ جاتی۔ لیکن اب کوئی خبر کوئی واقعہ ایسا نہیں رہا تھا جو نیا ہو جس کو سننے کی خواہش رہ گئی ہو۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ برآمدے میں ٹرالی کی رگڑ کے ساتھ برتنوں کی چھن چھن اس بات کی علامت تھی کہ آیا اماں جان گئی ہیں کہ وہ جاگ رہی ہے۔ آیا اماں کے دل میں وہ کلاک رکھا ہے جس کا ایک سرا اس کی پلکوں سے جڑا ہے۔ ادھر اس کی آنکھ کھلی ادھر دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجائیے اماں۔" اس نے چہرے سے ساری تھکان دھو کر بشاشت سمیٹ لی۔ ان افسردہ لوگوں کو مایوسی میں لپیٹ دینے کا کیا فائدہ؟ انسان اپنا زرہ بکتر پہنے رہے تو محفوظ بھی رہتا ہے اور لوگوں کی ترس کھاتی نگاہوں سے بچا بھی۔

سو اس نے خوش خلقی اور مسکراہٹوں کے خول میں آیا اماں کو ریسیو کیا۔

"آج تو بہت کام ہیں آیا اماں۔ اور ریل کار سے پھپھو کو لینا ہے۔ بخشی چاچا کو یاد دلا دینا۔ مجھے کہیں جانا ہے ضروری۔"

"تم جاگ گئیں بیٹا؟" آیا اماں نے اس کی تقریر پر توجہ ہی نہ دی۔

"رات نیند ٹھیک سے آئی؟"

آیا اماں نے پاپا کے بعد سے یہ فقرہ اپنی عادت بنا لیا تھا۔ ان دونوں نے شک سے ایک دوسرے کی سرخ آنکھوں کو دیکھا۔ پھر وہ نظریں بچانے لگیں۔

"یاد ہی ہو گا بیٹا۔" آیا اماں نے بہت گہرا سانس لیا۔

"وہ کوئی پہلی مہمان تو آنہیں رہیں۔"

واقعی۔ ابھی کچھ دن پہلے اس گھر میں جو کہرام مچا تھا۔ وہ تھوڑا انہیں پڑا تھا۔ لوگ بڑی مصیبتوں سے دور دراز کے سفر کر کے پاپا کا پرسہ دینے آتے لیکن اس کے دل میں آگ لگا کر رخصت ہو لیتے۔ وہ آنسو بہا کر اپنے آپ کو چوک میں نہیں کھڑا کرنا چاہتی تھی۔ اس کو بیماری کے سارے اعزاز سمیٹنے کا شوق تھا شاید اسی لیے تائی اماں نے جاتے ہوئے اس کے خوب لتے لیے تھے۔ ان کے گمان میں وہ [illegible] نہایت بے لگام اور خود غرض لڑکی تھی۔ جو باپ کی ناگہانی وفات پر آنسو بہانے کے بجائے اس لیے خوش خوش پھر رہی تھی کہ وہ اچانک اتنی بڑی دولت کی مالک بن گئی ہے۔

وہ خاموش رہتی تھی۔

تائی اماں کے ساتھ ولید بھائی تھے۔

حالانکہ ولید بھائی اسے کبھی برے نہیں لگے۔ وہ جب بھی ان کے ہاں آتے سوغاتوں سے لدے پھندے وہ اس کو چھوٹی سی بچی سمجھ کر مذاق [illegible] نہیں آتے تھے۔ اور یہی تائی اماں تھیں جو

ولید بھائی کے حملوں سے اپنے بیٹے کی پناہ میں لیے انہیں برا بھلا کہتی رہتیں۔

"اے بہٹ کم بخت۔ کیا دیوانہ ہوا ہے؟"

زندگی انہی دیواروں اور چھتوں کے نیچے تبدیل ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ حفاظت اور پناہ کا احساس اینٹ مٹی سے نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ہی ہوتے ہیں جو ہمیں ہر طرح کی آفت سے پناہ میں لیے رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس کے تمام عزیزوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ تائی اماں کا بھی نہیں۔ وہ اس کو لینے ہی تو آئی تھیں۔ صدقے قربان ہوتی اور اپنے شوہر مرحوم کی آخری نشانی کی وفات پر بین کرتی۔ بے وقوفی تھی تو پیلا کی تھی۔ جو اس نے چکراتے اور بوکھلاتے سر کے ساتھ سب کے سامنے سارا کچا چٹھا رکھ دیا۔

وہ یہ سمجھ بھی نہ پائی کہ ولید بھائی نے اچانک آنکھیں کیوں پھیر لیں۔ اور تائی اماں کو اس کی ذات میں ہر طرح کا کیڑا کیوں نظر آنے لگا۔ حالانکہ ابھی پاپا کی زندگی میں وہ ان کی زندگی کا مرکز تھی۔

وقت انسان کو بہت جلدی معتبر بنا دیتا ہے۔ شاید اسی لیے پھولوں میں ہلکورے لیتی لڑکیاں کانٹوں کے چبھنے پر بھی واویلا نہیں مچاتیں۔

ماموں قیم اسے لینے آئے تو اتنی عقل اس میں آگئی تھی کہ ساری رام کہانی سنانے کے بجائے اس نے محبت بھری معذرت کر لی۔

"کوئی بات نہیں ماموں۔ یہاں نوکر سب پرانے ہیں اور یہ گھر ہے۔ اور یہ گوشی بھی تو ساتھ ہی میں رہتی ہے۔ یہ ہر وقت خیریت معلوم کرنے آتی رہتی ہے۔ ہاں جب بھی دل گھبرایا آپ کے پاس ضرور آؤں گی۔"

وہ رخصت ہوتی ممانی کی آنکھوں کی نفرت پلکیں جھپک جھپک کر ٹالتی رہی۔

تو گویا خاندان بھر کی نظر میں پیلا خود سر گستاخ اور نری بدتہذیب ہونے کی شہرت پا چکی تھی۔

ان کی دیوار کے اس طرف گوشی وغیرہ اس وقت آکر آباد ہوئے تھے جب ابھی وہ بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔

انکل ٹرانسفر ہو کے ان کے شہر میں آئے تو اس نئی جگہ پر نہ ان کا دل لگتا تھا نہ آنٹی کا۔ یہ پاپا ہی تھے کہ جن کی وجہ سے اجنبی شہر بھی اپنا بن گیا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے پیلا کی ماں مرض الموت میں مبتلا ہوئی تھیں۔ انہی لوگوں نے زندگی کے آخری ایام میں ان کی خدمت کی۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے پاپا کو اس حالت میں دیکھا تھا۔

شام کو ایکسر سائز کے لیے لان میں دوڑتے تو وہ ساتھ دوڑتی۔ وہ دن بھر کی رپورٹ سنا نہ لیتی تو بے چین رہتی۔ کالج کے قصے 'دوستی کی باتیں' بے وقوف گوشی کی حماقتیں' پھر وہ برآمدے میں آکر پسینہ پونچھنے لگتے تو وہ بڑی شان دار چائے بنا لاتی۔

"گوشی۔" چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے وہ وہیں دیوار کے نیچے آکر چلاتی۔

گوشی اسٹول پر چڑھ کر دیوار پر لٹک جاتی۔ وہ جانتی تھی ایسا ہی ایک اسٹول دیوار کے دوسری طرف انہی مقاصد کے لیے پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ وہ دیوار سے اچھل کر اسٹول پر اور اسٹول سے زمین پر آجاتی۔

ٹرے میں ہمیشہ تین پیالیاں موجود رہتیں۔

"اماں۔" وہ پروٹسٹ کرتی۔ "خالی چائے انکل۔" وہ چلاتی۔ "کیا اس حقیر چائے کے لیے آپ مجھے آوازیں دے رہے تھے۔"

"تم بہت موٹی ہو رہی ہو گوشی۔ اماں [illegible] رہے ہیں لیکن میں جان بوجھ کر چھوڑ آئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوں۔" بیلا اترائی۔

پاپا اپنی ساری ایکسٹرا سائز بھول کر اپنی پلیٹ میں گوشی کے چھپا کر لائے پکوڑے بھر لیتے۔ وہ دونوں شرط لگا کر کھاتے اور جانے ان میں سے جیتتا کون تھا۔ پھر شام کو پاپا نہا دھو کر اپنی بزنس کمیونٹی کے ساتھ کلب نکل جاتے۔

ممی کے انتقال کے بعد بیلا کو گوشی کے گھر سے آگے کہیں جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ وہ پاپا کے آنے سے پہلے پوری شام بیڈمنٹن کھیل کر گزارتیں کہ گوشی نے آج پھر زیادہ کیلوریز لے لی تھیں۔

بیلا کے ساتھ پاپا کا بس یہی شام بھر کا ساتھ ہوتا لیکن اس رتی بھر ساتھ میں بھی کوئی چیز ادھوری نہیں رہ جاتی تھی۔

پھر وہ اور گوشی ہوتیں سو شرطیں لگا کر کتابیں پڑھتیں۔

نئی ترکیبیں باورچی خانے میں تختہ مشق بنتیں۔ اتنی کہ رحیم چاچا عاجز آجاتے۔ ان کے خیال میں اتنی اچھی لڑکیوں میں سلیقہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ جس دن وہ کوئی چٹپٹی سبزی بناتیں۔ اس دن آباورچی خانہ برتنوں سے اور کوڑے کی ٹوکری سبزیوں کی اترن سے بھر جاتی۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر چیختی چلاتیں لیکن ہمیشہ ایک آنچ کی کسر رہ جاتی۔ کبھی کارن فلور ڈالنا یاد نہ رہتا۔ کبھی سبزیوں میں پچھ چلل کر بھرتہ بن جاتا۔

ٹی وی کی بے ہودہ سے بے ہودہ نشریات بھی کشن پیٹ میں ٹھونس کر بیٹھے دیکھنا بہت اچھا لگتا۔

پاپا رات گئے آتے۔ وہ کبھی بزنس اور اس کے جھمیلے ساتھ نہیں لاتے تھے۔ سوائے منیجر صاحب کے گھر میں کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ لیکن گھر میں کسی عورت کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ باہر کے لوگوں کی گھر میں آمد و رفت کو یا ان کے جگہ جگہ پھرتے رہنے سے خوف زدہ ہوتے تھے۔

دراصل اپنی ذات پر سے ان کا اعتبار اٹھتا جا رہا تھا۔ وہ شاید بیلا کو کھونا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ لوگ سر کھا کھا کر اپنے کمرے میں چلی جاتیں تو پاپا آفس والے کمرے میں جا بیٹھتے۔

انہوں نے کسی قسم کی پابندیاں عائد نہیں کی تھیں۔ لیکن بیلا سمجھتی تھی کہ پاپا کسے پسند کریں گے۔

گوشی دندناتی ہوئی سیڑھیاں پار کرتی جا دھمکتی۔ پاپا جانتے تھے وہ چیختی چلاتی رہے گی۔ اسی لیے ان کو کاغذات سمیت کریپن ہولڈر میں اٹکا کر اس کی طرف متوجہ ہونا پڑتا۔

"آخر آپ لوگ کتنا پیسہ کمانا چاہتے ہیں؟"

"دیکھو بی بی۔" وہ رسان سے سمجھاتے۔ "پیسہ کمانے کے لیے کوئی ٹارگٹ نہیں ہوتا۔ آپ کسی بزنس مین کو یہ نہیں سمجھا سکتے کہ آپ کا ہدف یہ ہے۔ بس اتنا پیسہ آپ کو کمانا ہے۔"

"اگر تم لوگ کچھ دن کے لیے میرا سر کھانا چھوڑ دو تو میں بہت بڑے پراجیکٹ پر کام کر رہا ہوں۔ اتنے اہم اوراق پراجیکٹ پر کہ۔۔۔ اور یہ بیلا کہاں گئی جو تم میرا سر کھانے آگئی ہو۔" وہ رسانیت سے اتر کر جھنجلانے لگے۔

"کچھ نہیں۔ صرف ایک تقریر ہی کرنی تھی۔"

☼ ☼ ☼

پھر اس دن آفس میں انہوں نے ڈاکٹر بشارت کو فون کر کے بلایا۔ وہ ایک مدت سے پاپا کے دوست تھے۔ اور جب آجاتے تو گھر بھر کا جنرل چیک اپ ان کے ذمہ ہوتا حتیٰ کہ وہ گوشی کے ابو کو بھی بری نہیں کرتے تھے۔

وہ نیچے آکر بہت خفا ہوئے۔

انہوں نے بیلا کو الگ جھاڑا۔ "اپنے باپ کا ٹمک چیٹی بگی سب کچھ بند کر دو ایک دم۔"

اس نے کیمپس جاتے جاتے پہلی مرتبہ اپنے باپ کا چہرہ اترا اترا دیکھا۔

"پاپا۔ انکل بشارت کس بات پر ناراض ہو رہے تھے؟"

"انکل بشارت ناراض ہونے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں بیٹا۔ بشارت کو میڈیکل کی ڈگری کوڑے کے ڈھیر سے پڑی ملی تھی۔ پہلے اس کا نام کچھ اور تھا ڈگری مل جانے پر بدل لیا ہے۔"

وہ پاپا کی بشاشت بھری طبیعت سے آگاہ تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں اسے شک سا ہوا۔ وہ ایسے ہی شگفتہ نظر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بعض چیزوں پر شک کا فائدہ ہمیں شدید نقصان پہنچاتا ہے۔

اس لیے اگر وہ اس وقت پاپا کی شگفتگی کے دھوکے میں نہ آتی تو اتنا بڑا نقصان نہ اٹھاتی۔

منیجر صاحب بوکھلائے ہوئے گھر آئے تو دنیا اپنے اپنے کاموں میں تھی۔ بیلا گوشی کیمپس تھیں۔ گوشی کے ابو آفس تھے اور اماں پڑوس میں ملنے ملانے کے چکر میں۔

بیلا اتنے بڑے طوفان کا اتنی نرم مزاجی سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کیمپس سے واپس آئی تو کتنی دیر تک اس نے سفید چادر اوڑھے پاپا کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اسے لگا اس کی بصارت ختم ہو رہی ہے۔ زمین آسمان گنڈمڈ ہو کر چکرا رہے ہوں۔

☼ ☼ ☼

"تم ہمیشہ کی کام چور اور کاہل ہو۔" گوشی دیوار سے اسٹول کے سہارے چھلانگ مار کر اتری۔

"تمہیں پتا تھا آج تمہیں ہر حال میں کیمپس جانا ہے۔ ابو چلے گئے ہیں۔ ساری صبح وہ ہارن بجاتے رہے خود تو جاؤ گی بسوں سے دھکے کھاتی۔ مجھے خوامخواہ خوار کرو گی۔ رحیم چاچا۔ ناشتا۔"

وہ کرسی گھسیٹ کر میز بجاتی۔

بیلا جانتی تھی وہ کیوں چلاتی ہے۔ کیوں بار بار غصے میں آجاتی ہے۔

صرف اس لیے کہ گھر میں پڑے اس جمود اور سناٹے کو توڑ دے۔ ہم آنکھیں بند کر کے بھی تو آسانی سے مسائل سے بھاگ لیتے ہیں۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ اس گھر سے ایسا کوئی شخص غائب نہیں ہوا۔ جس کے بغیر یہ دنیا تتر بتر ہو جائے۔

"اگر آج کا لیکچر مس کیا تو کل سے میں تمہارا انتظار نہیں کروں گی۔" وہ کسی بے ضرری چیز کو لڑھکا دیتی۔ سناٹے میں ارتعاش پیدا ہوتا۔

لیکن یہ بہت عارضی بہت مصنوعی ہوتا۔ حقیقت آنکھیں پھاڑے ایسے نظریں کترانے والوں کو گرفت میں لینے کی منتظر رہتی۔

کیا اس طوفان بدتمیزی سے بلائیں ٹل جاتی ہیں؟

حقیقت چھپ جاتی ہے؟

گوشی کا خیال تھا وہ دھاڑیں مار کر روئے گی۔ بے ہوش ہو جائے گی اور شاید اس صدمے کو سہارنے کے لیے زندہ بھی نہ رہ سکے۔

لیکن اس نے جس استقلال اور جرات سے اس مصیبت کا سامنا کیا اس نے گوشی کو بوکھلا دیا۔

اس سے تو اچھا تھا وہ سینہ کوبی کرتی بال نوچتی اور جاہل عورتوں کی طرح چلا چلا کر بین کرتی۔ لیکن یوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خاموش رہ کر اپنا سینہ شق نہ کر لیتی۔

وہ مجبوری نہیں تھی۔ اسے دکھاوا پسند نہیں تھا اور وہ بھک منگی بھی نہیں تھی۔

اسی لیے اس نے عام اور معمولی لوگوں کی طرح اپنے باپ کے صدمے کو چیخ چلا کر نہیں منایا۔

نہ ہی اس نے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ باپ کی موت نے اس کو ویران کر دیا ہے نہ ہی اس کو لوگوں کی مجبوری کی خیرات چاہیے تھی اس کو خیرات میں ملے ایسے کسی کندھے کی ضرورت نہیں تھی جس پر سر رکھ کر وہ آنسو بہا سکے۔

پھر بین کرنے، رونے دھونے سے اسے ملتا بھی کیا۔ سوائے ترس کھاتی تماشا دیکھتی نظروں کے۔ جھوٹی ہمدردی، روکھے دلاسوں کے۔

باپ تھا تو وہ بالکل بچی تھی، باپ نہ رہا تو وہ خود باپ بن گئی۔

بابا نے اسے کس مصیبت کس رکھ کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ وہ لاڈلی تھی۔ اس کے حصے کے سارے دکھ وہ خود جھیل کر ایک پر سکون سکھ بھری پھولوں کی ٹوکری اس کے لیے لے آتے تھے۔

لیکن بابا نے اس کو جینے کا راستہ خود ایکٹ کر کے دکھایا تھا۔

وہ صابر آدمی کا رول کرتے تھے۔ وہ بہادر آدمی کی طرح اسٹیج پر آتے تھے۔ وہ باہمت اور پر استقلال آدمی کی ایکٹنگ کرتے تھے۔

ان کے ماسک یہیں تو پڑے تھے۔ قدم قدم پر اس کی راہ میں بکھرے۔

اس نے سکون سے ایک ایک غلاف اپنے وجود پر چڑھا لیا۔ وہ ویسی ہی بن گئی تھی باوقار اور پر تمکنت۔

جس دن سے لوگ بابا کو کندھوں پر اٹھا کر لے گئے تھے گھر رنگ برنگے لوگوں سے بھر گیا تھا۔ کئی مرتبہ گوشی کے ابو نے مہمانوں کے درمیان بداخلت کی۔ کتنی مرتبہ کتنی ہی چیزوں پر آنٹی نے بے ساختہ ٹوکا۔ بھانت بھانت کی عورتیں پاکستان بھر سے اکٹھی ہوئی تھیں۔ لیکن بیلا بڑی مہارت سے ایک ایک کو سنبھال رہی تھی۔

یہ بھی ایک ریہرسل تھی، وہ زندگی سے تنہا جینے اور تنہا لڑنے کا اصول سیکھ رہی تھی۔

وہ نہایت خاموشی اور بردباری سے گھر میں جمع سینکڑوں عورتوں کی بھانت بھانت کی بولیاں سنتی ان کی ناز برداریاں کرتی رہی۔ وہ جیسے سب کی سب کسی ولیمہ پر آئی تھیں۔

کوئی بڑھیا کوتے میں کولہا لیے پڑی تھی۔ لمبے سفر سے اس کا کولہا اتر گیا تھا۔

کسی کو گیس کی پرانی شکایت تھی اس کو بار بار پیش کردہ نسخوں کو مدنظر رکھ کر خوراک مہیا کرنی پڑتی۔ آپا اماں اور رحیم چاچا کے چلتے چلتے پاؤں گھس گئے تھے۔

کسی کا انڈہ ناشتے میں زیادہ پک جاتا تھا، کسی کا کم رہ جاتا۔

کچھ لوگوں کو ناشتا اپنے کمرے میں کرنے کی عادت تھی کچھ لان میں کرتے۔ کوئی ٹرالی کھنچوا تا۔ کوئی کھانے کے کمرے میں آتا۔

رحیم چاچا کے بقول وہ بابا کی عمر بھر کی کمائی ان کے دسویں سے پہلے پہلے تیا پانچہ کر کے ہی جانا چاہتے تھے۔ اس پر ان کی نہ ختم ہونے والی شکایتیں۔

”ہم تو بھئی بی بات بھائی کا گھر سمجھ کر آ گئے تھے۔“

”ارے سب منہ دیکھے کے لحاظ ہوتے ہیں۔ ادھر آنکھ بند ہوئی اور دنیا نے ناتا توڑا۔“

وہ تحمل سے ایک ایک کی شکایت سنتی۔ بوقت ضرورت [illegible] اور رحیم چاچا کو تنبیہ کرتی۔ ان سب

کی مزاج پرسی کرتی جیسے وہ اس کے پلار سے بلائے گئے چہیتے ملنے والے تھے۔

ہاں رات کی تاریکی اس کی اپنی تھی۔

وہ ہلکی سی کھڑکی کھول دیتی۔ درختوں کے پیچھے اپنا سفر جاری رکھتا چمکیلا چاند، ہر ایک غم فکر سے بے نیاز اپنے دھندے سے لگا ہوتا۔ دنیا اپنے جھمیلوں سے بے نیاز ہو کر سو چکی ہوتی تھی، ایسے میں وہ جی بھر کے رو لیتی کہ دیکھنے والوں کے لیے صرف ایک چمکیلا گولا ہی تھا جسے دنیا داری نبھانی نہیں آتی۔ جو غمگساری تو نہیں کر سکتا لیکن دنیا کے سامنے اس کے دکھڑے بھی نہیں کھولتا تھا۔

چاند کے پیچھے پیچھے سیاہ مستقبل اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

بھیانک اور کتنا طویل اور کتنا عریض، کون جانے، یہ تو وقت کی آنکھیں بھی ناپ نہیں سکتی تھیں۔ وہ جن لوگوں کو جانتی تھی، ان پر بھروسہ کرنے کا درس بابا نے اسے نہیں دیا تھا۔ وہ خاموش چارپائی پر پڑی چھت پر آنکھیں گاڑے زندگی کے مختلف پلان بناتی رہتی۔

رات بھر جیسے گھٹا برسے اور صبح آسمان زمین دھل دھلا کر نکھر جائیں۔

وہ صبح اٹھتی تو تازہ دم اور ہشاش بشاش لگتی تھی۔ ساری مجبوریاں محرومیاں وہ ایک جھٹکے سے بستر میں جھاڑ کر ہلکی پھلکی ہو جاتی۔

وہ باہر آتی تو جمائیاں لیتے مہمان مختلف کمروں سے بے زار صورتیں بنائے ادھر سے ادھر گھومتے ہوئے نظر آتے۔

بچی صبح صبح تازہ پھولوں کا گلدستہ نوچنا شروع کر دیتیں۔

”کیسی حیران ہاری لڑکی پالی تھی بھئی۔ ہر چیز کو کر کر دیکھتی ہے۔ کمرے میں پھول سجانا اچھا رہتا ہے۔“ پھر لوگ خشل سکھاتے سکھاتے دعوت دینے لگے۔

”آپ کچھ دن تو ٹھہرتیں بچی!“

وہ کسی رخصت ہوتی مہمان خاتون سے اصرار کرتی۔

”کتنا تو کہا تھا تم سے چلو، چلو۔“ وہ ایک رکھائی سے کندھا جھٹک کر بکھری چیزیں سمیٹنے لگیں۔

”تم تو سمجھتی ہو بھئی تمہیں ساتھ لے جانے میں شاید ہمارا ہی کوئی فائدہ ہے ہم تو بابا دو مراہٹ کی وجہ سے کہتے ہیں۔ ایک سے دو بھلے۔“

اسے ان کے خلوص پر کوئی شبہ نہیں تھا لیکن وہ اس گھر کو چھوڑ کر جی نہیں سکتی تھی۔ اس وقت تو اس کو کم از کم ایسا ہی لگتا تھا۔ وہ ان کی پیار بھری مہربانیوں کا کیا جواب دیتی۔

جانے اسے کیوں ایسا لگتا تھا جیسے لوگ کٹے کٹے ہیں۔ ان کی آنکھیں ان کی زبان کا ساتھ نہیں دیتیں وہ جب بولتے ہیں تو آنکھیں جھکا لیتے ہیں اور جب آنکھیں کھولتے ہیں تو منہ بند کر لیتے ہیں۔

بچی ادھر ادھر ہوتیں تو خالہ اس کا گھیراؤ کر لیتیں۔

”کیا کہہ رہی تھیں یہ بچی تمہاری۔ تمہیں ساتھ لے جانے کو کہہ رہی ہوں گی۔ اونہہ۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خالہ کے بچے نے شیشے کی آرائشی میز پر انڈا کھایا کم تھا گرایا زیادہ تھا۔ وہ چپ چاپ کیمیکل سے شیشے کی رگڑائی کر کے چمکانے لگی۔

”تمہیں تو معلوم نہیں نا۔“ انہوں نے کہنی مار کر اسے متوجہ کیا۔ ”تم تو چھوٹی تھیں جب مرحومہ بہن اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ یوں دیکھو تو دور پار کی رشتے داری لیکن سچی بات کے کہنے اور سننے میں فرق ہے سگی بہنوں سے زیادہ پیار کیا ارے [illegible] کوئی بیٹا ہوتا تو تمہاری ناز و نخرے اٹھاتی۔“ وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مرحومہ کے ذکر پر تھوڑی سی آزردہ ہو گئیں۔

"انہوں نے کبھی ان سسرالیوں کو اتنا سر نہیں چڑھایا تھا۔ ارے یہ تو سب کھانے کے مارے آتے ہیں، بھوکے، ندیدے، بھنکتے اور سچی بات یہ کہ تمہاری ددھیال والوں نے بھی مرحومہ سے اچھا سلوک نہیں کیا کبھی۔ تمہارے مرحوم باپ تو یوں کہو فرشتہ تھے۔ انہوں نے تو بھولے سے بھی کبھی کسی کی شکایت نہیں کی۔ وہ تو خدا نے پردہ رکھ لیا۔ عزت رہ گئی۔ اب تو یہی کہیں گے سب 'غریب کی عمر اتنی تھی۔ ارے کیسی کم سنی میں گئی۔ معصوم بھولی بھالی میوں کو ہو بہو ببیلا کی تصویر تھی۔"

"ارے ہاں سچی کہوں، وہ جتنی محبت مجھ سے کرتی تھی غریب، جب میں دن بھر کو بھی آجاؤں ملنے تو جانے تھوڑا دیتی تھی۔ "نہیں آپا رہ جاؤ" "آپا دو دن رہ جاؤ" "آپا تین دن رہ جاؤ" ببیلا نام کس نے رکھا تھا، میں نے ہی تو رکھا تھا۔" دوسری خالہ سے پہلی خالہ کو شدید اختلاف ہوتا۔

"ارے ہٹاؤ۔ تم کہاں تھیں؟ تم تو خود اپنا لیے پڑی تھیں۔ یہ تو اللہ رکھے بھائی صاحب نے ان سے پوچھا انہوں نے تجویز کیا۔" سسرال کی لڑائی ختم کر کے پھر آپس میں شروع ہو گئی۔

اس نے خاموشی سے بکھرے برتن سمیٹ لیے۔ یہ جھگڑا اب طول پکڑ جائے گا، چاچا رحیم کو بار بار تاؤ آجاتا تھا، ان کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ ڈوئی اٹھا کر وہ سب رشتہ داروں کو چلتا کرتے۔ اسے وقفوں وقفوں سے ان کو بھی ٹھنڈا کرنا پڑتا تھا۔

پرہیزی اور غیر پرہیزی کھانوں کی لمبی فہرست جب ان کے سامنے رکھی جاتی تو وہ بڑبڑانے لگتے۔ اور کسی پر ان کا بس نہ چلتا تو پاپا کی قبر پر جی بھر کر روتے تھے۔

سچی بات یہ بھی تھی کہ بھرا پرا شور مچاتا ہنگامے کرتا یہ گھر اسے بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ کان پھاڑتی آوازیں تنہائی کے خوفناک بھوتوں سے ہزار درجے بہتر ہوتی ہیں۔

کمروں کے علاوہ لاؤنج میں، برآمدوں میں، ڈرائنگ روم میں، وہ جہاں سے گزرتی جگہیں لوگوں اور ان کے سامانوں سے بھری ملتیں۔ حالانکہ وہ جانتی تھی انہیں ایک دن جانا ہے لیکن یہی اکیلے پن کا خوف پھر اس کا زرہ بکتر توڑ کر اسے بزدل بنانے کی کوشش کرتا۔

ہاں اسے معلوم تھا انجام کار ایک دن ان سب کو بوریے بستر باندھ کر چلے جانا ہے۔ لیکن اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کا یہ جانا کس حساب کتاب میں پڑے گا۔

تائی اماں نے فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ اپنے دیور کا دسواں بڑے تزک و احتشام سے کریں گی۔ ارے اس خاندان کا وہ آخری چراغ تھا اور مرحوم نے قسمت سے اولاد نرینہ بھی نہیں چھوڑی جو اس کی نام لیوا ہوتی اور اتنی بڑی جائیداد کی وارث ہوتی۔

اس کو تو یوں شامیانے لگانا اور دیگیں چڑھانا بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے دل پر کوئی برچھیاں مار رہا ہو، لیکن کوٹھی کے ابوا سے خاموش کراتے رہتے تھے۔ یہ ہنگامہ عارضی ہے۔ آخر وہ چلے جائیں گے اور مہمانوں کو بہ رضا و رغبت بھگتنا ہی پڑتا ہے۔

دوپہر کا کھانا شام تک چلا۔ تائی اماں شامیانے کے پاس کمر پر ہاتھ رکھے ہدایات دیتی رہیں۔

"ارے دیکھیو۔ کسی کو بوٹیوں کی شکایت نہ ہو۔"

شام ہوئی تو بچی کھچی دیگیں لوڈر پر لاد کر یتیم خانے پہنچا دی گئیں۔

اور شاید یہی ضبط کی وہ گھڑی تھی جس میں بس ایک مہمان کے ہاتھ سے ڈور چھوٹ گئی۔

وہ تو مہمانی کی فرمائش پر کافی پھینٹ رہی تھی۔ کیونکہ ان کے بقول رحیم چاچا کافی اچھی نہیں بناتے

تھے۔ اور آج کے کام نے ایک ایک آدمی کو تھکا کر چور چور کر دیا تھا۔ وہ ٹرالی گھسیٹتی برتن لگا کر لائی۔ تو اس شور و غل میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بہت دیر بعد اسے کچھ خدا کے احکامات اور کچھ شریعت کے قاعدے سنائی دیے۔ کبھی کبھی پاکستان کے قانون کا لفظ بھی سنائی دیتا رہا۔

آپا اماں بڑبڑ کرتیں اپنی کوٹھڑی میں جا بیٹھیں۔

تو یہ یوں تھا، وہ بہت دیر بعد سمجھ پائی۔

یہاں وراثت کا قانون زیر بحث تھا۔ چونکہ وہ پاپا کی نرینہ اولاد نہیں تھی لہٰذا اس کے پاس خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق چوتھائی حصہ آتا تھا۔ باقی حصہ ورثا میں تقسیم ہونا چاہیے ورنہ خدا اپنے فیصلوں کی حکم عدولی کرنے والوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے۔

یہ ایک قیامت کی گھڑی تھی۔ اس میں پڑھے لکھے، ان پڑھ، مہذب، غیر مہذب ایک ہی قطار میں کھڑے ایک ہی جیسے لگ رہے تھے۔ پاپا کا یہ گھر بھی ان کے لیے حمام ثابت ہوا۔

ان میں سے کوئی بھی پاپا کے سگے تھے نہ سگی تھی۔ ہاں کچھ زیادہ دور کے رشتے دار تھے، کچھ کم دور کے۔ اب ان کو یہی بات ثابت کرنا تھی کہ وہ پاپا سے کتنے کم سے کم دور تھے۔

وہ خاموش ایک طرف کونے میں تپائی پر بیٹھی اس حشر کو تھمتا دیکھنے کی منتظر تھی۔ کہ دروازے پر زور سے بیل ہوئی۔

اس وردی پوش ڈاکیے نے جو شاذ ہی اس گھر میں آتا تھا، زوردار بیل کی۔

لمحہ بھر کے لیے بیل کی اس شدت نے سب کو ہلا دیا۔ ہر شور مچاتا شخص خاموش ہو گیا۔ وہ ایک رجسٹرڈ لیٹر لایا تھا۔

پیلے رنگ کے سبز پیشانی والے عدالتی کاغذوں اور مہروں والے پیڈ کے ساتھ اور بھی بہت سے کاغذ ملفوف تھے۔ وہ چونکہ سب ایک ہی جگہ تھے لہٰذا لفافہ مہمانوں کے عین درمیان کھلوایا گیا۔

وہ ان کاغذوں، رسیدوں اور عدالتی گواہوں کا ایک ایک نقطہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ البتہ محفل میں بیٹھے سب لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔

وہ تو نادان تھی۔ لیکن مہمانوں میں کوئی اتنا احمق نہیں تھا۔ وہ تلملا کر برسنے لگے۔ ببیلا سے برہم ہو گئے۔ "اتنی بڑی بات اور ہم سے چھپا کر رکھی گئی۔"

"ہمارا مذاق بنایا گیا۔ ہم سے اچھا دھوکا کیا۔"

"آخر کیا ہوا؟ کیا لکھا ہے؟ یہ چیز کیا ہے؟" وہ ہر ایک سے حیرت سے پوچھتی۔

"ارے یہ تو ننھی ہیں جیسے جانتی ہی نہیں۔"

"ارے تمہارے بابا ساری جائیداد اپنے پارٹنر کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں۔ اور تو اور یہ گھر بھی تمہارا نہیں ہے۔ خالہ 'یہاں سو جاؤ' خالہ 'یہ لے لو' خالہ 'وہ کر لو' ہونہہ۔"

"ہٹو چپ کرو۔ مجھے دیکھنے دو۔" وہ لفافہ اتنی مرتبہ محفل میں گھوما جیسے کسی نئی نواب کی محفل میں حقہ۔

اور وہ، جھپٹ جھپٹ کر اور پڑھ پڑھ کر رسید کیے کاغذ، کافی والی ٹرالی کے پاس چر مر پڑے رہ گئے۔ اب کوئی بھی ان کاغذوں میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا، جیسے مرا ہوا سانپ، نہ کوئی اس کو مارنا چاہتا تھا، نہ اٹھانا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ نے غلط پڑھا ہے، غلط سمجھا ہے۔"

وہ کاغذوں کی مشکل ادق زبان میں الجھی ایک ایک کو پکڑتی رہی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معلوم نہیں کیسے اطلاع اڑتی اڑتی گوشی کے ابو تک پہنچی۔ وہ سارے کام چھوڑ کر بے جھجک ان کی نجی محفل میں آ گئے۔

"ذرا میں یہ کاغذات دیکھ سکتا ہوں؟ دراصل ان کی کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں تھی۔"

"انکل جمشید۔ انکل جمشید۔"

وہ امید کی کرن آنکھوں میں چھپائے ایک ٹک ان کی صورت دیکھتی رہی۔

انکل جمشید نے چشمہ صاف کر کے لگانے اور کاغذات پڑھنے میں جتنی دیر لگائی وہ لمحہ لمحہ پل صراط پر گرتی اور سنبھلتی رہی۔ انہوں نے ایک لفظ کہے بغیر کاغذات میز پر گرا دیے۔

وہ ساکت رہ گئی۔ اس کے اردگرد سے دیواریں سرک گئیں۔

زمین شق ہو گئی۔ آسمان ہل گیا۔

وہ خلاؤں میں نابود سہارے کو محتاج ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔

"پاپا اتنی بڑی بات مجھ سے چھپا نہیں سکتے۔ یہ ضرور کوئی دھوکا ہے۔ کوئی غلط فہمی ہے۔"

وہ اپنے کھڑے قد سے ایک دم ڈھے گئی۔ وہ اتنی کمزور تو نہیں تھی لیکن بند ہوتی کھلتی آنکھوں سے جب بھی اس نے دیکھا لوگ اس کے گرد جمع ہوتے۔

پھر بارش بادل چھٹنے لگے۔

"مجھے تو بٹی اجازت دو۔ فائزہ کے امتحان نزدیک ہیں۔ وہ تو میں مشکل سے چھٹی لے کر آئی تھی۔" تائی امی نے گود میں رکھا اس کا سر احتیاط سے واپس تکیے پر رکھ دیا۔ "پھر ان شاء اللہ امتحانوں کے بعد دوبارہ آؤں گی۔ اور دیکھو میں کہے دیتی ہوں اب تم میرے ساتھ رہو گی۔"

لیکن وہ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہریں۔ بیمار آدمی رقیق القلب ہوتا ہے۔ کون جانے کب اس کی محبت جوش میں آئے اور وہ اٹھ کر چل ہی دے' وہ سو گئی۔ جاگی تو خالہ کا بستر تیار تھا۔

"دھیان رکھنا اس کا۔" وہ سرہانے بیٹھی گوشی کو ہدایتیں جاری کر گئیں۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں' دودھ پلانا' یخنی دیتے رہنا۔ میرا تو اپنا جی اس میں لگا رہے گا۔" خالہ نے رقت سے کہا۔

"وہ تو ان کی بیماری کی اطلاع نہ آئی ہوتی تو میں ایسے کیسے چلی جاتی۔ اور دیکھو خط لکھواتی رہیو دوسرے تیسرے دن۔" پھر ان کی روانگی کا صدمہ دور نہ ہوا کہ چچی نے جانے کی ٹھانی۔

ان کے کرایہ داروں نے پھر تنگ کرنا شروع کر رکھا تھا۔ گھر میں لڑکیاں اکیلی ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔

اور پھپھو کے ساتھ بھلا یہ ہوا کہ ان کو اترنے سے پہلے اطلاع ہو گئی۔

ان کے بجائے تعزیت کا بڑا تفصیلی خط آیا تھا۔ جس میں اس کی محرومی اور ستم کی تفصیلات لکھی تھیں اور یہ بھی کہ تمہارے پاپا نے جانے کیا سوچ کر اتنی بڑی غلطی کی۔ کہ اب نہ گھر ہے نہ ٹھکانا۔ نہ کمائی کا کوئی ذریعہ۔ پتا نہیں تم کیسے جیو گی؟ میرے پاس ایک کمرہ تو ہے لیکن اس میں آج کل ایک میرے سسرالی عزیز ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کے رخصت ہوتے ہی میں تمہیں لکھ کر بلوا لوں گی۔

وہ پتا نہیں کتنے دن لیٹی رہی اور کتنے دن سوتی رہی۔

لیکن جب وہ اٹھی تو اس کا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ تہی داماں خالی ہاتھ دامن جھاڑ کر رہ گئی۔ ڈاکٹر بشارت' انکل جمشید' گوشی' آپا اماں۔

وہ آنکھیں بند کر کے ایک ایک کی شکل دیکھتی۔

"گوشی۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے مذاق کیا ہے۔ یہ کاغذ جھوٹے ہیں۔"

"لیکن میں تمہارے ساتھ جھوٹ نہیں بولوں گی بیلا۔" وہ پیار سے سمجھاتی۔ "وکیل صاحب' منیجر صاحب' سب نے ان کاغذوں کو جانچ لیا۔ واقعی پاپا نے سب کچھ اپنے پارٹنر کو دیا ہے۔ سوچنے والی بات صرف یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ یہ زندگی ہے کوئی کہانی نہیں۔"

"زندگی تو کہانیوں سے بھی گئی گزری ہوتی ہے۔"

پھر کئی مرتبہ انکل جمشید کے ساتھ منیجر صاحب آتے۔ کتنی مرتبہ وکیل صاحب کے سامنے گھر کی پیمائش ہوتی۔ چیزوں کی لسٹ بنتی۔ کتنی مرتبہ وہ بے دردی گفتگو اس کے کانوں میں پڑتی۔

وہ سب لوگ ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے تھے۔ وکیل صاحب خاموشی سے فائل اس کے سامنے پھیلا دیتے۔

"اس کو ٹیلی کر کے دستخط کر دیں۔"

وہ میکانکی انداز میں فائل کے کسے کھولتی' مطلوبہ جگہ کھنگالتی اور دستخط ٹھونک دیتی۔

"اس گرمی میں بچے مری جانے کو کہہ رہے ہیں۔ تم بھی چلو' دل گھبرایا تو آ جانا۔" وہ مسکراتی رہتی۔

پھر منیجر صاحب آتے' وہ آتے تو بیٹھتے نہیں تھے جیسے وہ ہمیشہ اس کے پاپا کے سامنے مودب رہتے تھے۔ اسی اہتمام سے وہ اس کو عدالت کے کاغذات دکھاتے رہتے۔

ان سب نے بالاتفاق فیصلہ کیا تھا کہ انکل کے اس فیصلے کو عدالت میں چیلنج کیا جائے گا۔ اسی طرح سچ اور جھوٹ سامنے آئے گا۔ بیلا بھی جانتی تھی سب کچھ اس طرح کھلے گا۔ لیکن کب کھلے گا؟

"اس مہینے کے آخری ہفتے میں ہمیں یہ گھر خالی کرنا ہے۔" منیجر صاحب ڈرتے ڈرتے کہتے۔

اور جب تک جھوٹ سچ نہیں کھل جاتا' وہ کہاں جائے۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" وہ خوش خلقی سے مسکرا دیتی۔

"اور ہاں۔" وہ چلتے چلتے پلٹ آتے۔ "زوا آپ کو پوچھ رہی تھی بی بی! وہ کہہ رہی تھی پاپا کی زندگی میں تو آپ کبھی آ بھی جاتی تھیں۔ اب تو بالکل ہی آنا چھوڑ دیا ہے بلکہ اس نے مجھے کہا تھا میں آپ کو ساتھ لے کر آؤں۔"

"میں ضرور آؤں گی کسی دن منیجر صاحب۔ لیکن ابھی نہیں۔"

پھر ڈاکٹر بشارت اس کے چیک اپ کے لیے آتے' وہ ہری گھاس پر وسیع آسمان کے پس منظر میں بڑی دل شکستہ سی دکھائی دیتی۔ لیکن وہ جلدی سے مسکرا دیتی۔

"اب میں بالکل ٹھیک ہوں انکل بشارت۔" وہ جلدی سے کہتی تھی۔

"اگر ٹھیک ہو تو کیمپس جانا شروع کرو۔" وہ اس کا بی پی چیک کرتے۔

"لیکن پرابلم یہ ہے۔۔۔" وہ کانوں سے اسٹیتھسکوپ اتار لیتے۔ "کہ کیمپس یہاں سے بہت دور ہے۔ ہاں ایسا کرو ہم ہماری طرف شفٹ ہو جاؤ۔ علی کے پاس بائیک ہے۔ آنے جانے میں سہولت رہے گی۔ پھر کب چلو؟"

ہاں اس مہینے کا آخر۔ یہی آخری تاریخ ہے۔

پھر وہ جی جان سے اٹھ گئی۔ یہ گھر فروخت ہو گیا تھا لیکن اس گھر کے جھنجٹ باقی تھے۔

اسے سر دست اپنا ضروری سامان پیک کرنا تھا' پاپا کی اہم چیزیں سنبھالنا تھیں اور باقی چیزوں کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کسی نہ کسی طرح ڈسپوز کرنا تھا۔
وہ مسکراتی ہوئی ایک ایک مسئلے سے علیحدہ علیحدہ نمٹتی رہی۔
سب سے پہلے اس نے پاپا کے کمرے کے سامان کی طرف توجہ دی۔ اسے اپنی یادوں کی ایک فائل بنانی تھی جس میں سب سے پہلے اسے پاپا کی یادوں کو سنبھالنا تھا۔
پاپا کی الماری میں ممی کی ضرورت کی بہت سی چیزیں سینت سینت کر رکھی تھیں۔ ان کی کچھ چوڑیاں تھیں شادی کا دوپٹہ تھا۔ استعمال شدہ صابن تھا' چھوٹی سی ڈائری اور پین تھا۔
اس نے پاپا کی چیزیں کھنگالیں۔ ان میں سے کچھ بھی اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ پاپا کا پائپ' ان کی پسند کے تمباکو' ان کے ٹینس شوز' ان کا جاگنگ ڈریس۔
ہر چیز ایک مدھری خوشبو سے مہک رہی تھی۔ یہ رومال' یہ ٹائی وہ فلاں سوٹ کے ساتھ پہنتے تھے۔ یہ جوتے ان کے پسندیدہ تھے۔ ہاں ان کی پسندیدہ شو کمپنی تھی۔
یہ ان کی ڈائری تھی اور وہ ان کا قرآن۔
اور اس شیلف میں سب ان کی پسندیدہ کتابیں تھیں۔
وہ کون سی چیز ضائع کرے اور کس چیز کو ساتھ لے جائے۔ یہاں تو ایک ایک شے قیمتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ کوٹ بھی جو آخری دن تک وہ پہنے ہوئے تھے۔ وہ بے ساختگی میں اٹھی اور کوٹ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
وہ بڑا ظالم تھا جس نے پاپا کا یہ گھر خرید لیا۔
لیکن کتنا مہربان تھا کہ اس کو یادوں کی اس مسلسل اذیت سے نجات دلا گیا۔ شاید پاپا کی غیر موجودگی میں وہ اس گھر میں ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی تھی۔
"تمہیں فوری طور پر یہ گھر خالی کر کے ادھر آ جانا چاہیے۔" گوشی اس کو بستر پر لٹا کر چادر اوڑھاتی بڑبڑانے لگی۔ "اس طرح تو تم بیمار پڑ جاؤ گی۔ بار بار کی یہ تکلیف مذاق نہیں ہے۔"
"سردست گھر بالکل خالی کرنے کی ضرورت نہیں۔" وکیل صاحب آئے "جب تک عدالت کوئی حتمی فیصلہ نہ کرے۔ آپ قیمتی سامان ایک کمرے میں بند کر کے تالا ڈال دیجیے یہ تالا گواہوں کی موجودگی میں لگے گا۔ اسے توڑنا قانوناً" جرم ہو گا۔"
وہ سب کیا کہتے تھے اور اس کے بارے میں کس طرح سوچتے تھے۔ وہ ان سب باتوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ اسے یہ گھر خالی کرنا تھا' اس کا یہی فرض ہے۔
صبح سے سب اس کا انتظار کرتے رہے۔ اور وہ اپنی گاڑی لے کر بینک کے کام نمٹانے چلی گئی۔ اس کے اکاؤنٹ میں حیرت انگیز حد تک رقم موجود تھی۔ جو اس کو زندگی بھر چلانے کے لیے تو کافی نہ ہوتی لیکن کسی ایک وقت تک جب تک وہ کسی کے گھر رہے۔ اس کو بوجھ بننے سے نجات دلا سکتی تھی۔
وہ صبح سے شام تک کام میں اس طرح جتی رہتی جیسے کسی خوش آئند مہمان کے استقبال میں وہ گھر سجاتی پھر رہی ہو۔
اس نے ممکنہ چیزیں فروخت کر دی تھیں۔
کچھ چیزیں لوگوں کو بخش دی تھیں۔ یا خیرات کر دیں۔
جب بھی گوشی آتی وہ پاگلوں کی طرح کام میں جتی رہتی۔ اس نے مدت سے کچھ کہنا سننا چھوڑ دیا تھا۔ اسے شبہ سا ہوتا کہیں وہ سچ مچ پاگل ہی نہ ہو گئی ہو۔

آزمائش کی اس تاریخ تک وہ اسی تن دہی سے کام میں لگی رہی۔ 23 کو اس نئے مالک کی آمد سے قبل ہی اس نے خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔
وہ سب لوگ اس کے ارد گرد تھے۔ جو اس کے اپنے تھے۔ کبھی کبھی زندگی اتنی تلخ ہو جاتی ہے کہ آپ کے اپنے اور پرایوں کو علیحدہ علیحدہ نمایاں کر دیتی ہے۔
وہ سب کے سب باہمت تھے اور چھوٹی لڑکی کی ہمت بندھانے کے لیے جی بھر کے ہنستے مسکراتے تھے۔ اس گھر میں آخری دن ان سب نے مل کر منایا تھا۔ لیکن ایک دوسرے سے نظریں چراتے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے جیسے کوئی بڑا واقعہ اس گھر میں نہیں ہونے والا۔
منیجر صاحب نے تالے چیک کیے اور چابیاں وکیل صاحب کے حوالے کر دیں۔ انکل جمشید کونوں کھدروں میں کسی ضروری چیز کے باہر رہ جانے کی فکر میں جتا جھانکتے رہے۔
ڈاکٹر بشارت اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر باہر آئے۔ وہ کسی بھی خوفناک واقعے سے خوفزدہ اس کے ساتھ چل رہے تھے' بھائیں بھائیں کرتا خاموش سناٹے میں کھڑا گھر مکینوں کو بڑی خاموشی سے دیکھتا رہا۔
یہ گھر بھی کتنا خاموش سامع ہے۔ گوشی نے دکھ سے سوچا۔ ایک وقت تھا جب اس گھر نے پاپا کو ممی بیاہ کر لاتے دیکھا تھا۔ پھر اس گھر نے ایک دن پیار کا پہلا بیج بویا تھا۔ ممی جب ہسپتال سے بیلا کو گھر لائی ہوں گی وہ دن اس چار دیواری کے لیے کیسے مسرت بھرا ہو گا۔ پھر اسی گھر سے وہ خاموشی سے رخصت ہو لیں۔ اس گھر نے پاپا کو بھی خاموشی سے جاتے دیکھا۔ گھر' جو سب سے ظالم محبوب ہے۔ وہ کسی سے دل نہیں لگاتا۔ یہ تو ہم ہی ہیں جو اپنی ساری یادیں' ساری محبتیں اینٹ چونے کے اس گھر سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ حالانکہ آنے والے زمانوں میں یہ گھر رہے گا' نہ سڑک' نہ یادیں نہ محبتیں۔
اس نے پلٹ کر اس گھر کی طرف نہیں دیکھا۔ حالانکہ وہاں آوازیں دے کر پتھر بنا دینے والا کوئی نہیں تھا۔
اس کے قدم مضبوط تھے اور سکون سے زمین پر اسی وقار اور تمکنت سے اٹھ رہے تھے۔ جو اس کے باپ کا خاصہ تھی۔ اس کے ہاتھ کے لگائے پودے تن آور درخت نمہار دیتے پھولوں والے گملے ہوا کی ہلکی جنبش سے لہرانے لگے۔
"ہاں۔ خدا حافظ۔" اس نے دل ہی دل میں ان کو جواب دیا۔
لیکن اب وہ صحیح فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ نہایت خاموشی سے رحیم چاچا کے ساتھ ان کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اچھا جی۔" بیلا کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ ان مہربان لوگوں کے پیار کا جواب کس طرح دے۔ شکریہ کے چند بول۔ لیکن اس کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔ رخصت کی یہ گھڑی آزمائش اور امتحان کی گھڑی ہوتی ہے۔ اس میں رہ جانے والا قدم قدم پر شکست کھاتا ہے۔
ڈاکٹر بشارت' انکل جمشید' گوشی' منیجر صاحب' وکیل صاحب' قہقہے لگاتے ہنستے مسکراتے' ایک قطار کی صورت کاروں میں چلے۔ واقعی کوئی رسمی فقرہ بولنا یونہی فضول سی بات ہو گی۔
رحیم چاچا۔ سب سے اہم اور معتبر آدمی کی طرح آگے۔ آگے آخر بی بی نے سب امیر کبیروں پر اسے چنا تھا' یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ "اس طرف سے موڑ لینا جی۔ یوں بچ کر جی۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی آواز بلند اور مغرور تھی۔

"بس جی۔ اس سے آگے کچا ہے۔ گاڑی نہیں جا سکتی۔ ابھی بن رہی ہے سڑک۔ کونسلر صاحب نے وعدہ کیا ہے۔"

تاوان شب کی اس دور دراز کی کچی بستی میں رحیم چاچا کے بیوی بچے رہتے تھے۔ کتنی ہی مدت پہلے وہ بابا کی وفاداری میں سب کچھ بیچ آیا تھا۔ کبھی کبھار مہینے میں ایک آدھ چکر لگاتا۔ عموماً تب جب اسے تنخواہ پہنچائی ہوتی۔ اور تب بھی جب اس کو صاحب کی طرف سے بیوی بچوں کے لیے نئے کپڑے ملتے۔ وہ ضد کر رہی تھی یا کسی قسم کی گستاخی پر اتر آئی تھی۔ شدید خواہش کے باوجود کسی نے اس کو وہاں رہنے پر برا بھلا نہیں کہا۔

"بات یہ ہے انکل۔ مجھے رحیم چاچا کے ہاتھ کا پکا کھانے کی عادت پڑ گئی ہے اور رحیم چاچا اتنے عرصے سے اپنے گھر والوں سے الگ ہیں۔ اس لیے میں یہاں آ گئی ہوں۔ اور ویسے مجھے آپ کے سہارے کی سخت ضرورت ہے۔ میں آپ سے رابطہ رکھتی رہوں گی۔"

گوشی کو شدید صدمہ پہنچا۔ وہ اس کے ساتھ بڑی مصنوعی گفتگو کر رہی تھی جیسے وہ بھی اس کی پھپھی، خالہ یا چاچی جیسے ہوں۔

مہمان خاطر مدارات کے بعد رخصت کر دیے گئے۔

کچے پکے اس مکان میں جس کی دیواریں کچی اور کمرہ پکا تھا۔ فوری طور پر جھاڑ پونچھ کے بعد ایک دھوپ میں پڑی سیاہ بانوں والی چارپائی بڑے اہتمام سے اس کے لیے ڈال دی گئی۔ چاچی نے جلدی سے چوخانی سبز چادر اس پر بچھائی۔ سرہانے تکیہ رکھا۔ پانتی اوڑھنے والی چادر، وہ شرمساری، نادم سی چارپائی کی پٹی پر ٹک گئی۔

یہ ایک بالکل نئی جگہ تھی اور ان چیزوں کا اس کو عادی ہونا تھا۔ اس ہلکی سی باس کا بھی جو کھٹی پرانی لسی کی بساند کی طرح سارے گھر میں پھیلی تھی۔ اس ہلکی ہلکی مٹی کا بھی جو ہر وقت جھڑتی تھی۔ اور ان تمام لوگوں کا بھی جو اس سے سچی محبت کر رہے تھے۔

بے ریا، بے لاگ، کسی انجام کو سامنے رکھے بغیر، کسی مطلب کے بغیر۔

"شہزادیوں کو۔ جس نے یہ دن دکھائے خدا اس کو برباد کرے۔" چچی آسمان کی طرف سر اٹھا کر پلو پسار کر بددعائیں دینے لگیں۔ "ہائے اس کو طاعون کھائے۔ اس کی لاش کو کتے کھائیں۔"

وہ چچی سے گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اچانک رحیم چاچا کا ننھا منا سا گھر لوگوں سے بھر گیا۔

"کیوں جاہل عورتوں کی طرح بین ڈال رہی ہے ری۔ بی بی تھکی ہوئی آئی ہیں، انھیں آرام کرنے دے۔"

رحیم چاچا نے دھڑ سے دروازہ کھول کر بے چاری عورت کو ڈانٹا۔ چاچی نے سہم کر آنسو خشک کر لیے۔ وہ چاچا سے بہت ڈرتی تھیں۔

چاچا کے روانہ ہوتے ہی عورتوں کے جمگھٹے نے اسے گھیر لیا۔ اس کی آمد کی اطلاع اس کے آنے سے پہلے بستی کے کونے کونے میں پہنچ گئی تھی۔ وہ خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ کر بین کرتی روتی چلاتی عورتوں سے ہمدردیاں سمیٹتی رہی۔

ان کو اس سے کوئی براہ راست دلچسپی نہیں تھی لیکن مظلوم برادری ساری کی ساری ان کی اپنی ہوتی ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو۔ بہت جلد بیلا کو سمجھ آ گیا تھا۔ ان سب کے دلوں میں کبھی کبھی کے زخم

ہرے ہو جاتے تھے۔

وہ محنت کش عورتیں تھیں اور محنت کی کمائی لوٹ کے لے جانے والے کے خلاف دہائی دیتی، کوستی، بددعائیں دیتی اس کا جگر چھلنی کر رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر یونہی خاموشی سے چارپائی کے کونے پر ٹکی ان کی تعزیتیں وصولتی رہی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا۔ اس کو ان کے درمیان رہنا ہے۔ ان جیسا بن کر۔

وہ خاموشی سے چارپائی سے اتر کر فرش پر ان کے ساتھ آ بیٹھی۔ صاف ستھرا فرش جو غالباً دن بھر کی دھلائی رگڑائی کے بعد خوب نکھر آیا تھا۔ سرخ سرخ اینٹوں سے بنا یہ گھر پرسکون بھی تھا اور خوب صورت بھی۔

لوگوں کی ہاں ہاں کے باوجود وہ دونوں گھٹنے جوڑے ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکائے ان کے درمیان خاموش بیٹھ گئی۔ رحیم چاچا آج علاقے کی سب سے اہم شخصیت تھے۔ کئی گھروں سے آج اس کے لیے کھانا بھیجا گیا۔ جو انھوں نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔

"بی بی کو میرے علاوہ کسی اور کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں ہے۔"

رحیم چاچا خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ صحن کے کونے میں بنے باورچی خانے نما چبوترے پر کھانے پکانے کا اہتمام کرنے لگے۔

"یہ تم لوگوں نے کیا تماشا لگا رکھا ہے جاؤ اپنے اپنے گھروں کو۔"

وہ لوہے کی پھونکنی سے لکڑیوں کے درمیان پھونک مارتے مسخرے لگ رہے تھے۔ ان بے چارے کو بھی ایک مدت سے ان چولہوں کی عادت نہیں رہی تھی۔

عورتوں میں سے کسی نے ان کی دھمکی کی طرف توجہ نہیں دی۔

"ظالم نے کچھ نہیں چھوڑا۔ ہائیں، کپڑا لتا، زیور سب دھوکے سے لوٹ لیا۔ توبہ توبہ۔"

"بس بیٹی، تقدیر کے کھیل ہیں۔ جب ہندوستان، پاکستان کی جنگ لگی تھی۔ تو ہم لٹ پٹ کر بہار چلے گئے تھے۔ وہاں ایک مدت گزاری۔ پکا مکان بنوایا، گھرداری، رہن سہن خوب سلیقے سے نبھایا۔ دوسری جنگ لڑی تو وہاں سے نکال دیے گئے۔ بس سب وہیں رہ گیا، زیور، کپڑا، مکان۔"

"ارے شکر کرو بیٹی، جان تو بچی، یہاں تو سب بچی بیٹیاں گنوا کر اکیلا دم لیے پھرتے ہیں۔ کیا فائدہ اس دم کا۔ یہ بھی نہ رہتا۔"

"فاطمہ بی بی۔" رحیم چاچا نے دیگچی میں پیاز کاٹتے پھر ڈپٹا۔

"معاف کرنا بیٹی۔" رحیم چاچا ہاتھ خشک کرتے اس کے پاس آ گئے۔ "تم نئی نئی آئی ہو نا۔ یہ لوگ پیار کا اظہار اسی طرح کرتے ہیں۔"

"کچھ حرج نہیں چاچا۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اچھا لگ رہا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں نرم نرم پانی تیر رہا تھا۔ چاچا چپ چاپ چلے گئے۔

"ان کم بخت لکڑیوں کی عادت بھی تو نہیں رہی۔ گیلی ہیں بالکل۔" چاچا نے بے تحاشا بہتا پانی آستین سے رگڑا۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اس نے تاسف سے سوچا۔ حالانکہ وہ اپنے پیاروں کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ جتنی دیر عورتیں اس کے پاس ٹھہریں، اس سے زیادہ دیر لڑکیاں۔

وہ اس کے کپڑوں کو چھو کر دیکھتی رہیں۔ اس کے ٹاپس پر ہاتھ لگا لگا کر ٹیسٹ کرتی رہیں۔ پھر شرما شرما کر مسکرائیں۔ صرف اتنی سی دیر میں وہ اس کا مکمل انٹرویو کر چکی تھیں۔ اس کو کھانے میں کیا پسند ہے؟ کیا وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رسالے پڑھتی ہے؟ یہاں باجی زہرہ کے گھر کہانیوں والا رسالہ آتا ہے۔ اس میں خبریں بھی ہوتی ہیں۔ وہ جب منہ دھوئیں تو ولایتی صابن ان کو ضرور دکھائیں۔ کیا آپ کے پاس میک اپ کا سامان ہے۔ سرخی پاؤڈر عطر؟ نہیں ان کو یہاں شدید مایوسی ہوئی۔

اہم سیاسی شخصیت کی طرح ایک مصروف دن گزار کر وہ تکیے پر لیٹی تو اسے خیال آیا۔ آج کے دن اس نے پچھلے تمام دنوں کے مقابلے میں بابا کو بہت کم یاد کیا ہے۔

یہ تکیہ جو سخت کھنا ہوا اور میلا تھا۔ اس نے سر رکھا تو لگا اینٹ پر رکھ دیا ہے۔

سب نے اصرار کیا تھا۔ اپنی شدید ضرورت کی چند چیزیں ساتھ رکھ لو۔ لیکن اس نے ایک چھوٹے بیگ میں کپڑے ٹھونسنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں رکھا۔

اندھیری گھپ رات میں جہاں نہ کسی نائٹ لیمپ کا تصور تھا نہ کسی اسٹریٹ لائٹ کا۔ اندھیرا بھوتوں جیسی شکل بنا کر اس کے سامنے ناچنے لگا۔

ہاں اگر ایک مرتبہ بھی اس نے جھ کہا "اس کا کچھ ضائع نہیں ہوا" نہ زیور' نہ کپڑا' نہ پیسہ۔ ہاں صرف اس کا باپ اور باپ کا گھر' تو شاید بستی والے اس سے اتنا پیار نہ کریں۔

دنیا کتنی دکھی ہے۔ اور دکھ بانٹ کر کیسا سکھ ملتا ہے۔ یہ اسے آج ہی پتا چلا تھا۔ لوگوں نے اس سے بھی بڑے دکھ جھیلے ہیں۔ اس سے زیادہ نقصانات اٹھائے ہیں۔ اور یہ تصور کتنی تسلی دیتا ہے کہ دکھی دنیا میں آپ اکیلے تو نہیں۔

✠ ✠ ✠ ✠ ✠

گوشی اس کے لیے بہت بے چین تھی۔ انکل جمشید نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا۔ وہ ان کے سوا بھی کسی گھر کا انتخاب کر سکتی ہے اور گھر بھی کس کا۔ وہ اگر ڈاکٹر بشارت کی طرف چلی جاتی یا منیجر صاحب کے ہاں رہنے لگتی تو شاید ان کو اتنا قلق نہ ہوتا' وہ اس ضدی لڑکی سے بالکل ناراض ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے گوشی سے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں اس خود سر لڑکی کے بارے میں زیادہ سوچنے کی۔ چند دن من مانی کرے گی۔ اپنے منہ کی کھا کر آپ آجائے گی۔

غصہ تو گوشی کو بھی بہت آیا تھا۔ لیکن وہ اس سے ناراض نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اس سے بولنا بھی ترک نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ دو ہی دن بعد اسے بے چین ہو کر اس کچی بستی کی طرف چھپ چھپا کر آنا پڑا۔

اس کو ڈھونڈنا اس کے لیے اتنا مشکل نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ شہر کا سب سے زیادہ چمکتا ہوا نگینہ تھی۔ گوشی ایک جیسے بنے گھروں میں سے اس کا گھر بھول گئی۔ لیکن ساری بستی جانتی تھی وہ شہر سے آئی مظلوم لڑکی بیلا کس کے ہاں ٹھہری ہے۔

"وہ خوب صورت سی ہیں نا۔ پیاری سی۔"

وہ چھوٹی سی لڑکی اسے ساتھ لیے رحیم چاچا کے دروازے پر ٹھہر گئی۔ اس نے ہلکی آہٹ سے دروازہ کھولا اور ٹھٹک گئی۔

اس کے ارد گرد ابھی تک لوگوں کا جمگھٹا تھا۔ وہ رنگین چنگیر پر مکھن سے چپڑے مولی کے پراٹھے کھا رہی تھی۔ لوگ اس کے ارد گرد جمع تھے۔ کسی کے پاس سرسوں کا ساگ تھا' کسی کے پاس تازہ مکھن' کوئی گاڑھی گاڑھی لسی لایا تھا۔ کسی کی کولی میں لیموں کا اچار تھا۔ گوشی نے ایک لمبا سا گہرا سانس لیا۔

تو بیلا نے بالکل صحیح فیصلہ کیا۔ بیلا کے بارے میں فیصلہ کرنے میں جلد بازی ہم نے کی۔

وہ بیلا کے ساتھ دوسری چوکی پر بیٹھ کر دوسرا پراٹھا کھانے لگی۔ جو توے سے اترتے ہی سیدھا اس کی

خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ چاچی نے مجمع ہٹا دیا۔

"اس کی سہیلی آئی ہے۔ وہ کچھ آپس کی باتیں کریں گی۔"

نیچی سی چھت والے تنگ سے کمرے میں جہاں کھڑکی نام کی کوئی چیز نہ تھی یہاں چھت کے نزدیک ایک بڑا روشن دان تھا۔ جہاں سے روشنی اور تازہ ہوا چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ روشنی کی بڑی سی لکیر جس میں مٹی کے ننھے ننھے لاکھوں ذرات ایک قطار میں کمرے میں گر رہے تھے۔

"تم خوش ہو؟" گوشی ہاتھ سے وہ ذرے بکھیر کر پھر ان کے جمع ہونے کا تماشا کرتی رہی۔

"بہت"

دونوں خاموش ہو گئیں۔

یہ کوئی کھیل نہیں ہے۔ گوشی نے سوچا۔ لوگوں کو بکھیر دینا بھی تماشا نہیں۔ وہ زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ اسے توڑنے کے لیے بار بار نہیں آئے گی۔

چاچی نے دو گلاس چائے بنا کر طشتری میں سجا کر انہیں پیش کی۔ یہ چائے خاص طور پر انہی کے لیے تیار ہوئی کیونکہ بستی کے زیادہ تر لوگوں کو چائے کے مزے کی عادت نہیں تھی۔ رحیم چاچا کے شور مچانے کے باوجود چاچی بیلا کا ہر کام خود کرتی تھیں۔ چاچا چیخ چیخ کر مارتا لیکن اسے بڑی خوشی ہوتی۔

گوشی نے بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اسے لگا حلق میں پھندا پڑ جائے گا۔ چائے میں لہسن پیاز کے علاوہ ہانڈی کی بھی خوشبو تھی۔ لیکن وہ اسی سکون سے شیشے کے پیلے سے گلاس میں بیچ بیچ کر مزے مزے سے چائے پیتی رہی۔

بیلا اسے چھوڑنے سڑک تک آئی۔ کیونکہ کار کو بستی سے بہت دور رکنا پڑا تھا۔ وہ سارا راستہ خاموش ہی رہی۔ اسے ایسا لگا اب ان کے درمیان کچھ بھی مشترک نہیں۔ آخر وہ اس سے کس موضوع پر بات کرے۔

"کچھ دن کے لیے میرے ساتھ چلو بیلا۔"

"ہاں ضرور۔ کسی دن آؤں گی۔"

گوشی کا جی جل گیا۔ رسم دنیا داری نبھانی بھی اسے آگئی تھی۔

وہ ضبط نفس کی جتنی اذیت ناک سزا خود کو دے رہی تھی' اس کا کچھ حاصل بھی تھا؟

وہ ضدی اور گستاخ نہیں تھی۔ وہ تو خود سے سمجھوتا کرنے کے انداز سیکھ رہی تھی۔ اور اندر سے اتنی بھر بھرا گئی تھی کہ ہلکی سی ٹھیس اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی۔

انسانیت پر اپنا اعتبار دلوانے کے لیے اس کے پاس ایسے ہی رشتوں کا ہونا ضروری ہے اور ایسے ہی خالص سچ کا۔

اس نے طے کر لیا تھا وہ آئندہ یہاں نہیں آئے گی۔ وہ اس کے مسئلے پر ایک لفظ نہیں بولے گی۔ اور اس کے لیے کوئی راہ تلاش نہیں کرے گی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس سے ناراض تھی۔ اس لیے کہ وہ اس کا برا نہیں سوچ سکتی تھی۔

شاید اسی لیے اس نے ایک لفظ بھی اپنے بے حد لاڈلے انکل جمشید کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

"تم پھر آؤ گی گوشی؟" اس نے اسے کار میں بٹھاتے بڑی لجاجت سے پوچھا۔

وہ چپ رہ گئی۔ معلوم نہیں وہ دل سے چاہتی تھی یا یہ بھی رسم نبھا رہی تھی۔

"اگر تم چاہتی ہو تو ضرور آؤں گی۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

☼ ☼ ☼

بہت زیادہ دن گوشی بھی اس کے بغیر گزار نہیں سکتی تھی۔ اس لیے دس پندرہ دن اس نے اطمینان سے گزارے، دس پندرہ دن تکلیف سے۔ اور اس کے بعد کا مہینہ کاٹنا اس کے لیے دشوار ہو گیا۔ حالانکہ اس نے طے کر لیا تھا، وہ اپنی صورت دکھا کر بار بار اس کے لیے مشکلیں کھڑی نہیں کرے گی۔

لیکن پتا نہیں کیوں بار بار اسے لگتا، بیلا کو اس کی ضرورت ہے۔ دراصل یہ ہماری اپنی پکار ہوتی ہے۔ ہمیں خود کسی کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم کسی اور کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

وہ دو مہینے بعد وہاں پہنچی تو طوفان گزر گیا تھا۔

وہ کوہانوں والے اونٹ کی طرح اب اس پر کوئی اسپیشل ٹکٹ نہیں تھا۔ دنیا چند ان آدھ بھر کر تماشا دیکھ کر، آنسو بہا کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔ ایک رحیم چاچا ہی تھے جو جی جان سے اس کی خدمت میں جتے تھے۔

وہ برآمدے کے ایک کونے میں بیٹھی کاغذوں اور پنسلوں سے کچھ کھیل رہی تھی۔ گوشی کو لگا، وہ چہرے مرجھا گئی ہے زندگی کے طرز نے اسے مایوس کر دیا ہے۔ وہ گوشی کو دیکھ کر کھل اٹھی، لیکن اس نے اتنے دن بعد آنے کا شکوہ بھی نہیں کیا۔

اس کے ارد گرد اخبار، رسائل کا انبار سا لگا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" گوشی نے پہلا سوال ہی جھنجھلاتا ہوا کیا تھا۔

وہ چپ رہ گئی۔ "یونہی اخبار، رسالے ہیں۔"

"وہ تو نظر ہی آ رہے ہیں۔" گوشی نے ہاتھ کی جنبش سے بکھیر دیا۔

"وقت گزارنے کے لیے کیا کروں؟ رحیم چاچا کوئی کام تو کرنے نہیں دیتے۔"

"یہاں کام ہی کیا ہے جو وہ تمہیں کرنے دیں اور تم کرو۔"

"ہاں، واقعی، سوچ رہی ہوں۔ جاب کر لوں، مزا رہے گا۔"

"تم اپنی پڑھائی تو مکمل کر لو، سب تمہارا پوچھتے ہیں۔ مس فاروق بھی، ڈاکٹر حسن بھی اور ہیڈ تو کل کہہ رہے تھے، بے شک وہ آج بھی جوائن کر لے۔ اس کا نام نہیں کٹے گا۔ اور تو اور بیلا تمہیں اس موٹے عاشق سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ تو بے چارہ کافی دبلا ہو گیا ہے۔ کہہ رہا تھا میں بھی امتحان میں نہیں بیٹھوں گا۔"

بیلا کے چہرے پر مسرت کی ہلکی سی کرن چمکی اور ماند پڑ گئی ماضی کے مزاروں میں کیا رکھا ہے؟ زندگی سامنے ہے۔ وہ بہت دیر خاموش رہی۔

"یہ بہت سے اخباروں کی کٹنگز ہیں۔" اس نے ایک موٹا سا تھیلا اس کے آگے کیا۔ "آج کل میں دن رات یہی مطالعہ کر رہی ہوں۔ کہو تو اس کا امتحان دے لوں تو۔" اس نے بات کو سنجیدگی سے پلٹ دیا۔ "یہ اسکولوں کی نوکریاں ہیں۔ زیادہ تر پرائیویٹ اسکول ہیں اور بڑے بڑے شہروں میں ہیں۔ یہاں رہائش میرے لیے مسئلہ بن جائے گی۔ یہ جاب ہوائی کمپنی کی ہے۔ پتا نہیں مجھے راس بھی آتی ہے کہ نہیں۔ یہ ایک قبائلی علاقے میں کسی گھر کو کسی منتظم کی ضرورت ہے۔ جس میں انتظامی صلاحیتیں ہوں، پتا نہیں مجھ میں ہیں کہ نہیں، یہ کسی کمپنی نے سیکریٹری وغیرہ کے لیے دیا ہے، مجھے ٹائپ آتی تو نہیں، پر سیکھ لوں گی۔"

اس کے پاس اخباروں کے تراشے تھے۔

اس نے اس کے ہاتھ سے فائل لے کر آہستہ آہستہ پڑھنی شروع کر دی۔

واقعی چوروں کی طرح کونے میں چھپ کر بیٹھ رہنے سے یہ بہتر تھا۔ اس نے تفصیل سے ایک ایک "ضرورت ہے" کو پڑھا۔

"وہ اسکول کی نوکری کے لیے تو ایم اے مانگ رہے ہیں۔ وہ تو تم ادھورا چھوڑ آئی ہو یا پھر بی ایڈ، میرا خیال ہے، تکنیکی ایجوکیشن آڑے آئے گی۔ ہوائی کمپنی پر لعنت بھیجو، ہم تم سے اتنی دوری برداشت نہیں کر سکتے۔ اور سیکریٹری وغیرہ کیا ہوتی ہے۔ یار ابھی تک یہ واحد پیشہ رہ گیا ہے جس کی ہم عوام میں عزت نہیں کروا سکے۔ جانے کیوں حالانکہ دیکھا جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔

اور یہ تو خاصا مضحکہ خیز اشتہار ہے۔ ضرورت ہے ایک ایسی لڑکی کی جو تعلیم یافتہ ہو، گھرداری میں ماہر ہو، فنون لطیفہ اور انتظامی صلاحیتوں سے آگاہ ہو۔ گھرداری کا تجربہ، لیکن بیلا انہوں نے یہ لکھا ہی نہیں کہ لڑکی پابند صوم صلوٰۃ ہو کہ نہ ہو۔"

ایک مدت بعد گوشی کے کانوں نے بیلا کا قہقہہ سنا تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ تو بیلا زندگی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اس نے کاغذوں کا ڈھیر اسے واپس تھما دیا۔

"چلو میرے ساتھ۔" گوشی نے اس کی سب چیزیں سمیٹ کر ایک فیصلہ کن انداز میں کہا۔ بیلا مسکرا دی۔

"پہلے میرا ایک کام کرو۔ مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے، میرا چیک کیش کرا دو۔"

"چلو میرے ساتھ۔" اس نے اپنی رٹ جاری رکھی۔ "اور۔۔۔ کیش کروا لو۔"

"نہیں۔ میں نہیں جانا چاہتی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"کیوں، تم بزدل ہو؟" اس کا خیال تھا، وہ جوش میں آ جائے گی۔ اور غصے میں چیختی چلاتی اپنے نام سے بزدلی کا دھبا مٹانے اس کے ساتھ چل دے گی۔ لیکن وہ ویسی ہی رہی، پرسکون اور خاموش۔

"ہاں۔۔۔ اگر تم میرا کوئی کام کر سکتی ہو تو یہ چیک۔۔۔!"

اس نے چیک اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ یونہی عادتاً اس نے چیک کی رقم پر نظر ڈالی اور اچھل پڑی۔ پتا نہیں اس کے کیا ارادے تھے؟

وہ اتنی بڑی رقم سے کیا کرنے کا پروگرام بنا رہی تھی؟

اگر وہ یہ سب پیسے لٹوا دے گی تو زندگی کے باقی دن کے لیے کیا سوچے گی؟

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ واقعی ابو ٹھیک سوچتے ہیں۔ وہ اپنی من مانی کر کے اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ لیکن اتنی ضدی ہے اور اتنی مستحکم ہے کہ اس کی بات مانے بغیر گزارا بھی نہیں!!!

☼ ☼ ☼

کاغذوں کے سارے تراشوں میں سے اس تراشے پر اس کی نگاہ بار بار جا کر ٹھہرتی تھی۔ کئی مرتبہ اس نے دھیان پلٹ کر دوسری نوکریوں کی طرف توجہ دینے کی کوشش کی۔ "یہ اسکول کی نوکری بری نہیں، بس تنخواہ ہی کم ہو گی۔ یوں بھی اسکول کے لیے تو اکثر اشتہار آتے ہیں یہ اچھا نہ لگا تو کسی اور اسکول کا اشتہار آ جائے گا۔" فرم اور کمپنیوں کے تراشے اس نے ایک طرف اٹھا رکھے تھے نوکری تو کوئی بھی اپنی جگہ بری نہیں ہوتی لیکن اس میں ایک خاص روٹین ہوتی ہے۔ جس سے لوگوں کا دل اکتا جاتا ہے وہی صبح نو سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پانچ تک ٹائپ کی کھٹ کھٹ "پھر کون سی آفر" وہ ادھر ادھر کاغذ الٹتی پلٹتی پھر گڑھی عیسیٰ خان کا اشتہار اٹھا لیا۔

یہ کون سا شہر تھا نام سے تو صوبہ سرحد کا کوئی علاقہ لگتا تھا بلوچستان کی طرف بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کو یقین سا ہو چلا تھا کہ یہ علاقہ کہیں صوبہ سرحد کے آس پاس ہی ملے گا۔

دو تین مرتبہ کی کشمکش کے بعد اس نے اشتہار پر بڑا سا گول نشان بنا لیا' پتا اپنی ڈائری پر اتارا اور ڈائری پرس میں بند کر کے ضرورت کے باقی کالموں پر غور کرنے لگی۔

گوشی نے جو پیسے اسے بھجوائے تھے' ان میں سے کچھ کا اس نے تیا پانچہ کر دیا تھا بقول گوشی کے۔

اور باقی پرس میں اڑے وقتوں کے لیے سنبھال لیے تھے اس نے رحیم چاچا کو ان کی ضرورت کے مطابق کچھ رقم دی تھی تاکہ وہ کمروں کا فرش پکا کروا لیں اور غسل خانے کی چھت ڈلوا لیں' فاطمہ کو گھر کی چار دیواری اور لیپائی پتائی کے لیے' زہرہ کو جہیز میں چند برتنوں اور چیزوں کے لیے' جو اس کی شادی کے بعد اس کی زندگی میں کام آسکیں۔ اس نے آپا اماں کو چیک بھجوایا' مالی کی ادائیگی کی تھی بابا نے مالی صرف اس لیے رکھا تھا کہ اس کا ذریعہ آمدنی صرف اس گھر سے وابستہ تھا' ورنہ وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا تھا جہاں مالی جیسی مشقت کا کام اس کے بس کا نہ تھا' اس نے گوشی کو کچھ اکاؤنٹس ادا کرنے کی ہدایت کی تھی۔

"میں دنیا میں کہیں بھی رہوں' دیکھو مالی کی تنخواہ پہنچتی رہنی چاہیے۔"

"تم کہاں جا رہی ہو۔" اس نے شک سے پوچھا۔

"کہیں بھی گوشی! آخر مجھے کہیں تو جانا ہے۔" اس نے اسے سمجھانے کی آخری کوشش کی تھی۔

"لیکن تم کو کہاں جانا ہے؟ سوچو تم ایم اے مکمل کر لو تو تمہیں کسی طرح کی بھی نوکری مل سکتی ہے۔"

"لیکن میں... مجھے جلدی ہے میں فوراً "نوکری کرنا چاہتی ہوں۔" وہ ناراض سی ہو گئی۔

"تم اپنے معاملات میں خود مختار ہو۔ اگر تم گھبرا گئی ہو تو میرے پاس آجاؤ۔"

"گھبرا تو میں گئی ہوں لیکن اس طرح نہیں جس طرح تم سمجھ رہی ہوں۔" اس نے اگلے کچھ دن مصروف گزارے وہ محکمہ سیاحت کے دفتر سے معلومات لے کر آئی۔ بہت سے کاغذات مع بہت سی تصویریں' وہاں اس کو اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں مل گئی تھیں۔ پھر اس نے ڈاک خانے سے لفافے خرید لیے۔ گھر پہنچ کر وہ لمبی چوڑی چٹھیاں لکھنے بیٹھ گئی۔ رحیم چاچا اس کو عجیب و غریب کاموں میں الجھا دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ زیادہ تر خاموشی اختیار کیے رکھتے تھے۔ وہ مالک تھی بے شک ان کے گھر آ کر رہنے لگی تھی۔ رحیم چاچا دیکھ رہے تھے کہ خط بھیجنے کے بعد وہ کچھ دن عجیب و غریب قسم کے جوش و ولولے میں مبتلا رہی۔ شاید وہ باپ کے دشمنوں کا کھوج لگانے کی کوشش میں ہو۔ ان کا چھوٹا سا ذہن اس سے آگے سوچنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کو ایک ایک پیسہ بھی تقسیم کرتا دیکھ رہے تھے۔ ان کا دل کڑھتا تھا' وہ باپ کا بمشکل بچایا ہوا ایک ایک پیسہ لٹا رہی تھی۔ ان کی اس سے اس موضوع پر بار بار جھڑپ بھی ہو جاتی۔ لیکن وہ اپنے باپ کی طرح تھی۔ جو کچھ اس کے ہاتھ میں آتا وہ بانٹ دیتی اور اپنے باپ کی طرح اسے پیسے کی تنگی کا مطلق ملال نہ تھا' پھر کچھ عرصے بعد اسے وہ رجسٹرڈ لیٹر موصول ہوا جس کے انتظار میں وہ ایک ایک دن کاٹ رہی تھی۔

"مجھے بہت اچھی نوکری مل گئی ہے رحیم چاچا۔" اس نے لفافہ جلد بازی میں بے دردی سے دھجیاں بکھیر کر کھولا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا تھا' لیکن رحیم چاچا مایوس ہو گئے تھے۔

"تم ہمارے جیتے جی نوکری نہ کرو بیٹا! مالک کے سامنے تو مجھے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ کل کو تو وہ مجھ سے ہی سوال کریں گے۔"

"یہ ایسی ویسی نوکری نہیں ہے۔ رحیم چاچا یہ بہت اچھی نوکری ہے۔"

"آپ نے دنیا نہیں دیکھی بیٹیا' جانے کہاں ہوں' کون ہوں' کیسے لوگ ہوں' کہیں کوئی تمہارا دل نہ دکھا دے۔" ان کی جھکی ہوئی کمر پریشانیوں سے دوہری ہو رہی تھی۔

"رحیم چاچا۔" اس نے سونے سے پہلے ان کو اپنی طرف سے سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی۔

"اس دنیا میں جتنے لوگ آتے ہیں ان سب کو ایک دن اپنا بوجھ اٹھانا ہوتا ہے جلد یا بدیر۔ بعض لوگوں کی باری دیر سے آتی ہے۔ میری جلدی آ گئی ہے شاید۔ پھر ہمیں ان لوگوں سے بھی بچھڑنا پڑتا ہے۔ جن کے ساتھ ہم رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن تقدیر کو شاید یہ ساتھ بھی زیادہ دیر کے لیے پسند نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم بچھڑ جاتے ہیں۔"

رحیم چاچا اس کے مشکل الفاظ اور موٹی موٹی ترکیبوں کا مطلب تو نہیں سمجھتے تھے لیکن وہ یہ جان گئے تھے کہ اس نے اب یہاں سے رخصت ہونے کے لیے کمر باندھ لی ہے۔ انہوں نے رات کو بستر پر لیٹتے ہی سوچا تھا کہ وہ پہلا کام یہ کریں گے کہ صبح گوشی کے ابا کو بیلا کے عزائم سے آگاہ کرنے کی کوشش کریں۔ تاکہ وہی اس کو اس کے ارادے سے باز رکھ سکیں۔

وہ صبح اٹھے تو وہ ان سے پہلے اپنا سامان تیار کیے بیٹھی تھی۔

"مجھے صبح کی گاڑی سے پشاور جانا ہے چاچا۔ مجھے اسٹیشن تک چھوڑ آئیں۔" رحیم چاچا اپنے ارادے میں مایوس' حیران' پریشان ہو گئے۔

"آپ وہاں اتنی دور کس کے پاس جا رہی ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں رحیم چاچا! وہ دشمن نہیں اور وہاں پہنچ کر میں آپ کو تفصیلی خط لکھ دوں گی۔ اگر وہاں مجھے کوئی پریشانی ہوئی تو میں فوراً" آپ کے پاس آجاؤں گی۔ رحیم چاچا! میں کبھی نہیں بھولوں گی اگر اس دنیا میں میرا کہیں آخری ٹھکانہ ہے تو وہ آپ کا گھر ہے۔" رحیم چاچا نے خوشی سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اس کا سوٹ کیس اٹھا لیا۔

"معاف کرنا بیٹی میں تمہیں اپنے علاقے کی لڑکیوں کی طرح سمجھنے لگتا ہوں حالانکہ مجھے پتا ہے کہ تم پڑھی لکھی ہو اور سچی بات یہ ہے کہ بہادر ہو۔"

"بہادر تو آپ کی لڑکیاں بھی بہت ہیں۔ رحیم چاچا۔"

"آپ نے گوشی بٹیا کو تو بتا دیا نا۔" وہ تانگے میں اس کا سامان لے جاتے ہوئے بولے۔ رحیم چاچا کی بستی سے یوسف چاچا تانگا چلاتے تھے۔ وہی اس کو فیروزپور روڈ والی سڑک تک چھوڑنے آ رہے تھے۔

"اس کی ضرورت نہیں چاچا میں خط لکھ دوں گی۔" سڑک پر ٹھک ٹھک کرتا تانگا ماحول کی خاموشی کو اپنی ترتیب سے پڑتی ٹاپوں سے توڑتا جا رہا تھا۔ صبح کی ملگجی سی نیم اجلی روشنی میں آسمان' زمین بچھونے

چھوٹے گھر کتنے پر اسرار کتنے پرسکون دکھائی دے رہے تھے۔

"میں وہاں ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہی چاچا۔ میں ماحول کو جانچ پرکھ لوں پھر آپ کو اطلاع کر دوں گی۔" وہ روشن صبح کی خوب صورتی کا پردہ رحیم چاچا کے پریشان سوالوں سے چاک ہوتا دیکھ رہی تھی، جو آگے یوسف چاچا کے ساتھ چادر کی بکل مارے بار بار اس کا سوٹ کیس سنبھالتے اس کی چیزوں کی گنتی کرتے۔

کھانے کا ٹفن جو فاطمہ کے گھر سے آیا تھا اصلی گھی والے تلوں کے لڈو چاچی نے سارے کے سارے اس کے حوالے کر دیے۔

پانی کا تھرماس جو چاچا بیلا کی آمد کے ساتھ خرید لائے تھے کہ بٹیا پانی ابال کر پینے کی عادی ہے۔

فیروز پور روڈ آتے دن کا اجالا زیادہ پھیل گیا تھا۔ وہاں سے انہوں نے ٹیکسی کی تھی۔

"صاحب کی زندگی میں تو آپ کہیں جاتی تو جہاز میں جاتی تھیں اب۔ لوگوں میں بانٹ بٹا برے حالوں نوکری کرنے نکلی ہیں۔ مالک کی روح تڑپے گی ہم پہ۔ آخر تھے تو میاں خانساماں یہ تم نے ہماری بیٹی کی عزت رکھی۔"

"اف اوہو، رحیم چاچا۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"آپ ڈگی میں سامان رکھوائیں میں کوئی ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہی۔" واقعی اس نے تیز تیز دوڑتی سڑک پر پیچھے رہ جانے والے درختوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"پتا نہیں کب زندگی میں وہ دوبارہ اس شہر اور اس شہر کے لوگوں کو دیکھ بھی سکے گی کہ نہیں اور حقیقت یہ ہی ہے جو لوگ سمجھتے نہیں کہ وہ بہت بزدل ہے۔ کہاں سے لائے وہ اتنا جگرا جو اس شہر میں زندگی بسر کر سکے۔ جہاں قدم قدم اس کے باپ کی یادیں بکھری ہیں۔ وہ کوشی کو کیسے سمجھائے کہ وہ رحیم چاچا کے گھر پر بھی نہیں رہ سکتی۔ کتنی مرتبہ تو رحیم چاچا اسے یاد دلاتے تھے۔

"یہاں کھڑے ہو کر آپ کے بابا نے یہ چھت پڑوائی تھی اور کھڑے کھڑے جیب سے پیسے نکال کر راج مزدوروں کو چکتا کیا حالانکہ اپنی بستی کے لوگ کرتے کرایہ بھاڑا بھی نہ لیتے۔"

"چل اچھا بٹیا تم کو اللہ کو سونپا۔" رحیم چاچا نے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی سے جیسے اس کا دماغ پڑھ کر کہا۔

"اور کچھ نہیں ہوا تو ہوا بدلی ہو جائے گی جلدی خط لکھنا اور جلدی آنے کی کرنا۔" گاڑی چیخ مار کر ذرا رینگی تو رحیم چاچا کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔

"جب سے تم پیدا ہوئی بٹیا پہلی مرتبہ جدا ہو رہی ہو۔ اچھا باری باری سب ہی جدا ہو لیے تم کو بھی خدا کے حوالے کیا۔۔۔ دیکھو۔" انہوں نے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی پکڑ کر دوڑتے دوڑتے کہا۔

"راستے کا پانی نہ پینا۔ کسی سے کوئی چیز لے کر نہ کھانا۔ کسی سے بات چیت۔۔۔" ٹرین بہت آگے نکل گئی انجن کی تیزی پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ رحیم چاچا کی روندھی آواز اور آنسو بھری آنکھیں زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکیں۔

اس نے کھڑکی کا شیشہ گرا لیا۔ اب وہ ہاتھ ہلاتی ان کو تسلی دینا بھی چاہتی تو پلیٹ فارم بہت پیچھے رہ چکا تھا۔ ٹھنڈے ہوتے پیر اس نے جوتوں میں دے لیے۔ سفر میں ٹھنڈ زیادہ لگتی ہے اس کا اندازہ نہیں تھا۔

"کون تھے تمہارے۔" سامنے کی سیٹ میں بیٹھی عورت نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"وا۔۔۔" پھر وہ ہچکچا کر بولی۔

"والد۔"

"جی ہاں۔" سورج کھڑکی کے پس منظر سے اوپر اوپر طلوع ہو رہا تھا مضافات کا علاقہ چھوڑ کر ٹرین اب ویرانے میں دوڑ رہی تھی۔ جہاں تالابوں میں بڑے بڑے خاموش روشن کنول آہستہ آہستہ سورج کی روشنی میں بند ہونا شروع ہو گئے تھے۔

اس نے خاموشی سے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کے خوبصورتی کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ فصلوں کی کٹائی کا وقت ابھی نہیں آیا تھا سو سارا راستہ ہریالی سے بھرا ہوا تھا۔

"سسرال جا رہی ہو۔ اکیلی ہو، خاوند ساتھ ہیں؟"

"سٹیشن پر آئیں گے نا۔" دوسری نے لقمہ دیا۔

ہلکی ہوا سے لہراتے جھومتے کھیتوں سے نگاہ بھٹک کر بار بار پرس کی طرف جاتی۔ اس نے خاموشی سے اپنا پرس اٹھا لیا۔ زپ میں احتیاط سے پیک کیا ہوا وہ براؤن لفافہ ابھی تک رکھا ہوا تھا۔ جس میں اس کی تقدیر کا فیصلہ ہونا تھا اس نے ایک نظر لفافے کے پچھلے حصے پر ڈالی۔ بھیجنے والا محتاط طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے اندر باہر کئی جگہ ایڈریس لکھ رکھا تھا۔

دانیال خان۔۔۔ نزد حتی عیسیٰ خان۔ تحصیل اور ضلع کی تفصیلات بھی وضاحت سے کی گئی تھیں۔

اندر خاتون کا خط تھا۔ انہوں نے ایک جگہ لکھ رکھا تھا۔ آپ کو پشاور اسٹیشن پر ہمارا آدمی لینے آئے گا کیونکہ یہ علاقہ دور دراز اور گمنام سا ہے۔ جب تک پہاڑی راستوں سے واقفیت نہ ہو۔ انسان بھٹک سکتا ہے۔ مجھے لگتا ہے آپ بہادر خاتون ہیں۔"

اس نے خط ادھورا چھوڑ کر تیزی سے پیچھے کی طرف رہ جانے والے چرواہے اور اس کے ریوڑ کی طرف دیکھا۔

یہ اس کے بارے میں لوگوں نے عجیب سا تاثر قائم کر لیا ہے کہ وہ بہت بہادر ہے۔ اس نے شیشے سے ناک لگائے لگائے سوچا حالانکہ وہ لوگوں کو کیسے سمجھائے کہ وہ اتنی بزدل ہے اتنی بزدل کہ اب بھاگتے بھاگتے بھی تھک گئی ہے۔ نگاہیں چراتے چراتے چور چور ہو گئی ہے۔ اسی لیے وہ دنیا اور اس کے جھمیلوں سے اتنی دور جا رہی ہے جہاں نہ کوئی اس کا واقف ہو گا نہ جاننے والا۔ نہ اس کے ماضی کو کھنگال کر اس کے باپ اور باپ کے دوستوں کو برا بھلا کہنے والا۔

"ارے کیا باپ تھا دوستوں کی محبت میں اولاد کے لیے بھی کچھ نہ چھوڑا۔"

وہ کتنی مدت سے رشتہ داروں سے، ملنے والوں سے اور ہمدردوں سے اپنی باپ کی حماقتوں کے قصے سن سن کر روہانسی ہو گئی تھی۔ ہاں وہ بہادر نہیں تھی وہ کس کس کو یقین دلائے گی۔ لیکن دنیا والوں کے سامنے اسے بہادر نظر آنے کی جدوجہد بڑی کامیابی سے کرنی پڑتی تھی۔

"خان گل اس شخص کا نام ہے۔ جو تمہیں لینے آئے گا وہ بھروسے کا آدمی ہے۔ دانیال کا اصرار تھا کہ میں خود تمہیں لینے اسٹیشن آؤں لیکن میں آ نہیں سکوں گی۔ کیونکہ میرے گھٹنے تقریباً ناکارہ ہو چکے ہیں اٹھنا بیٹھنا دوبھر ہے۔ گھرداری کے جھمیلے مجھ سے سنبھالے نہیں جاتے اور اسی لیے اشتہار دے دیا تھا اور شکر ہے کہ ہمیں کافی درخواستیں موصول ہوئیں جن کو ہم مختلف وقتوں میں بلا کر انٹرویو کرتے رہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ اگر تم ناکام رہیں تو امید ہے کہ برا نہیں مانوگی اور یہاں فکر نہ کرنا۔ یوں ہی بر سبیل تذکرہ تحریر ہے کہ یہاں پہنچنے پر تمہیں آنے اور جانے دونوں طرف کا کرایہ ادا کر دیا جائے گا۔"

"یہ روٹی لو۔" ساتھ کی سیٹ سے ایک پٹھانی عورت نے گھی سے لتھڑا پراٹھا ہاتھ میں بھینچ کر اس کے آگے کر دیا۔

"مہربانی۔" اس نے لفافہ گھی کی چکناہٹ سے بچانے کے لیے جلدی سے ایک طرف کر لیا۔

"اپنے وطن جاتا ہے۔"

"وطن۔" وہ بھونچکی سی ہو گئی۔

"ہاں ہاں کدھر جاتا ہے، وطن؟" ساتھ میں ہی بیٹھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"ہم اپنے دیس کو وطن بولتا ہے نا۔ جیسے ہم ابھی مرغزار کا رہنے والا ہے۔ تو ہم بولے گا مرغزار ہمارا وطن۔"

"اس حساب سے میں مہاجر ہوں اور شاید ہر طرح سے مہاجر ہو گئی ہوں۔" اس نے پھر کھیت کھلیان پر نظریں گاڑھنے کی کوشش کی اس کا فلسفہ ڈبے کی عورتوں کو سمجھ میں نہیں آیا یا پسند نہیں آیا۔ کتنی دیر انہوں نے کوشش کی کہ اس پراسرار لڑکی کو کچھ تو کھولیں جو تنہا سفر کر رہی تھی۔ اور ذرا بھی گھبرائی ہوئی نہیں تھی۔ خیبر میل کے اس ڈبے میں عورتیں آپس میں کیا بول رہی تھیں یہ غٹرغوں اچھی لگنے کے باوجود اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"اور ہاں دانیال خان کا اصرار ہے۔ میں کام کی تفصیل تمہیں اچھی طرح سمجھا دوں تاکہ تمہیں آنے کی خواہش نہ ہو اور تم مروتاً بھی تکلیف نہ اٹھاؤ۔ یہ ہمارا گھر ہے لیکن دانیال یہاں رہتے نہیں کاروبار کے سلسلے میں ملک ملک گھومتے رہتے ہیں۔ پاکستان کے باہر بھی بار بار ان کا چکر لگتا ہے۔ لیکن وہ پلٹ کر بھی آتے ہیں۔ کہ یہی ان کا وطن ہے۔ اور جب وہ آتے ہیں تو گھر ان کو مکمل حالت میں کھلا چاہیے ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کے ساتھ دوست احباب ہوتے ہیں جن کی خاطر مدارات کرنا اب میری ہمت سے باہر ہے۔ اس لیے ہمیں کسی ایسی لڑکی کی ضرورت ہے۔ جو باہمت ہو گھرداری کا تجربہ رکھتی ہو۔ اچھی منتظم ہو۔ گھر میں ہونے والے چھوٹے موٹے کاموں کی دیکھ بھال کر سکے۔"

وہ خط پڑھتے پڑھتے بے ساختہ ہنس پڑی گوشی نے کہا تھا۔ انہوں نے یہ تو بتایا نہیں کہ لڑکی پابند صوم صلوٰۃ ہو کہ نہ ہو۔

اس کو ہنستا دیکھ کر پاس پڑوس کی عورتیں پھر سے متوجہ ہو گئیں۔ کافی دیر سے وہ اس کو بھلائے بیٹھی تھیں وہ چوکنی ہو گئی اس نے خوامخواہ ہنس کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار دی۔ اس نے منہ پھیر کر باہر توجہ کر لی۔ باہر کے مناظر بہرکیف اندر سے دلچسپ تھے۔

ایک عورت کے بچے نے اس کے کپڑوں کے بالکل نزدیک آ کر پیشاب کیا۔ اور اس کا شرعی نقطہ یہ تھا کہ بچے کا پیشاب ناپاک نہیں ہوتا۔ وہ پائنچے سنبھالے شریعت کے نازک مسئلوں سے بچی سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ سفر لمبا تھا اور وہ کسی سے جھگڑا مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ کمپارٹمنٹ بہتے پانی کی ندی بنا ہوا تھا، مسافروں کا بیشتر سامان بچوں کے ہاتھوں فرش پر گر کر پانی میں تیرتا پھر رہا تھا۔ اسے بہت دیر سے بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن کھانا کھاتے کچھ خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ ادھر ادھر نظریں چراتے اس نے خالہ فاطمہ

کے کھانے کا ٹفن کھول ہی لیا۔

روٹیاں، ساگ، مکھن، قیمہ، آلو بھجی، دال، دہی، سلاد تین ڈبوں میں پولی تھین کے چھوٹے چھوٹے تھیلوں میں ٹھونس ٹھونس کر بھرا ہوا تھا۔ رحیم چاچا کی ہدایت کے مطابق اسے باہر کے کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ سہج سہج کر خاموشی سے کھاتی رہی۔ غنیمت ہوا انٹرویو لینے والی عورتیں اپنی سیٹوں پر اونگھنے لگی تھیں۔ اس نے خاموشی سے تولیہ گود میں پھیلا لیا۔ چپکے سے کھانا سامنے رکھا۔

ابھی پہلا لقمہ توڑا ہی تھا کہ اچار کی شیشی اس کے سامنے آ گئی۔ کھا چکی تو گلاس بھر ٹھنڈا پانی دوسری عورت نے پیش کر دیا۔ خوب پکی ہوئی اور مٹھاس سے شیرہ چاہئے تیسری عورت کی طرف سے۔ وہ رحیم چاچا کی ہدایت بھول کر مہمان داری کے مزے لوٹنے لگی۔ پچھلے کافی دنوں سے اس کو عادت پڑ گئی تھی۔ ہر لمحہ اپنی خاطر مدارات کرانے کی، اس کا دسترخوان ہمیشہ رنگ برنگے کھانوں سے بھرا رہتا۔ وہ سب عورتیں اس کو پڑھی لکھی سمجھ کر بڑی عزت دیتی تھیں اور یوں بھی وہ ان کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔

بھلا بھرے ڈبے میں مجھے کون نشے والی اشیاء کھلا کر کہاں لے جائے گا۔ اور مجھے لے جا کر کرے گا بھی کیا۔ اس نے تقریباً "اپنا خالی پرس تھپتھپا کر سوچا۔

وہ بہت عرصے سے لوگوں کے خلوص کو جانچتے جانچتے حیران رہ گئی تھی۔ ایک مدت تک پاپا نے اس کو لوگوں سے الگ رکھا۔ گھر آنے جانے والے گنتی کے جو لوگ موجود بھی تھے وہ باری باری اس نے آزما لیے تھے۔ رشتہ دار دور کے تھے یا نزدیک کے سب ہی مطلب پرست اور خود غرض تھے۔ ہاں اس کے بعد زندگی میں جو فرد آیا، اس کا انسانیت سے اعتبار اٹھوانے نہیں آیا۔

انکل جمشید تھے، منیجر صاحب تھے۔ رحیم چاچا، آپا اماں، خالہ فاطمہ اور ان کی بستی۔ اگر وہ وہاں رکھی گئی تو سب کو نام بنام تفصیلی خط لکھے گی۔ جس میں ہر فرد کا علیحدہ علیحدہ شکریہ ادا کرے گی۔

اس نے آم کے اچار کی پھانک شکریہ کے ساتھ وصول کر لی تھی۔ اور کھانے کے بعد اس کی گٹھلی آہستہ آہستہ چوستی رہی پہلے اس نے پھانک کو ٹشو پیپر میں پکڑا تھا۔ پھر عورتوں کو بے تحاشا ہنستا دیکھ کر ٹشو پیپر باہر پھینک دیا۔ اور یوں ہی انگلیوں سے پکڑ کر دانت کٹے کرتی رہی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ جن لوگوں میں رہے گی ان جیسی بن کر رہے گی۔ ورنہ اونچائی پر دکھائی دینے والے لوگوں سے نیچے رہ جانے والے پیار نہیں کرتے۔ بہت کم مدت میں اس نے زندگی سے بہت سے درست تجربے حاصل کر لیے تھے۔ کبھی کبھی زندگی اتنی ہتھ چھٹ ہوتی ہے کہ انسان تجربہ گاہ میں جائے بغیر بڑا تجربے کار ہو جاتا ہے۔

جتنی دیر اس نے الگ تھلگ دنیا سے کٹ کر گزاری وہ ایک بچے کی رحم مادر میں زندگی تھی۔ محفوظ، مامون شہرپناہ اب وہ شہرپناہ میں نہیں تھی دنیا ماں کی گود نہیں اور اب اس کے پاس وہ ریت بھی نہیں بچی تھی جس میں سر چھپا کر وہ ظالم سے بچ سکے۔

اس نے کھڑکی والی جگہ چھوڑ دی۔ اور ان سب کے درمیان آ بیٹھی وہ یہاں زیادہ محفوظ اور مکمل تھی، ان سب کے درمیان گھری پچھلے اسٹیشن سے ٹرین صوبہ پنجاب چھوڑ کر صوبہ سرحد میں داخل ہو چکی تھی وہ وہاں کسی چیز سے آگاہ نہیں تھی۔ رہن سہن، زبان، تعلیم، طرز زندگی، ہاں صرف خلوص اور محبت۔

☆ ☆ ☆

ٹرین پشاور میں داخل ہوئی تو رات بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ کینٹ اسٹیشن کا ماحول لوگوں کی ہماہمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھاگ دوڑ میں زندہ زندہ لگ رہا تھا۔ بڑے بڑے نیون سائن، مرکری لائٹس، خوانچے والے کیسل پر ٹرین ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی مسافر جلدی میں تھے۔ اسی لیے اترتے وقت افراتفری میں عورتیں بستر اور بچے سنبھالتی نیچے اتر گئیں۔ وہ اسے بالکل ہی فراموش کر بیٹھی تھیں۔ وہ اپنا سوٹ کیس گھسیٹ کر دروازے تک لے آئی۔ پلیٹ فارم پر کسی تلاش میں بھاگنے والے سب ہی لوگ ایک جیسے تھے اس کے گمان میں تو سارا شہر خان گل تھا کسی قلی نے اس کا سامان نیچے ڈال دیا۔ وہ بھی خاموشی سے اتر آئی۔ بہت تھوڑی دیر میں سارا رش ختم ہو گیا۔ ڈھونڈنے والوں نے اپنے جاننے والوں کو ڈھونڈ لیا تھا۔

وہ خاموشی سے اپنے سوٹ کیس پر بیٹھ گئی۔ خان گل بھی اس کو خود ہی ڈھونڈ لے گا۔ وہ نزدیک سے گزرنے والے ہر پٹھان کو گھور کر دیکھنے لگی۔ ان سب کے حلیے ان سب کی شکلیں ایک جیسی تھیں۔ وہ چڑیوں کے غول کو دیکھتی تو ہمیشہ سوچتی تھی۔ یہ سب چڑیا چڑے ایک دوسرے کو کیسے پہچانتے ہیں۔ پلیٹ فارم پر ویسی ہی چڑیا تھی ایک جیسے گھیردار شلوار اور ملائشیا کرتے ملائشیا رنگ کی بغیر کلاہ کی پگڑی سرخ و سفید رنگت بڑی بڑی مونچھیں۔ اب وہ کیسے بتائے کہ ان میں سے خان گل کون ہے۔

"السلام علیکم۔" کسی نے پشت سے خالص پشتو لہجے میں سلام جھاڑا وہ ڈر گئی۔ ہمارے یہاں کسی کو واقفیت کے بغیر سلام دعا نہیں کرتے۔ وہ بیٹھے سے کھڑی ہو گئی۔

"آپ کا نام کیلی ہے۔" اس نے غور سے اس شخص کی طرف دیکھا تھا تو وہ بھی پٹھان ہی لیکن شاید کوئی پڑھا لکھا پٹھان تھا۔ حلیہ بھی مختلف تھا اور چہرہ بھی۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ یہ تو کوئی اور ہے۔

"جی نہیں۔" اس نے روکھائی سے کہا۔

"کیا مصیبت ہے۔" وہ بڑبڑاتا کینٹ کی طرف چلا۔ گاڑی کی بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔ پلیٹ فارم کی ٹرین میں داخل ہونے والی ناکافی روشنی میں وہ ایک ایک کھڑکی میں جھانکتا جیسے کسی کو شدت سے ڈھونڈ رہا تھا۔

"بات سنیں۔" کسی اچھوتے خیال کے تحت وہ تیزی سے سوٹ کیس سے اٹھ کر اس کی طرف لپکی۔

"کہیں آپ کا نام خان گل تو نہیں۔"

وہ رک گیا۔ اس نے ایک مرتبہ غور سے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"جب میں نے پوچھا تھا آپ کا نام۔"

"لیکن میرا نام کیلی نہیں ہے۔"

"مجھے تو بے بے نے یہی بتایا تھا۔" وہ ضد سے بولا۔

"ہو سکتا ہے کہ آپ نے دھیان سے نہ سنا ہو۔"

"کیوں نہ سنا ہو۔ میں بے دھیانہ ہوں، پاگل ہوں۔ حواس باختہ ہوں۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"ظاہر ہے دوران سفر تو میں نے اپنا نام نہیں بدلا ہوگا۔" اس نے چرمی پرس کی زپ کھولی۔ جب سے یہ لفافہ اسے موصول ہوا تھا، وہ کتنی مرتبہ اسے پڑھ چکی تھی۔ اس نے جیب سے کھینچ کر نکال لیا۔

"یہ لفافہ۔۔۔"

"آہ۔ یہ ہی لفافہ، بالکل یہی۔ خدا کا شکر ہے کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی، قلی۔" اس نے ریلوے

مزدور کو آواز دی۔

"یہ سوٹ کیس اٹھاؤ۔"

مزدور نے سوٹ کیس اٹھا کر مختلف قسم کے وصول شدہ تحائف ٹفن کیریر، پوٹلی گٹھڑی، سوٹ کیس پر رکھنا شروع کر دیے۔

"لاحول ولا اللہ، ایک لمحے کو میں سمجھا تھا کہ آپ پڑھی لکھی ہوں گی۔"

"اچھا آپ کے یہاں پڑھے لکھے لوگ ایسا سامان لے کر آئیں تو ان کی ڈگری ضبط ہو جاتی ہے؟" وہ مسکرا دیا۔

"یہ ضرور آپ کی نانی دادی کا کارنامہ ہوگا۔ ان کی محبتیں اکتا دیتی ہیں۔"

"میں محبتوں سے نہیں اکتاتی۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"اچھا۔" وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ "پھر ہماری دوستی ہو سکتی ہے۔"

"یہ بھی ضروری نہیں۔" وہ وقار سے قدم اٹھاتی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اس نے ایک نظر غور سے رک کر اس ننھی سی لڑکی کی طرف دیکھا جو قد میں اس کے کان تک آتی تھی لیکن اپنے بے پناہ اعتماد اور طبیعت کے سکون میں اسے کوئی بھٹکی ہوئی روح لگ رہی تھی۔

پلیٹ فارم کے گیٹ والا ٹکٹ چیکر اطمینان سے اپنی بینچ پر جا بیٹھا تھا سارے مسافر جا چکے تھے۔ اگلی لوکل گاڑی آدھی رات کو لنڈی کوتل سے آئے گی۔ اس سے پہلے اسٹیشن پر نہ کوئی آنے والا تھا اور نہ جانے والا، ان کو باہر نکلتا دیکھ کر بھی اس کا اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، سویا سویا خاموش سا پلیٹ فارم باسی پھلوں اور پرانے کھانوں کی باس سارے اسٹیشن کو ایک مخصوص پلیٹ فارم کی بو سے نواز رہی تھی۔

وہ سحر زدہ سی چلتی پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔ اڑیل اور ضدی لوگوں کی طرح۔

"بی بی کیلی آپ نے ٹکٹ بھی لیا تھا یا نہیں۔"

"ہاں لیا تو تھا۔" وہ جھینپ کر واپس آ گئی۔ چیکر سست قدم اٹھاتا ان کے پاس آ گیا۔ چیکنگ کے سوا اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

"تو چیک کروائیں نا۔ یہاں ہماری بھی کوئی عزت ہے۔" وہ انگریزی زبان کے سہارے اس سے مخاطب تھا۔

"ان کا ٹکٹ چیک کریں جی۔"

"کہاں گیا۔" وہ گھبرا گھبرا کر پرس ٹٹولنے لگی، ایک ایک زپ ایک ایک جیب اس نے کھول کر دیکھ لی۔ چیکر اسے تسلی دے رہا تھا۔ آرام سے دیکھیں اطمینان سے دیکھیں مل جائے گا جی، اس کے بعد وہ بیزار سا بینچ پر جا بیٹھا۔ "ہو گا جی نہیں مل رہا تو کیا ہوا رستے میں سو جگہ چیک ہوتا ہے۔" وہ فرائض کی بجا آوری کے بعد تھک سا گیا تھا۔ وہ غصے سے اسے دیکھنے لگا۔

"ٹکٹ نہیں لیا تھا تو بتا دیتیں اسٹیشن پر بنوا لیتے۔ چیکر کے ہاتھوں بے عزتی الگ کروائی۔ وہ ایسے جا کر بیٹھا ہے جیسے احسان کر رہا ہو۔"

"ایسے تو کوئی نہیں بیٹھا۔" وہ جھینپ گئی۔

"میں کیا کروں مل ہی نہیں رہا۔ یہیں کہیں تو رکھا تھا۔" اس نے بڑا سا پرس گود میں الٹ لیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ بڑی دلچسپی سے اس کے پرس میں سے گری چیزیں دیکھنے لگا۔

"آہا۔ یہ لڑکیوں کے پرس میں بھی کیا کیا مزے دار چیزیں ہوتی ہیں صرف وہ ہی نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔"

"وہ بھی مل جاتا ہے۔" وہ از سر نو ایک ایک چیز چھونے لگی۔

"چیکر صاحب یہ لیجیے۔" خان گل نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھا کر ایک سبز رنگ کا ٹکٹ اس کی طرف بڑھایا، چیکر نے لڑکی کے بے تحاشا حیران ہوتے چہرے کی پروا کیے بغیر باقی ماندہ ٹکٹوں کے ساتھ ملایا اور اینٹی اسمگلنگ والوں سے باتیں کرنے لگا۔

"یہ آپ کے پاس کیسے پہنچ گیا۔" وہ شک سے رک کر وہیں کھڑی ہو گئی۔

"آپ کے خیال میں میں جیب کترا ہوں۔ اٹھائی گیرا ہوں' یہ آپ نے اس خط میں رکھ رکھا تھا۔ لیلیٰ بی بی۔" اس نے لفافہ پھر اس کے سامنے لہرایا۔

"یہ آپ بار بار کیا لیلیٰ۔ لیلیٰ کرتے ہیں۔ میرا نام لیلیٰ نہیں' اور یہ مذاق بھی اچھا نہیں۔" وہ جھنجلا کر تیز قدم اٹھانے لگی۔

"میں نے کوئی مذاق نہیں کیا' لفافہ آپ نے مجھے خود پکڑایا تھا۔ اب ٹکٹ اس میں پڑا تھا تو میرا قصور۔" وہ چھوٹے بچے کی طرح معصوم لگنے لگا تھا۔ ہاں واقعی وہ بھول ہی گئی تھی جیسے۔

اسٹیشن سے باہر شہر سویا پڑا تھا تمام دوکانیں بند ہو گئی تھیں۔ چوک کی بتیوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ سینما ہاؤس کے باہر اکا دکا رش کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اپنا قیمتی پرس سنبھالتی بڑی احتیاط سے چلتی فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی جیپ کے کھلے دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

ڈرائیور واقعی ویسا ہی تھا جیسا اس کے ذہن میں خان گل کا تصور آیا تھا۔ ملائشیا کی جیکٹ' ملائشیا کے کپڑے ویسی ہی پگڑی مردان کی مخصوص جوتی اور منہ میں روانی سے گھومتی نسوار کالے سیاہ دانتوں کو اندر کر کے اس نے سلیوٹ مارا۔

"وعلیکم السلام۔" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ سلیوٹ کے جواب میں کیا کہتے ہیں۔

"یہاں سے گڑھی حبیبی کتنی دور ہے۔" اس نے اپنی سیٹ میں بیٹھنے سے پہلے خان گل کو ٹوکا۔

"یہاں سے صرف نو گھنٹے کے فاصلے پر ہے اوام۔" اس نے مودب ہو کر کہا۔

"اور ہو سکتا ہے دس بھی لگ جائیں' رات کا وقت ہے۔ کیوں کیا واپسی کا ارادہ ہے۔"

"اور تم شاید جانتے نہیں برخوردار میں اپنی کشتیاں جلا آئی ہوں۔" اس نے جیپ کی پچھلی سیٹ پر اپنی جگہ بناتے باہر کے گھور اندھیرے میں جھانکا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح اگلی سیٹ کی کھلے دروازے کے پاس کھڑا کچھ سوچتا رہا' پھر اس کے پاس پیچھے کی طرف آ گیا۔

"کیا ہم اسی وقت سفر شروع کریں۔ میرا مطلب تھا کہ آپ ڈریں گی تو نہیں۔"

"کیا آپ ڈرانے والے لوگ ہیں۔" اس نے اطمینان سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں نے تو پٹھانوں کی بڑی تعریف سنی ہے۔" وہ جھینپ گیا۔

"اصل میں بے بے نے کہا تھا۔ میں آپ سے پوچھ لوں آیا آپ رات پشاور میں بسر کر کے سفر کرنا چاہیں گی یا ابھی۔" اس کا لہجہ بڑا اچھا لگتا تھا' وہ بڑی اچھی اردو بولتا تھا۔ لیکن اس کا لہجہ وطن کی چغلی

کھاتا تھا۔ ہاں انگریزی میں اس کو پکڑنا مشکل تھا۔

"پشاور میں میں کسی کو جانتی نہیں۔ میرا مطلب ہے ہم ٹھہریں گے کہاں۔"

"ٹھہرنے کو ہم۔" وہ کوئی تجویز سامنے رکھتے رکھتے چپ ہو گیا۔

"آپ جیسا مناسب سمجھتے ہیں ویسا کریں۔ مجھے تو راستوں کا اندازہ ہے نہ سڑکوں کا۔"

پھر وہ ڈرائیور سے پشتو میں باتیں کرنے لگا' ان دونوں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔ لیکن اپنے ملک کی زبانوں میں اس کو کم از کم اتنا تجربہ تو تھا۔ وہ یقیناً "ابھی سفر کرنے اور ابھی سفر نہ کرنے کے فوائد و نقصانات پر بحث کر رہے تھے۔ ڈرائیور کی طرز سے صاف اندازہ ہو رہا تھا۔ کہ وہ شخص جتانے جا رہا ہے کہ وہ ساری عمر ان ہی سڑکوں پر چلتا رہا ہے۔ اسے کسی چیز کا خوف نہیں' خان گل اسے قائل کر رہا تھا بہر کیف ہمارے ساتھ ایک انجان مہمان ہے۔

اسے ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا۔ لیکن اس کے سوا اس وقت اور موضوع ہی کیا تھا۔ تکلیف کے اتنے اذیت ناک ایام نے اسے کم از کم ایک تجربہ تو کندن جیسا دے ہی دیا تھا وہ انسان کو پڑھنے کے قابل ہو گئی تھی سچا اور جھوٹا' قابل اعتبار اور نا قابل اعتبار۔

پہلی ملاقات میں مخاطب کی آنکھوں سے اس کو وہ شعاعیں نکلتی نظر آتی تھیں۔ جو سیدھی اس کے آئینے ایسے دل پر منعکس ہو جاتیں اور سارا پیغام اسے دے جاتیں' اس وقت اس شخص پر اعتبار کرنا مناسب ہے یا نا مناسب۔

اور اس کے گمان میں یہ قابل بھروسہ لوگ تھے۔ ان کے ذہن میں وہ ملازم نہیں تھی نوکر نہیں تھی۔ فی الحال ان کی مہمان تھی۔ جس کی حفاظت اور دیکھ بھال انہیں اپنی جان پر کھیل کر کرنی پڑتی تھی۔ بہت دیر کے مباحثے کے بعد وہ پھر اس کے پاس آیا۔

"یہاں ایک اچھا ہوٹل ہے۔ کینٹ ایریا میں' وہاں با عزت اور شریف لوگ ٹھہرتے ہیں۔ آج رات آپ یہاں بسر کر لیں۔ تو ہم تڑکے تڑکے سفر شروع کر دیں گے شام ہونے سے پہلے پہنچ جائیں گے' دراصل آپ کی گاڑی ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ لیٹ آئی ہے۔"

وہ بے اعتمادی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جانے وہ ان کو اعتبار جیسی عزت دیتی ہے یا شک کر کے ان کے خلوص کو ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ قبائلی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں باہر کے لوگوں کے نظریات کچھ ایسے ویسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ شبے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے بڑے یقین سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"میں نے کہہ تو دیا ہے جیسا آپ کو مناسب لگے۔"

اس نے پر سکون گہرا سانس لیا' اس کا مان رکھا گیا تھا۔

یہ پرانی خاکی رنگ کی جیپوں جیسی نہیں تھی بالکل نئی طرز کی ایجاد کردہ راکی تھی۔ جو خاص پہاڑی ڈھلوانوں کو سر کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اسے ایک مرتبہ پاپا نے گاڑیوں کی تاریخ بتاتے ہوئے بتایا تھا۔ ان کا خیال تھا' وہ راکی یا پاپا پیجارو خرید کر پہاڑی علاقے کی سیر کو نکلیں گے "اچھا اگر راکی مہنگی ہے تو پیجارو ہی سہی اور اگر وہ بھی مہنگی ہے تو کوئی اور سہی۔" تو گوشی نے ہی جھگڑا کر کے پروگرام ملیا میٹ کر دیا۔ اس کو امتحانوں کی فکر تھی۔ اگر فائنل اچھا نہ رہا تو کلاس فیلوز میں کر کری ہو گی۔ بڑی شیخی مارتی تھی۔ پاپا ان دونوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو گلگت' کاغان' ہنزہ' چترال وغیرہ گھومنا چاہتے تھے اور یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ بابا کے پروگرام کے عین مطابق ایسے ہی علاقے میں ان دونوں کے بغیر روانہ ہونے والی تھی۔

ساری رات ہوٹل کے تنہا کمرے میں وہ ہوٹل والوں کا ٹیپ ریکارڈ سنتی رہی۔ ہدایت اللہ' رحمان بابا کے گیت پرسوز آواز میں گا رہا تھا۔ اس نے سونے سے پہلے تک اپنے بیڈ کا میوزک بٹن آن رکھا اسے ہدایت اللہ کے گائے ہوئے گانوں کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

اس نے سائیڈ ٹیبل کا نائٹ لیمپ آف کیا کمرے کی بجلیاں بجھائیں دروازے کے لاک چیک کیے۔ اور نیم اندھیرے میں شیشوں سے پرے خاموش بڑی پرسکون اور ٹھنڈی سڑک دیکھتی رہی۔ وہاں سے ذرا آگے' پی اے ایف ہیڈ کوارٹر کی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ دوسری طرف ان کا سینما ہاؤس تھا۔ شاہین چاروں طرف اسے غضب کا اطمینان اور سکون دکھائی دیا' اتنا اطمینان اور سکون کہ اس کی روح تک سرشار ہو گئی۔

ہوٹل کے بستر پر سے تھک کر سونے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔

ایسے لگا ابھی سوئے شاید ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا' کسی نے دروازے پر زور سے دستک دی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی شدید تھکان اور نیند کی کمی کی وجہ سے اس کا سر بھاری بھاری تھا پھر بھی بہت دنوں بعد وہ سچ مچ سوئی تھی۔ دستک دوبارہ سنائی دی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ بہت دیر بعد اس کی سمجھ میں آیا۔ وہ سامنے سفید کپڑوں میں کھڑا شخص دراصل ہوٹل کا بیرا تھا اور وہ رات بھر اپنے گھر کی آرام دہ بستر پر نہیں بلکہ گھر سے بہت دور کسی اجنبی چھت کے نیچے تھی۔

بیرا بار بار پیغام دے رہا تھا' جو اس نے نیند سے بند ہوتی آنکھوں سے بمشکل سمجھا۔

"خان گل صاحب کا پیغام ہے آپ جلدی تیاری پکڑیں۔"

"آ..." بمشکل پیغام رسانی مکمل ہوئی۔

اسے واقعی کہیں جانا تھا اس سے آگے اور آگے شاید اس کا سفر ختم ہو شاید کبھی نہ ہو۔ چہرے پر تازہ پانی کے چھینٹوں نے اسے کچھ یاد دلا دیا۔ بیرا اس سے ناشتے کا پوچھ گیا تھا۔ اور اس قدر سادہ ناشتے کا آرڈر تھا کہ فوراً ہی واپس آ گیا' اس نے سادہ چائے ہی تو منگوائی تھی۔

اس کا سامان بھی اسی طرح ایک کونے میں رکھا تھا۔ اس نے تو رات کے کپڑے تک نہیں بدلے حالانکہ وہ کپڑے بدلے بغیر سونے کی عادی نہیں تھی۔ سو اب اس کو جلدی تیاری پکڑنے کے لیے اور کچھ کرنا بھی نہیں تھا۔ اس نے چائے کی پیالی منہ سے لگائی اور ختم کر دی۔ پھر اس نے دوسری پیالی بنائی۔ اس طرح وہ پندرہ بیس منٹ میں بالکل تازہ دم تھی۔

اس نے منہ ہاتھ دھویا' کپڑے بدلے' بالوں میں برش پھیرا اور جوگرز کے تسمے کس لیے۔ اب وہ سفر کے لیے بالکل تیار تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا وہ کیونکر خان گل صاحب کو اطلاع بھیجے کہ وہ ہر طرح کے سفر کے لیے تیار ہے' یونہی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا اور مہربان قسمت کی طرح بیرا خان گل کی اطلاع کے ساتھ آیا۔

باہر راہداری میں بچھے خوش رنگ کارپٹ پر وہ ٹہلتا اس کا انتظار کر رہا تھا' وہ پلٹا تو بیلا دل میں مسکرا دی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کل اس نے اس کے ساتھ اسٹیشن سے ہوٹل تک کا سفر کیا تھا۔ لیکن اب

وہ اس کا چہرہ بالکل بھول چکی تھی۔

اس نے گردن گھمائی اور مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں رینگتے دیکھ کر وہ جز بز ہو گیا۔

"کیا میں شکل سے مسخرہ لگتا ہوں؟"

"ہرگز نہیں۔" سوٹ کیس کا تسمہ پہیوں پر کھینچتی وہ اس کے ساتھ چلی آئی۔

"ذرا میم صاحب کا سامان پکڑو۔" اس نے بیرے کو ٹوکا۔

"یا میرے کپڑے اچھے نہیں ہیں۔ میں نے شیو نہیں کیا' کیا بات ہے؟" وہ دانستہ کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

"شاید اس لیے ہنس پڑی کہ آپ کے کپڑے بھی اچھے ہیں' آپ نے شیو بھی کر رکھی ہے۔ اور آپ شکل سے شریف آدمی بھی لگتے ہیں۔ دراصل ہمارے پاس پٹھانوں کا ایک خاص تصور ہے یہ وہ کہ وہ بچے پکڑتے' قینچی چھری تیز کرتے اور گولیاں چلاتے ہیں۔"

"ہاں ہم گولیاں چلاتے ہیں' قینچی چھری تیز کرتے ہیں اور بچوں کو بھی پکڑ لیتے ہیں' خاص طور پر بگڑے بچوں کو۔" وہ رسان سے بولا۔

"ہمارا گھر یہاں سے بہت دور ہے۔ آپ نے کالام دیکھا ہے؟"

"نہیں؟"

"اچھا کالام سے ساڑھے تین گھنٹے کے فاصلے پر ایک نچلی وادی میں رہتے ہیں۔ دراصل وادی وہاں خود رہتی ہے۔ ہم لوگ تو ادھر ادھر ہی رہتے ہیں' عیسیٰ خان صاحب ہمارے دادا یا پتا نہیں پڑدادا تھے۔ آپ دیکھیں گی تو... ہمارے علاقے سے ضرور محبت کریں گی۔"

"کیوں نہیں۔" اس نے اس کے ساتھ لفٹ سے اترتے شرارت بھری فراخدلی سے کہا۔ "میرے دل میں بہت وسعت ہے۔"

"لیکن آپ کالام تک کبھی نہیں گئیں۔ سوات دیکھا ہے۔"

"نہیں"

"آپ پہلے کبھی پشاور آئی ہیں۔"

"نہیں۔ میں تو لاہور سے پہلی دفعہ باہر نکلی ہوں۔"

وہ اس کی طرف دیکھ کر یک لخت چپ ہو گیا' اس نے غالباً "کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ روزگار کی تلاش میں انسان کتنی صعوبت اٹھاتا ہے۔

"معاف کرنا' پتا نہیں میں نے نادانستگی میں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچا دی ہو۔"

"بے فکر رہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی' ہاں اگر آپ کی وادی واقعی خوب صورت ہے تو آپ وادی میں کیوں نہیں رہتے؟"

"آہ یہ لمبی کہانی ہے۔" وہ اس کے لیے جیپ کے پچھلے حصے میں کشن جماتا ہوا بولا۔ "اور زندگی مختصر۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑی' "گڑھی عیسیٰ خان میں سینما ہاؤس ہے۔" وہ دوبارہ سنجیدہ ہو گیا۔ "میں اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ہوں کسی چیز کی ضرورت ہو تو شیشہ بجا دیں۔ اور گناہوں کی معافی مانگ کر سفر کریں'

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو سکتا ہے یہ آپ کی زندگی کا آخری سفر ہو۔"

ہر چند کہ وہ اس کی طبیعت کے مذاق کو اس مختصری ملاقات میں سمجھ چکی تھی۔ لیکن وہ وحشت زدہ ہو گئی۔

رائی جھٹکے سے چلی۔ سفر کے شروع کرتے ہی اس کا ذہن تیزی سے سفر کرتا تھا۔ رائی واپس نوشہرو تک آئی تو وہ اپنی زندگی کے کتنے ہی واقعات دہرا چکی تھی۔ حالانکہ اس نے خود کو کتنی مرتبہ تنبیہ کی تھی کہ وہ قبروں کی مجاور نہیں بنے گی۔ لیکن شاید جذبوں پر ہماری لگام اتنی مضبوط نہیں ہوتی۔ وہ منہ اٹھا کر دوڑتے ہیں ادھر ادھر نہیں دیکھتے۔

یہ عام سی سڑک تھی۔ کبھی شہر آجاتے تھے کبھی گاؤں، کہیں سوکھے سنگلاخ پہاڑ تھے کبھی کہیں ہلکا ہلکا سبزہ نظر آنے لگتا، پتا نہیں کیوں وہ لڑکا خان گل اپنے علاقے کی اتنی تعریف کرتا تھا۔ شاید سب ہی لوگوں کو اپنی رہائش کی جگہ اتنی اچھی لگتی ہے۔

رسالپور، مردان، سماکوٹ، اس نے کتنے ہی شہر دکانوں کے بورڈ پڑھ پڑھ کر گزار دیے۔ وہ جغرافیے سے نابلد نہیں تھی اور ماڈرن ایجادات کتنی ہی چیزوں کو بغیر جائے دکھا دیتی ہیں۔ لیکن آنکھوں سے دیکھنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کے پاس پھلوں کا تھیلا اور بسکٹ کے ڈبے رکھے تھے جس سے ظاہر تھا کہ پٹھان بہت مہربان قوم ہے۔ یوں دیکھا جائے تو وہ ایک ادنیٰ سی ملازمت کا انٹرویو دینے جا رہی تھی۔ بھلا اس میں اور ڈرائیور میں کیا فرق ہے۔ شاید تھوڑا بہت تنخواہ کا بس۔

جیپ ایک جھٹکے سے رکی اور خان گل چھلانگ مار کر نیچے اتر آیا۔ وہ بہت سکون سے تکیوں سے ٹیک لگائے ساتھ ساتھ دوڑتی ریل کی لائن دیکھ رہی تھی۔

"آپ تو انجوائے کر رہی ہیں۔"

"بہت۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم اسنیکس لے لیتے ہیں آپ رات کا کھانا کھائے بغیر سو گئی تھیں، صبح ناشتا نہیں کیا۔" کتنی مدت بعد کوئی اس کا اتنی شدت سے دھیان رکھ رہا تھا، وہ ممنونیت سے مسکرا دی۔

"صرف مسکرانے سے کام نہیں چلے گا، میرا خیال ہے میں آپ سے اتنا بڑا تو نہیں، لیکن مجھے بڑا بن کر دکھانا پڑے گا۔" وہ اس کو رعب تلے رکھ کر سرشار ہو گیا۔

وہ گاڑی سے اتری نزدیک بہنے والی نہر سے ہاتھ منہ دھو کر تین چار گھنٹوں کی مشقت اتاری۔ نزدیکی ہوٹل سے قہوہ پیا، کیلے اور مالٹے کھائے۔ پندرہ بیس منٹ کے آرام کے بعد وہ گاڑی میں بیٹھی تو ہشاش بشاش تھی۔

"ہاں۔" وہ دروازے لاک کرتا ٹھٹک گیا "گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد ٹھنڈا علاقہ شروع ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے آپ کے پاس گرم کپڑے ہوں گے بھی نہیں۔ یہاں اس باکس میں ایک کمبل پڑا ہوتا ہے۔ وہ نکال لیجیے گا۔"

اس نے باہر گرم دن کی طرف دیکھا۔ سورج تمتما رہا تھا وہ بار بار پسینے میں نہا جاتی۔ بھلا اسے کمبل کی کیا ضرورت پڑ سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ گاڑی کا اے سی بند کرنا پڑے گا بس۔

لیکن سفر کو گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ رائی نے بار بار سڑکوں پر مڑنا شروع کر دیا۔ ذرا ہی دیر میں گاڑی

میں گرمی ختم ہو گئی اور جب وہ دوپہر کے کھانے کے لیے منگورہ کے ایک ہوٹل میں رکے تو پل کے دونوں طرف بہنے والے پہاڑی نالے نے فضا کو خنک کر دیا تھا۔

نئی وضع کے سادہ سوتی کپڑوں میں وہ ٹھٹھر رہی تھی، دائیں طرف مینگورہ کا بازار تھا جہاں پر ساری دنیا کا امپورٹڈ سامان سیر و تفریح کے لیے آئی ہوئی خواتین دھڑا دھڑ خرید رہی تھیں۔

اس کو اپنے گمان سے کہیں زیادہ سردی لگ رہی تھی۔ پٹھان دکان دار اپنی زبان میں مول تول کر رہے تھے۔ اس نے ہچکچاتے ہچکچاتے خان گل کی طرف دیکھا۔

"میں ایک شال خرید لوں۔"

خان گل خجل ہو گیا غالباً "اس خیال سے کہ اسے یہ خیال خود کیوں نہ آیا" وہ پہلی دکان میں گھسے اور وقت ضائع کیے بغیر اپنی بولی بول کر ایک بڑی سی سفید شال خرید لی۔ جس پر نفاست سے سواتی کام بنا ہوا تھا، وہ اپنے پرس کی زپ کھول کر حیران پریشان اس سے سوال کرتی رہ گئی۔ "کتنے پیسے، کتنے پیسے؟" کہ اس نے ادائیگی بھی کر دی۔ بیلا کو یہ سب اچھا نہیں لگا، اس کے پاس اب بھی ضرورت بھر پیسے تھے اس نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اور وہ اس کے تکرار کرنے پر ناراض ہو کر رائی میں جا بیٹھا۔

"آپ مہمان ہیں، آپ سے پیسے لیتے اچھا لگے گا؟" وہ سمجھ گئی اس کا مطلب تھا کہ آپ ہماری تنخواہ دار ملازم بننے جا رہی ہیں۔ اور شاید ان کی terms condition میں روٹی کپڑا بھی شامل ہو۔ تاہم اس کی خودداری پر ضرب سی پڑی۔

گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ وہ پرس کھول کر اصرار کیے جا رہی تھی۔ افسوس کہ اس نے خان گل کو ادائیگی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بجلی کے تاروں پر بیٹھے خوب صورت پرندوں کی طرف تکنے لگی۔

خان گل نے رنج سے پتلون میں سے رسید نکالی اور اس کے حوالے کر دی۔ "ہمارے یہاں مہمان کا بہت احترام ہوتا ہے۔" وہ ہونٹ چبا کر رہ گئی وہ اس کو کیا جواب دیتی یونہی اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"دیکھو بھئی۔" اس نے اپنائیت سے کہا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے۔ آپ مجھ سے چھوٹے ہی ہوں گے اور ہمارے یہاں رواج ہے کہ چھوٹوں سے چیز نہیں لیتے۔"

"نہیں۔" وہ خوش ہو گیا۔ "آپ اپنا شناختی کارڈ نکالیے۔ میں اپنا نکالتا ہوں۔ جو چھوٹا ہوگا وہ ہارے گا۔"

"ڈن۔" اس نے جھک کر کارڈ دیکھا اور چیخ مار کر اچھل پڑا۔

"وہ ہارا میں آپ سے پورے ڈھائی سال بڑا ہوں چلیے اب آرام سے بیٹھیے۔"

"لیکن وہ آرام سے بیٹھ ہی نہیں سکی۔ بہت جلد ڈرا دینے والا رستہ شروع ہو گیا تھا، کھائیوں میں ٹھاٹھیں مارتا دریا اور دوسری طرف آسمان سے باتیں کرتے پہاڑ، ٹروٹ کے تناور درخت، خوبانی اور بادام کے شگوفوں سے لدی ٹہنیاں۔ لیکن وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ سفر میں مزا نہ لے سکی، دریا کا رنگ پہاڑوں کی زمین ایسا سرخ اور خیالا تھا اور وہ اس قدر غصے میں ابل رہا تھا جیسے ساری دنیا سے ناراض ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چلتا دیو ہیکل پہاڑ جیسے اس کے خوف اور غصے سے ماورا تھا۔ سڑک تنگ اور سنگلاخ تھی۔ وہ بار بار جھٹکے بھی کھا رہی تھی اور ڈرائیور اس لاپروائی سے جیپ بھگائے لے جا رہا تھا۔ جیسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کوئی ننھا سا بچہ اپنے گھر کے اینٹوں والے آنگن میں تین پہیوں کی سائیکل دوڑائے پھرے۔

ان کو سفر کرتے کرتے آٹھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اپنی زندگی میں اس نے کبھی اتنا طویل سفر نہیں کیا تھا' وہ جیسے ان آٹھ گھنٹوں میں نئی دنیا میں آگئی تھی۔ یہاں کھیت بھی تھے تو پہاڑوں پر چوٹی سے دامن تک ایک ترتیب سے بنے ہوئے اور شاہ بلوط کے آسمان سے باتیں کرتے گھنے جنگل خنکی اتنی بڑھ گئی تھی کہ شال اوڑھ کر کمبل میں لپٹ کر بھی وہ کپکپا رہی تھی۔

شام کو جھٹ پٹے سے ذرا پہلے اس کی جیپ نے سڑک کے درمیان اور ایک اور چھوٹی سی نکلنے والی سڑک کا راستہ لیا۔ یہاں دیو ہیکل پہاڑ کے بیچوں بیچ وسیع سبزہ زار تھے۔ پہاڑوں سے اترتا آبشاروں کا شفاف پانی ان کی سڑک کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ وہ پتا نہیں کہاں جا رہے تھے۔ اور کب تک چلیں گے اس نے شیشے سے جھانکا وہ دونوں لگاتار باتیں کر رہے تھے۔

جب سے اس چھوٹی سڑک پر موڑے تھے اچانک اس بستی میں کام کاج اور ترقی کے اثرات نظر آ رہے تھے۔ سڑک تو تقریباً ویسی ہی تھی صاف ستھری لیکن بہت تنگ۔ لیکن اتنی خطرناک نہیں تھی۔ یہ سارا راستہ ڈھلوان کی طرف تھا' چاروں طرف مرغزار تھے۔ خوشنما ہرے بھرے درختوں سے لدے پھندے پہاڑ سڑک کے کنارے کنارے بڑے پتھروں پر چونے سے سفیدی کی گئی تھی۔ دور دور لوہے کے خاردار تاروں کے باڑھ نظر آ رہی تھیں۔ اس کا اندازہ صحیح تھا وہ ان کی بستی میں داخل ہو چکے تھے۔

بلند و بالا دیو قامت اینٹوں کی قلعے جیسی دیوار کے درمیان لوہے کا بڑا سا پھاٹک گڑھا ہوا تھا' اور اس آہنی سیاہ گیٹ کی دوسری طرف انسانوں کی ایک اور دنیا آباد تھی جیپ کے ہارن کو وہ شاید اچھی طرح پہچانتے تھے اچانک اندر بھگدڑ مچ گئی۔

پھاٹک کھلا تو سیلوٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا' سڑک اس پھاٹک کے بعد بھی کہیں سیدھی کہیں ناہموار چلی جا رہی تھی دونوں طرف آگے سبزہ زاروں میں درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر اس ناہموار سے باغ کے درمیان چلتے چلتے عمارت کے پورشن میں آ کر رک گئی۔ راستے کے سارے آثار قبائلی تھے لیکن یہ عمارت جدید اور پٹھانی طرز کا امتزاجی نمونہ تھی۔

کسی شخص نے آگے بڑھ کر جیپ کو پیچھے سے چوپٹ کھولا۔ وہ خاموشی سے اتر آئی۔ سفید شال کاندھوں پر ڈھلکائے۔

گھر کی عمارت کا لان باہر بنے باغ سے بالکل مختلف اور ترتیب سے سجا ہوا صاف ستھرا تھا' اس نے خاموشی سے ایک اچٹتی سے نظر عمارت پر ڈالی سرخ رنگ کی باریک اینٹوں سے بنی عمارت پر قدیم طرز کے آرائشی لیمپ آویزاں تھے۔ عمارت کے محرابی طرز کے دروازوں کے دونوں طرف ٹائلز لگا کر تختیں آویزاں تھیں۔ پورشن سے باہر لان میں قدیم پلیٹ فارموں پر تیل سے چلنے والی لیمپ کے طرز کے کھمبے گڑھے تھے۔

خان گل اگلی سیٹ سے اتر کر دروازہ کھولنے والی لڑکی سے علاقائی زبان میں کچھ بولتا' اس کی طرف گھوم گیا۔

''اس کا نام مریم ہے آپ کو بے بے کے پاس لے جائے گی۔''

مریم نے خان گل کی انگریزی زبان میں بولی جیسے ساری بات سمجھ گئی ہو اس نے سر ہلا کر پیچھے آنے کو

کہا۔ عمارت کے اندرونی حصے میں قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک سی گئی۔ لمبی سی گیلریوں میں جلنے والی روشنیوں اور اس کے ارد گرد نظر آنے والے کمروں کی ایک ہلکی سی نظر نے اسے ڈرا دیا' گھر پورا کا پورا ایک سلیقہ انتظام کا منہ بولتا ثبوت تھا انہیں مزید کسی منتظم کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ سوائے چند ایک چیزوں کے مثلاً ''دیوار پر پینٹنگز کی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

کہیں وہ لوگ اس کی دل آزاری کا سبب نہ بنے۔ مریم بار بار آگے نکل جاتی پھر وہ رک کر اس کو آگے نکلنے کا موقع دے کر حتی المقدور اس کے پیچھے پیچھے آنے کی کوشش کرتی۔ اس دوران اس کی پھولی ہوئی شلوار کا گھیر خوب سر سر کرتا آگے پیچھے ہوتا رہا۔

غالباً ''خاتون خانہ رعب' اور دبدبے کی مالک ہیں۔ حالانکہ وہ خط میں کتنی پیاری' کتنی مہربان لگ رہی تھیں' اس کے قدم نپے تلے انداز میں چلتے چلتے اس کھلے دروازے کے پیچھے رک گئے۔

آتش دان میں لکڑی کی آگ دہک رہی تھی۔ جس سے آتش دان کا اندرونی تانبا تپ کر سرخ ہو رہا تھا' وہ سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا وہ ایک دن روٹی مانگنے والوں کی طرح کانپتی لرزتی نوکری کی تلاش میں کسی عورت کے در پر پہنچ جائے گی۔

آتش دان کے نزدیک بیٹھی لڑکی نے ایک مغرور نظر اس آنے والی لڑکی پر ڈالی۔ اپنی زبان میں دوسرے صوفے پر کمبل پیروں میں ڈالے خاتون سے کچھ کہا۔ مریم بھی ان سے کچھ بولتی رہی۔

وہ کمرے کے وسعت میں پاؤں فرش پر بچھے قالین میں گاڑھے اور نظریں اٹھائے ''السلام علیکم'' کہنے کے بعد سے اب تک خاموش کھڑی تھی۔

''وعلیکم السلام۔ میں تو تمہارا بہت دیر سے انتظار کر رہی تھی۔'' خاتون کا لہجہ بہت شفیق تھا۔

''تم لوگ کچھ لیٹ ہو گئے۔'' انہوں نے کمبل اپنے گھٹنوں پر ٹھیک کیا۔

''راستے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی۔''

''جی نہیں۔'' اس نے سکون سے ٹھہر کر ان کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

''تم بیٹھ جاؤ۔ تھکی ہوئی ہو گی۔ شیریں۔'' انہوں نے اپنی زبان میں اس مغرور لڑکی سے کچھ کہا' اس نے ایک طائرانہ نظر اس پر ڈال کر کمرہ چھوڑ دیا۔ اس نے اٹھتے اٹھتے مریم سے کچھ کہا' احکامات کا لہجہ حقارت کی ٹون۔

''تم آگ کے پاس بیٹھو۔'' وہ خالی کی ہوئی کرسی پر سکون سے بیٹھ گئی۔

واقعی اس وقت حرارت کی شدید ضرورت تھی۔

''تمہارا کمرہ سجا دیا گیا ہے۔ شیریں ایک نظر دیکھنے گئی ہے۔ تم چائے پی کر آرام کرو بہت لمبے سفر سے آئی ہو۔'' مریم نے خاموشی سے چائے اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔

''میں بناتی ہوں تم جاؤ۔'' اس نے چائے دانی کے اوپر سے ٹی کوزی اٹھاتے ہوئے کہا۔ مریم اس کی زبان نہیں سمجھی اسے حیرت سے دیکھا اور واپس ہو گئی۔

''لاہور میں موسم کیسا تھا۔''

''یہاں کے مقابلے میں تو بہت گرم تھا۔ آپ کتنی چینی لیں گی؟''

''دو چمچے۔ پھر تو تم کوئی گرم کپڑا نہیں لائی ہو گی۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نے حیرت سے اس مہربان خاتون کی طرف دیکھا جس کو اندازے لگانے میں کمال حاصل تھا اس نے بھی ایک لمحہ ہچکچائے بغیر سکون سے کہا۔

"جی ہاں کوئی گرم کپڑا نہیں لائی تھی کہ یہ شال بھی راستے میں خریدی تھی۔"

"میں دیکھ رہی ہوں۔" انہوں نے یقین سے کہا "یہ یہیں کی شال ہے۔" وہ اس کے ہاتھ سے چائے کے گھونٹ لے کر بھرنے لگیں۔ وہ لوگ شاید یہاں ہلکے رنگ کی چائے پینے کے عادی ہیں اور وہ اتنی پھیکی ہوئی تھی کہ اس کا جی چاہا رہا تھا۔ وہ لاہور جیسی کڑک چائے پی کر بستر میں لیٹ کر خوب کروٹیں لے کر تھکن اتارے۔ لیکن اس نے سکون سے چائے پی نازک سی پیالی خالی کر کے اس کے ساتھ کی حسین طشتری میں رکھ دی۔

مریم کوئی اطلاع لائی کہ شیریں نے اس کے کمرے کو آخری نظر ڈال کر او کے کر دیا ہے۔ انہوں نے مریم کو کچھ حکم دیا۔ (غالباً "یہی کہ اس کو اس کے کمرے میں چھوڑ آؤ) اس کے بعد وہ سکون سے چائے کے گھونٹ بھرنے لگیں۔

وہ مریم کے ساتھ ساتھ چلی اس کا کمرہ رہائشی کمروں کے آخر میں برآمدوں کی طرف تھا اس نے کمرے میں داخل ہو کر چاروں طرف نظر کی۔ ایک کمرہ ایک ڈریسنگ روم اور اس کے ساتھ باتھ روم یہ اس کی کل جاگیر تھی۔

مریم اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ وہ کمرے میں پڑے فرنیچر اور اس سے متعلق چیزیں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اسمگلر ہوں کیا معلوم وطن دشمن ہوں۔ وہ بغیر سوچے سمجھے یہاں تک آ تو گئی تھی یہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا اس نے گھبرا کر کھڑکی کھول لی۔ آیوی کی نازک سی بیل سامنے والے ستونوں سے لپٹی اس کی کھڑکی تک آ پہنچی تھی۔ کمرے کے پیچھے باغ کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا کھڑکی کے عین نیچے سارس کے خوش نیلے پھول لہرا رہے تھے۔ اس نے دوبارہ کھڑکی بند کر دی۔

مریم اس کے لیے گھسیٹتی ہوئی ایک بیگ لائی اور اپنی زبان میں بہت کچھ کہہ کر چلی گئی وہ تشویش سے بیگ دیکھتی رہی پتا نہیں اس کو یہاں کیا کرنا ہے۔ سونا اسمگل کرنا ہو گا یا ہیروئن بیرون ملک لے جانی ہو گی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ وہ یہاں سے بھاگتے بھاگتے مر بھی جائے گی تو نکل نہیں سکتی۔ اتنے اونچے گیٹ اور لوہے کی خاردار تاروں سے بچ کر وہ کہاں جا سکتی ہے۔ اس نے سوٹ کیس کا ڈھکن ڈرتے ڈرتے اٹھایا اور شرمندہ ہو کر گرا دیا۔ اس میں مختلف رنگوں کے سویٹر اور شالیں پڑی تھیں اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اور فرصت سے چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔

یہ خوب لمبا چوڑا کمرہ تھا بہت اونچی چھت والا اس لیے کھڑکیوں کے پردے سارے کمرے میں پھیلے نظر آ رہے تھے۔ وسط میں ایک بیڈ تھا اور اس کے نزدیک سائیڈ ٹیبل۔ اس نے اپنا بیگ وارڈ روب میں کھڑا کر دیا ابھی تک اس کا انٹرویو نہیں ہوا تھا انٹرویو ہو چکے تو اس کی رہائش عدم رہائش کا فیصلہ ہو گا گرم کپڑوں والا سوٹ کیس بھی اس نے سائیڈ پر کھڑا کر دیا دیوار میں نصب ایک چھوٹا سا ٹی وی آبادی اور دنیا سے اتنی دور اتنا سامان تعیش اور ایسا جدید رہن سہن وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پتا نہیں اس کو یہاں کیا کرنا ہو گا۔

کتنی دیر اس نے اپنی خواہش کے مطابق کروٹیں لے لے کر تھکن اتاری شاید اسی میں تھوڑی سی نیند

بھی آئی۔ ہلکی سی اونگھ نے ہی ساری تھکن اتار دی۔ سامنے الائچی کے درخت پر کوا اپنی پھٹی ہوئی آواز میں کائیں کائیں کر رہا تھا۔

باہر اندھیرا پھیل گیا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹی وی آن کیا بڑی غیر واضح اور مبہم سی نشریات کوئی دور دراز کا اسٹیشن ریلے کر رہا تھا اس نے ٹی وی آف کر دیا لائٹس آن کیں بڑی شدت سے بھوک لگی تھی عین اسی وقت چراغ کے جن کی طرح مریم اس کے سر پر آ گئی۔ وہ بڑی دیر تک اسے کچھ کہتی رہی۔ اس نے پوری توجہ صرف کر کے بات سمجھنے کی کوشش کی لیکن ایک لفظ پلے نہیں پڑا۔

"کاش مریم! میں تمہاری زبان سمجھ سکتی۔" اس نے تمسخرانہ بے بسی سے کہا۔ "زبان یار من ترکی۔" لیکن وہ ایسی طرح جمی رہی۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں۔" اس نے کئی دفعہ اثبات میں سر ہلایا۔

"تو ہم سے اچھی تو یہ رہی۔" اس نے بے بے کے بھجوائے ہوئے سویٹر میں سے ایک چڑھایا شال کندھوں پر ڈالی اور باہر آ گئی۔

رہائشی کمروں سے آگے مریم اسے لیے لیے چلی اسے ابھی یہاں کا جغرافیہ اچھی طرح سمجھ نہیں آیا تھا وہ جس طرف مڑی تھی یہ غالباً "کھانے کا کمرہ تھا۔ جیسے میس میں کھانے کے کمرے ہوتے ہیں۔ چھوٹی فیملی کے لیے نسبتاً "ایک چھوٹا اور فنکشن کے لیے ایک بڑا ہال طویل و عریض تھا۔

"تمہاری تھکن کچھ کم ہوئی۔"

"شکریہ بہت بہت میں نے خوب آرام کیا ہے۔" وہ اپنی کرسی گھسیٹ کر ایک نظر حاضرین پر ڈال کر بیٹھ گئی۔

"کافی دیر ہم نے تمہارا انتظار کیا۔" بے بے نے ایک معذرت کی نظر شیریں پر ڈالی۔ وہ بے توجہی سے اپنا سوپ پی رہی تھی۔

"خان گل نے بتایا تھا کہ پنجاب میں رات کو لوگ چاول کھاتے ہیں۔ میں نے خاص طور پر اسی لیے خانساماں سے کہا چاول بنانے کو۔"

"تھینک یو۔" اس نے ایک نظر خان گل پر ڈالی۔

"بہت بھوک لگی ہے بے بے۔" اس نے بے صبری سے بے بے کو اردو میں مخاطب کیا۔

"تو ڈالو نا جان بے بے مہمان کو دو پہلے۔" وہ ہچکچا رہی تھی یہاں مہمان کو صرف مہمان کے نام سے پکارا جاتا ہے نہ اس کا نام لیا جاتا ہے نہ اس کا کوئی رشتہ ہوتا ہے۔

وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ کھانا ختم کر کے سنہری قہوہ پیا تو ہال کے دروازے پر نمایاں نظر آنے والے کلاک میں اس وقت پونے سات بجے تھے وہ ایک اکیلی ان میں اجنبی تھی۔ لیکن اجنبیت کی یہ دیوار چاروں کے درمیان حائل ہو گئی۔ خاموشی سے کھانے کھانے اور قہوے کے بعد بے بے نے اپنا کروشیہ سنبھال لیا وہ پتا نہیں کس کے لیے کیا بن رہی تھیں۔ اونی سلائیوں کی ٹوکری سنبھال کر وہ آتش دان کے پاس جا بیٹھیں۔

شیریں اپنی زبان میں معذرت کر کے چلی گئی تھی۔ خان گل وہیں کھانے کی میز پر بڑے بڑے جہازی سائز آڑوؤں کے چھلکے چھیلتا رہا۔ بے بے نے ایک نظر پیار پر ڈالی۔

"ہم لوگوں کا قاعدہ ہے ہم رات کا کھانا کھا کر کچھ دیر ساتھ باتیں کرتے ہیں تمہارا دل کرتا ہے تو تم بھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیٹھو۔"

وہ کرسی سے اٹھ کر مگو مگو کی کیفیت میں تھی کہ پلیٹ میں پھانکوں کی صورت میں کٹے سرخ و سفید آڑو خان گل نے اس کے سامنے رکھ دیے۔

"یہ لیں بی بی آپ۔"

"مہربانی۔" اس نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر کہا۔

"مہربانی کا کیا مطلب لیں گی یا نہیں لیں گی۔"

"خان گل۔" بی بی نے تنبیہی آواز نکالی اور ایک لمبا فقرہ بولا۔ وہ نہایت سعادت مندی سے بی بی کی بات سنتا رہا۔

"میں نے کیا ہے آپ کو پریشان۔ واہ یہ اچھی رہی وہاں پشاور سے کاندھوں پر لاد کر یہاں تک لایا۔" انہوں نے پھر کچھ کہا۔

"کیوں بھئی میرا بولنا برا لگا۔"

"نہیں کوئی برا نہیں لگا' میرا خیال ہے میں اپنے کمرے میں چلتی ہوں' یہاں پر کتابیں ہوں گی۔ میرا مطلب ہے مجھے رات کو نیند دیر سے آتی ہے۔" وہ کرسی میز کے نیچے کر کے کھڑی ہو گئی۔

"ہوں۔ ہوں گی تو صحیح لیکن شیری کی پچھار میں ہوں گی۔"

"اوں۔" بی بی نے کروشیا کی چین گنتے گنتے پھر ہاتھ روک لیا۔

"وہاں شہر میں لوگ دیر سے سونے کے عادی ہیں لیکن یہ ویرانہ ہے یہاں آدھے گھنٹے بعد آدھی رات کا سماں ہو گا' آئیں میں آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ دوں۔" وہ اخلاقیات برتتے اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ بی بی کو اللہ حافظ کہہ کر اس نے پلٹ کر دیکھا وہ مخصوص بوڑھی عورتوں کی طرح کسی سوچ میں غرق تھیں اون کا سرا ہاتھ میں پکڑے۔

"اور شیری کی پچھار کہاں ہے۔" اس نے اس کے ساتھ برآمدے کا سرا عبور کرتے ہوئے پوچھا' وہ خوشی سے مسکرا دیا۔

"اب آئی ہیں تو شیر' بھیڑیے سب ہی دیکھ لیں گی فی الحال آپ آرام کیجئے' ٹی وی دیکھئے۔"

"وہ نظر ہی نہیں آتا۔"

"اب نظر آئے گا' رات ہوتی ہے تو نشریات کچھ واضح ہو جاتی ہیں اصل میں یہ وادی ہے نا تو پہاڑوں سے رکاوٹ ہوتی ہے۔ سو شب بخیر لیلٰی اور میٹھے خواب دیکھئے۔" وہ انگریزی میں دعائیں دیتا سیدھا چلا گیا' وہ غالباً کسی کام سے کہیں جا رہا تھا۔ اس کے کمرے کے پاس لحہ بھر کو بھی نہ رکا' اس نے خاموشی سے دروازہ بند کر کے ٹی وی آن کیا' نشریات اب بھی ویسی ہی تھیں' بس مچھر زیادہ کالے ہو گئے تھے اور ثروت عتیق الٰہی آواز سے پہچانی گئی۔ اس نے ٹی وی آف کر دیا۔

کاش کوئی اخبار اٹھا لائی ہوتی۔ شاید اخبار یہاں آتے بھی نہ ہوں۔

دنیا سے بے خبر ہو کر یہ پہلا دن گزرا تھا' دنیا میں اس وقت تیسری عالمی جنگ چھڑ جاتی تو اس کو پتا نہ چلتا' وقت سے یہ لاعلمی بھی بڑی نعمت ہے رات اسے بہت دیر سے نیند آئی۔ اجنبی جگہ' اجنبی چھت' پھر وہ شام میں بے وقت سو گئی تھی' ہلکی سی نیند آتی بھی تو دور سے جنگلی جانوروں کی آوازیں اسے ستا دیتیں' کبھی

کبھی اسے لگتا وہ چڑیا گھر میں سو گئی ہے' باہر جنگلی درندے دھاڑتے پھر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

رات کی بے آرامی کے باوجود اسے جلدی اٹھنا پڑا قبائلی لوگ سحر خیز ہوتے ہیں بلکہ یہاں تک سنا ہے کہ آدھی رات سے اٹھ کر فرش دھونا شروع کر دیتے ہیں۔ فرش دھونے کا رواج تو یہاں کہاں ہو گا۔ ہاں البتہ صبح تو جلدی ہو گی سوکھے گوشت کا ناشتا اس نے زندگی میں پہلی بار کیا' وہ لمبے لمبے دبنے کے گوشت کے سکھائے پارچے تھے جنہیں گھی میں تل لیا گیا تھا' وہ دانتوں میں ربڑ کی طرح کھنچتے تھے۔ ناشتے میں دو قسم کی چائے تھی گلابی بھی اور کالی بھی' علاوہ ازیں وہی ڈبل روٹی' مکھن اور پنیر یہ بھی شاید خان گل نے رکھوائی ہے۔

میز پر ان دونوں کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ ناشتے کی میز پر اسے لوگوں کا انتظار کرتا دیکھ کر بی بی نے بتا دیا تھا "تم ناشتا شروع کرو بیلا اور کوئی نہیں آئے گا۔ شیریں پشاور واپس چلی گئی ہے۔ وہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے جمعہ کی چھٹی گزارنے میرے پاس آ جاتی ہے۔ خان گل اس کو چھوڑنے گئے ہیں۔" وہ ڈبل روٹی پر پنیر کی ہلکی سی تہہ جماتی ایک دم رک گئی۔ بی بی اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"اگر دانیال آ جاتے تو تم سے بات چیت کر لیتے میں چاہتی تھی وہ یہ مسئلہ خود حل کریں۔"

"آپ کے شوہر یہاں نہیں ہیں کیا؟" اس نے ڈبل روٹی کا ٹکڑا دانتوں سے توڑا' "شوہر؟" انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "اوہ۔ دراصل دانیال اس گھر کے مالک ہیں۔" انہوں نے سکون سے کہا۔ "میں تو ان کی دور پار کی رشتے دار ہوں کہ یہ تو ان کی محبت ہے کہ بیوی کے بعد بھی وہ مجھے تنہا چھوڑنے کے بجائے یہاں لے آئے میں بنوں میں تھی۔" وہ اپنی کم عقلی پر نادم کہاں چپ کی چپ رہ گئی۔

"تو آپ کے عزیز دانیال خان میرا انٹرویو کریں گے۔"

"نہیں انہوں نے مجھے اختیار دیا ہے' لیکن میں یونہی سوچ رہی تھی کیا تعلیم ہے تمہاری۔"

اگر گوشی کے بقول اس نے جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا اور دو ماہ ٹھہر جاتی تو آج یقین سے ایم اے کہہ سکتی تھی۔ لیکن اس نے امتحان نہیں دیا تھا اور پے در پے ہنگاموں کی وجہ سے امتحان کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

"بی اے۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"کچھ اپنے والدین کے بارے میں بتاؤ؟"

"میری ماں بچپن میں فوت ہو گئی تھیں۔ والد کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔"

"بہن بھائی؟"

"کوئی نہیں ہے۔"

"عزیز احباب' رشتے دار؟"

"نہیں۔"

"اوہ۔" دکھ سے ان کا چہرہ اتر گیا' غالباً ان کو یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ وہ یہاں تک کیوں پہنچی ہے۔

"مجھے تو بس یہ ہی تشویش تھی اتنی سی عمر میں زندگی کیا کچھ کر ڈالتی ہے یہاں کام زیادہ نہیں۔ دراصل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہاں کوئی لڑکی نہیں ہے نا' دانیال چاہتے ہیں۔" انہوں نے روانی سے بولنا شروع کردیا۔ "کہ ان کا یہ گھر جنت کا نمونہ لگے۔ وہ یہاں بہت کم ٹھہرتے ہیں۔ ان کی مصروفیت ہی اتنی ہے۔ لیکن اس جگہ سے ان کو اتنی انسیت ہے کہ۔۔۔ اب یہ گھر تم کو دیکھنا ہوگا' وہ یہاں آنا تو چاہتے ہیں لیکن اس لیے نہیں آتے کہ ان کے مہمانوں کی بہتر آؤ بھگت نہیں ہو پاتی۔ وہ فطرتاً مہمان نواز ہیں اور ان کے حلقہ احباب میں غیر ملکی بھی ہوتے ہیں' تم سنبھال لو گی نا۔"

"میں دیکھوں گی سنبھال سکتی ہوں یا نہیں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

بے بے نے بے پناہ حیرت سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کے خیال کے مطابق اس نے ذرا بھی شیخی نہیں ماری تھی' اس سے پہلے جو لوگ آئے تھے انجام کار ان کو معذرت ہی کرنی پڑی تھی۔ وہ کتنی دیر خاموش رہیں "پیسوں کا ذکر اچھا تو نہیں لگتا لیکن کر لینا چاہیے۔ تمہیں اندازاً" کتنے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔" وہ کچھ دیر سوچتی رہی' اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں بھینچتے کچھ دیر سوچا "دراصل مجھے اندازہ نہیں لیکن مجھے پناہ چاہیے' کوئی ایک جگہ جہاں میں سکون اور اپنائیت سے رہ سکوں' تنخواہ جو بھی دے دیں' میں یہاں ہمیشہ تو رہوں گی نہیں' آخر ایک دن کہیں اور چلی جاؤں گی۔"

بے بے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے پھر فضاؤں میں گم ہو گئیں' یہ لڑکی کس اعتماد سے سچ بولتی ہے کہ پریشان کر دینے والی ہے۔ لیکن اس لڑکی نے انہیں زیادہ دیر پریشان بھی نہیں ہونے دیا' وہ کرسی کھینچ کر کھڑی ہو گئی۔

"بے بے یہاں کوئی ایسی لڑکی ہے جسے اردو آتی ہو۔" انہوں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا وہ کس سکون سے انہیں بے بے کہہ رہی تھی۔ جیسے وہ ان کی گود میں پل کر بڑی ہوئی تھی اچانک یہ لڑکی ان کے دل میں اتر گئی۔ ایسی سادہ' ایسی معصوم' ایسی پر اعتماد لڑکیاں انہیں اچھی لگتی تھیں۔

"ہاں شاید پری کو تھوڑی بہت آتی ہے۔" انہوں نے بے خیالی میں کہا۔ "وہ شیری کی لڑکی ہے۔"

"مریم۔" انہوں نے ہدایت دی کہ پری سے ان خاتون کی فوری ملاقات کا بندوبست کرا دو۔ وہ دوران ہدایت مسکرائی' شرمائی اسے دیکھتی رہی کل سے وہ اس سے بہت خوفزدہ تھی' یہاں ایسے ہی مہمان آتے تھے جو گھر والوں کو ڈرا دیتے ہیں۔ لیکن وہ مہمان بیچ بیچ میں مسکرائی تھی۔ اور مریم سے کچھ کہتی تھی' جو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

شیری کی لڑکی ڈرتی ڈرتی آئی' اس کے گمان میں اس سے مہمان کی شان میں کوئی گستاخی ہو گئی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟ پری؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"پری جی۔" وہ بہت سادہ تھی۔

"تم نے یہ وادی دیکھی ہے ساری۔"

"ہاں جی۔"

"مجھے ذرا یہاں کی سیر تو کرا دو۔ اجازت ہے نا بے بے۔"

"کیوں نہیں سو بسم اللہ۔ دانیال آ گئے تو کام بڑھ جائے گا اس دوران اچھا ہے تم تھوڑی سی تفریح کر لو۔" مریم نے بھی شاید ساتھ جانے کی اجازت چاہی تھی لیکن غالباً "نہیں ملی" وہ منہ بسورتی واپس چلی گئی۔

"آپ پہلے گھر دیکھو گے یا گاؤں؟" پری نے ادب سے پوچھا۔

"جو بھی زیادہ خوب صورت ہو۔" وہ محرابی طرز کے دروازے سے نکلی سامنے دور دور تک گڑھی کا علاقہ نظر

آ رہا تھا' اور بہت دور خاردار تاروں کا جنگلا تھا۔ پتھروں کی دیوار سے اٹکا لوہے کا عظیم الشان پھاٹک پاٹوں پاٹ کھلا تھا۔

"ارے خان گل اتنی جلدی واپس آ گئے۔" اس نے حیرت سے سوچا۔ ایک خوب صورت سی جیپ تیزی سے عمارت کی طرف آ رہی تھی۔

"مالک" پری نے بے ساختہ چلا کر کہا۔ "مالک آ گئے" وہ اس کو قطعی بھول کر چھلانگ مار کر اندر چلی گئی۔

وہ سیڑھیوں پر حیران پریشان کھڑی افراتفری میں بھاگتے لوگوں کو دیکھنے لگی۔

صرف دو سیڑھیاں نیچے وہ جیپ آ کر رکی تھی۔ جس کا استقبال جنگل سے بھاگے کسی چیتے کی طرح کیا گیا تھا اور پیچھے وہ چوبی منقش دروازہ تھا جہاں سے پری چھلاوے کی طرح غائب ہوئی تھی۔ عمارت کے دائیں بائیں سے عجیب عجیب نئی نئی شکلوں کے لوگ جیپ کے گرد منڈلانے لگے تھے۔ آنے والے نے اپنا دروازہ خود کھولا تھا۔ وہ نیچے اترا تو لوگ مکھیوں کی طرح اس کے گرد منڈلانے لگے تھے۔ وہ ان کی زبان سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔ لیکن بار بار ماتھے پہ ہاتھ لے جانے اور اونچا اونچا جلدی جلدی بولنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ اس کے آنے سے بہت خوش تھے اور وہ خوشی کا بھرپور اظہار بھی کرنا چاہتے تھے۔

وہ ان کے درمیان گھرا ان کا پیار وصول کر رہا تھا۔ اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ سفر کی تھکان کے باوجود اس کا چہرہ خوش باش اور تر و تازہ تھا۔ وہ ایک ایک کندھے پہ ہاتھ رکھتا ان کی پیٹھ تھپکتا واضح کر رہا تھا کہ وہی اس گھر کا مالک ہے اور اس کو گھر اور گھر کے مکینوں سے کتنا پیار ہے۔ ونٹی جوگرز اور نیلی جینز پہ چمڑے کی جیکٹ کندھے پر لٹکائے وہ تیز تیز قدموں سے انہی دو تین سیڑھیوں کو پار کر کے عمارت کے اندر غائب ہو گیا۔

باہر لوگ اس کی آمد کے سلسلے میں انتظامات کے لیے خوشی کے پروگرام بنانے لگے۔ کاش وہ ان کی زبان سمجھ سکتی۔ وہ بھی ان کی خوشیوں میں سے کچھ حصہ وصول کر سکتی۔ حالانکہ اس کو نئے شخص کے آنے کی نہ خوشی نہ تھی۔ وہ جو ہوا کے ایک جھونکے کی طرح اس کے نزدیک سے گزر کر چلا گیا تھا۔ اور جاتے جاتے پری گل' مریم اور دیگر واقفین کو بھی غائب کر گیا تھا۔

اندر کی عمارت زندہ ہو گئی۔ وہ سویا سویا سناٹا جیسے خاموشی میں کانچ کا برتن گر کر چھناکے سے ٹوٹ بیٹھا تھا۔ پتا نہیں یہ احترام تھا یا خوف۔

ہر شخص اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں جٹ گیا تھا' حالانکہ وہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ اس کے ذمہ بھی کچھ فرائض عائد تھے۔ لیکن ان فرائض کی نشاندہی نہیں ہوئی تھی۔ زبانی بھی اور خط میں بھی جگہ جگہ لکھا تھا۔ وہ جب گھر آتے ہیں ان کے ساتھ ان کے مہمان ہوتے ہیں اور ان مہمانوں کے احترام میں آپ کو۔۔۔ وغیرہ۔

وہ اکیلا آیا تھا۔ اور ظاہر ہے اس کی خاطر مدارات کرنا تو اس کی ذمے داری نہیں۔ اس نے قد آور اخروٹ کے درخت پر لٹکے سبز سبز اخروٹوں کو ـــــ دیکھ کر سوچا۔ آج کا سارا دن برباد ہو گیا۔ اور جتنے دن یہ شخص یہاں رہے گا' وقت برباد کرتا رہے گا' گھر کی بھاگ دوڑ سے اس بات کا تو واضح اندازہ ہو ہی گیا۔

وہ سامنے پھیلی طویل سڑک پر جو بہت آگے جا کر چار دیواری کے گیٹ سے مل جاتی تھی ٹہلتی رہی۔

لمحہ بھر میں گھر بھر میں افراتفری مچ گئی۔ ہر شخص اپنی اپنی زبان میں مالک کے اچانک آ جانے کا فسانہ گھڑ گھڑ کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ستا رہا تھا۔ وہ خوب صورت سی خاکی جیپ پھاٹک کے راستے ہچکولے کھاتی اندر آرہی تھی۔

بہت دور سے خوبانی کے شگوفوں کی مہک اس کو حصار میں لیے تھی۔ جنت میں شاید ہواؤں میں ایسی ہی خوشبو ہو۔ ایسا ہی آسمان ہو۔ ایسی ہی زمین۔" اس نے نہایت شدت سے سوچا۔ ایسی دلفریب جگہ پر انسان عمر بھی گزار دے تو رائیگاں نہیں جائے گی۔ لیکن دانیال خان تو ابھی تشریف لائے تھے۔ شاید بے بے کی سفارش پر اس کو رکھ لیا جائے۔ اور شاید اس کا مزید دل دکھا دینے والا انٹرویو کیا جائے۔

وہ دونوں صورتوں کے لیے خود کو تیار رکھنے کی جدوجہد کرنے لگی۔ وہ سب آپس میں کسی نہ کسی رشتے سے بندھے تھے۔ نوکر، مالک، آقا، بہن بھائی، عزیز، رشتے دار، اجنبی تھی تو ایک وہی۔ برآمدوں کے ستون سے جہاں آئیوی کی بیلیں سارے گھر پر چھائی ہوئی تھیں۔ اس نے کمر ٹکاتے ہوئے سوچا، وہ چپکے سے بھاگ کر اپنے کمرے میں چھپ جائے۔ گھر سے جس اعتماد اور عزت نفس کو لے کر نکلی تھی، وہ جانے کس کونے کھدرے میں جا چھپا تھا۔ ہاں صرف ایک خوف، ہر خوف، ہر احساس پر چھایا گیا تھا۔ کہیں وہ رد نہ کر دی جائے۔ کہیں وہ ٹھکرا نہ دی جائے۔ آخر اس میں عام لوگوں کے مقابلے میں کوئی غیر معمولی بات بھی تو نہیں تھی۔

ایک چکر اس نے سڑک سے پھاٹک اور پھاٹک سے سڑک کا کاٹا۔ ہواؤں کے تیز جھکڑ اس کو گھبرائے دے رہے تھے۔ دوسرا لمبا چکر لگانے کے بجائے اس نے خاموشی سے نقشین دروازہ آہستہ سے کھولا۔ لمبی گیلری خاموش اور پرسکون تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ مالک کے کمرے کہاں ہوں گے۔ ابھی تک اس نے بے بے کے علاوہ کسی کا بھی کمرہ نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اسے اتنا یقین تھا کہ وہ جہاں بھی ہوں گے، سب وہیں ہوں گے۔ وہ قالین پر بے آواز قدم دھرتی آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف آرہی تھی کہ اچانک کسی طرف سے پری دروازہ کھول کر اس کے سامنے آگئی۔

"آپ کو بلا رہے ہیں۔"

"مجھے؟" وہ ٹھٹک گئی۔ پچھلے ایک گھنٹے سے وہ جس عذاب سے بچنے کے لیے ہر جتن کر بیٹھی تھی، وہ اس کے سامنے آہی گیا۔

"کون بلا رہا ہے؟" اس نے یونہی تسلی کے لیے پوچھ لیا۔

"وہ۔۔۔" پری نے پشت کی طرف اشارہ کیا۔ اس کو اردو آتی تھی لیکن اتنی نہیں کہ ہر بات مکمل اور واضح طور پر سمجھا سکے۔

اس کے بعد وہ رہنما بن کر آگے آگے چل پڑی۔ طویل کوریڈور سے وہ مختلف راہداریاں عبور کرتے ایک دروازے کے سامنے رک کر کھڑی ہو گئی۔ کمرے کی چہل پہل اور تیز آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اندر کوئی ہے۔ دروازے کے سامنے سے نیچے سیڑھیاں تہہ خانے کی طرف اتر رہی تھیں۔ تہہ خانے کے سامنے ہی وہ دروازہ تھا جس میں پری کے حکم کے بموجب اس کو داخل ہونا تھا۔

"کہاں گئی آخر؟" اندر سے آتی جھلائی ہوئی آواز نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔ کیا ہوا؟ اس نے حلق سے تھوک نگلا۔ اس کو بہرکیف اپنا اعتماد بحال کرنا ہوگا۔ ٹھیک ہے اس نے کشتیاں جلا دی ہیں لیکن واپسی کے تمام ٹھکانے تو تہِ آتش نہیں کر دیے۔ وہ اس کو نہیں رکھے گا۔ اس سے بدتمیزی کرے گا۔ وہ اس سے پہلے ایسی نوکری کو ٹھوکر مار کر چلی جائے گی۔

اس نے بولٹ نیچے کر کے دروازہ کھولا۔ بڑے یقین اور اعتماد سے اندر قدم رکھا۔

دانیال خان قد آدم چوبی الماریوں کے کھلے پٹ کے درمیان ہزاروں فائلوں اور رجسٹروں کے درمیان کھڑا جھنجلا جھنجلا کر کاغذات ایک طرف ڈھیر کر رہا تھا۔

"پیلے رنگ کی تھی۔ سبز حاشیے والی۔ میں نے پچھلی مرتبہ اسی الماری میں رکھی تھی۔ میری غیر موجودگی میں آخر کون میری چیزیں چھیڑتا ہے۔"

وہ دوبارہ اسی الماری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تمہاری چیزیں کون چھیڑتا ہے دانیال! اسٹڈی کے طرف تو کوئی آتا بھی نہیں۔" وہ سکون سے نرم صوفے میں غرق سلولائیڈ کی سلائیاں اون میں الجھاتی رہیں۔

"پلیز بے بے۔ مجھے فوراً چاہیے۔ بہت اہم فائل ہے۔" اب اس کی آواز میں دھیما پن تھا۔

شکر ہے وہ اردو زبان میں مخاطب تھا۔ ورنہ اپنی زبان میں کی گئی ایسی گفتگو کا ایک لفظ اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور وہ گونگے بہروں کی طرح انجان بنی ایک ایک کی شکل تکتی ہونق جیسی لگتی تھی۔

"بیٹھو۔" بے بے اس کو دیکھ کر شفقت سے مسکرا دیں۔ "میں نے تمہیں اس لیے بلوایا ہے کہ تم دانیال سے ملیں؟"

اس نے ایک نظر ہزاروں فائلوں اور بوسیدہ کاغذوں میں گم اس شخص پر ڈالی۔ جو پیٹھ پیچھے ہونے والی ہر گفتگو سے لاتعلق تھا۔

"اور اس کیبنٹ کی چابی کہاں ہے؟" اس نے اگلی الماری کا دروازہ جھنجلاہٹ بھری طاقت سے کھینچا۔ دوسری میز کی دراز کھینچی۔ چابیوں کے گچھے میں سے ٹٹول کر مطلوبہ چابی نکالی۔ کی ہول میں گھمائی ہی تھی کہ دروازہ ایک طرف سرک گیا۔

"یہ۔۔۔ یہ والی۔" اس نے اطمینان کا ایک سانس لے کر فائل گھسیٹ لی۔

"دانیال۔۔۔ یہ بیلا ہے۔ میں تمہارا اس سے تعارف کرانا چاہتی تھی۔"

"ہوں۔" اس نے ٹیبل لیمپ آن کر کے فائل کے کاغذات پلٹنے شروع کر دیے۔

"تمہارا تعارف ہوا؟" اب کے انہوں نے ناکام ہو کر بیلا کو مخاطب کیا۔

پتا نہیں۔ اس نے دل میں سوچا۔ اگر بگولے کی طرح پاس سے گزرنے کا مطلب تعارف کرانا ہے تو ہو گیا ہو گا۔ اس نے خاموشی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"دانیال۔ آپ بہت مصروف ہیں، مجھے احساس ہے۔ لیکن یہ بھی بہت ضروری ہے۔"

"کیا چیز؟" وہ کرسی گھسیٹ کر لیمپ کے بالکل نزدیک ہو گیا۔ اس نے ایک نظر اس بے تحاشا مصروف شخص کی طرف دیکھا۔ وہ لاتعلق سا تھا۔ بے پروا سا، بے فکر۔

اس نے ایک مرتبہ بھی بے بے کی بات دھیان سے نہیں سنی تھی۔ لیکن ان کی ہر بات کا جواب ضرور دیا تھا۔ یونہی جیسے کوئی ننھے بچے کی غاؤں غوں کی طرف دیکھے۔

"یہ بیلا ہیں۔ تم نے گھر کے لیے کسی سرپرست کی بات کی تھی۔ یہ اسی سلسلے میں آئی ہیں۔"

"اوہ!" اس نے پہلی مرتبہ لمحہ بھر کے لیے ہاتھ فائل میں رکھ کر مسلسل جھکا ہوا سر اٹھایا۔ "میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ آپ نے رکھ لیا کسی کو؟"

"رکھ تو لیا ہے لیکن اگر تم۔۔۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آپ نے اپنی تسلی کر لی؟" وہ وہیں فائل میں ڈوبا بولا۔

"ہاں۔ میں نے تو کر لی لیکن۔"

"بس پھر بات ختم ہو گئی۔ ٹھیک ہے۔" اس نے سکون کا گہرا سانس لے کر مطلوبہ صفحہ کھولا۔ وہ اب شاید فائل سے مخاطب تھا۔ بات فائل کی ختم ہوئی تھی' بے بے کی نہیں۔ اس نے نشان وہی کے لیے بلا سا ٹیگ چپکایا۔ فائل بند کی۔ اور اپنی جگہ سے اٹھ کر مڑ گیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ دروازے کے نزدیکی صوفے پر بیٹھی بے بے کے سامنے جھک کر والہانہ سے مسکرایا۔

"میں ہمیشہ آپ کو پریشان کرنے آتا ہوں۔"

بیلا نے لمحہ بھر کے لیے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ جب سے اس کو بولتا سن رہی تھی' وہ ٹائپ رائٹر کی طرح ٹھک ٹھک بج رہا تھا۔ لیٹسٹ ایپلی کیشن کام کام۔ انسانی ہمدردی اور انسانی تعلقات سے متعلق اس نے یہ پہلا فقرہ بولا تھا' اس کے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے اور تھکن اس کے چہرے کی ایک ایک رگ میں تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ مسکراتا ہوا چہرہ لکڑی کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ ٹرے میں رکھی لبالب چائے سے بھری پیالی پر ایک پتلی سی جھلی آ گئی تھی۔

"دیکھا۔" انہوں نے بیلا کی طرف شکایت سے دیکھا۔ "یہ اس طرح کرتے ہیں۔ نہ کچھ کھایا' نہ پیا' ٹرے کو چھوا بھی نہیں۔"

پھر اردو میں ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکلیں' بہ زبان پشتو وہ کسی سے مخاطب ہو کر سخت ناراضگی کا اظہار کر رہی تھیں۔ وہ اندر بیٹھ کر کرلی بھی کیا۔ بے بے کے پیچھے خاموشی سے باہر آ گئی۔ بہت جلدی کوریڈور خالی ہو گیا۔ دانیال خان غالباً "اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ اور بے بے اپنے کمرے میں۔

دوپہر کے کھانے کا اہتمام کس کو کرنا ہو گا؟ اور یوں بھی اب لنچ کا وقت بہت تنگ ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی چوپٹ کھول دی۔ یہ نظارہ اسے بہت پسند آیا تھا۔ آسمان اس نے کہیں اتنا نیلا نہیں دیکھا تھا۔ بادل شفاف ہوتے اور درختوں کے پتے زمرد کی طرح شفاف اور چمکیلے' اس نے لگے جیسے سفید بادلوں کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر سوچا' اگر اس کا بلاوا آیا تو وہ کسی بھی کام کے لیے تیار ہو جائے گی۔ فی الحال اسے بادلوں کی آنکھ مچولی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ آسمان آہستہ آہستہ بھرنا شروع ہو گیا تھا' کسی بھی دم میں شاید بارش شروع ہو جائے' اس نے خان گل کی بلائی ہوئی شال کندھوں پر ڈالی۔ جو کام بے بے مکمل نہیں کر سکی تھیں' اس نے خود ہی کرنے کی ٹھانی۔

مین گیٹ سے باہر دنیا بدل جاتی تھی۔ سامنے جو بل کھاتی ناہموار سی سڑک پھاٹک سے جاتی تھی۔ وہ پھر اس پر نکل گئی۔ اخروٹوں کے جھنڈ سے پرے غالباً "ملازمین کے گھر تھے۔ ایک چوڑی سی پگڈنڈی اس راہ پر بھی جا رہی تھی۔ معلوم نہیں ملازمین کے ہاں جانے کی اجازت ہوتی ہے یا نہیں۔ اور وہ ان اجازتوں اور غیر اجازتوں کی پابند ہے یا آزاد؟ کھپریل کی نیچی چھتوں والے ٹین کے بنے گھر اسے دور سے بہت دلچسپ لگ رہے تھے۔ کسی دن وہ فرصت سے سب کے گھر جائے گی۔ باری باری' تاہم فی الحال وہ چلتی

چلتی اتنی دور نکل نہیں جانا چاہتی تھی کہ اسے آواز بھی دی جائے تو بے خبر جانا تصور کیا جائے۔

اور خدا معلوم جو دانیال خان ہی آواز دے ڈالیں۔ انٹرویو کر لیں۔ کوئی کام کہہ دیں۔ اسے اس قسم کے ورکنگ ٹیپرز سے بہت ڈر لگتا' اس کے پاپا بھی بہت کام کرتے تھے۔ لیکن جب کام ختم ہو جاتا تو وہ فرصت سے گھر کی باتیں کرتے لیکن اس شخص کو سوائے کام کے اور کوئی کام نہیں شاید۔

بے بے درمیان والے کمرے میں اسی تندہی سے اون کے گولوں میں الجھی ہوئی بار بار گھر گن رہی تھیں۔ اس کو دیکھ کر ان کی تھکن جیسے اتر سی گئی۔

"میں نے دیکھا تھا تمہیں سڑک کی طرف جاتے ہوئے۔ میں نے سوچا اچھا ہے تازہ ہوا لگا لو۔"

"کوئی کام تو نہیں ہے؟" اس نے حتی الامکان بہت مودب لہجے میں پوچھنے کی کوشش کی۔ اس تنظیم کی اس کو عادت نہیں تھی۔ اور اس کی آنکھیں اس تابعداری کے خلاف چغلی کھاتی رہتی تھیں۔

"کام۔ ارے کام ایسا کون سا ہے۔ دیکھو' تم خود ہی کچھ دیکھ لیا کرو۔ جو کچھ گھر میں مناسب لگے' ردو بدل کر دو۔ جس کی ضرورت ہو کر لو۔" وہ سمجھ گئی۔

ان کا مطلب تھا' اپنے ہونے کا مقصد تمہیں خود ہی پورا کرنا ہے۔ یہ کام زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اس کے ثابت کرنا تھا۔

وہ کتنی دیر خاموش رہی۔ "رات کے کھانے کے لیے کوئی خاص انتظام؟"

"کوئی خاص نہیں۔" انہوں نے بے فکری سے کہا۔ "خانساماں روز مرہ کا بنا لیتا ہے۔ مجھے تو صرف دانیال کی فکر رہتی ہے۔ تمہیں شاید علم نہ ہو۔ وہ یہاں سے واپس چلے گئے ہیں۔"

اوہ۔ ایسے سیماب پارہ مالک کی ماتحتی میں کام شاید اتنی سہولت سے نہ ہو سکے جیسے اس نے آثار دیکھ کر سمجھ لیا تھا۔ وہ چکرا سی گئی۔

"چلے گئے۔ اب کب آئیں گے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"خدا جانے یا وہ خود جانیں۔" انہوں نے اون کا الجھا ہوا گچھا سلائیوں میں پرو کر میز پر رکھ دیا۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا۔"

"دل نہیں چاہ رہا تھا۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ دراصل اس کو علم ہی نہیں ہو سکا کھانا کس وقت لگا' عین کھانے کے وقت تو وہ پرندوں اور درختوں سے مذاکرات کرتی پھر رہی تھی۔ اس کو تھوڑا سا ملال ہوا۔ شاید ان کو اچھا نہ لگا ہو' مالک کے ہوتے وہ ان کی ماتحت کو بھی کھانے کی میز پر بلائیں۔ بے بے اون سلائیاں چھوڑ کر بڑے دھیان سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کی آنکھوں کی چمک آہستگی سے ماند ہو کر ایک ملال سا پھیلتے دیکھا تھا۔

"تم ان کے رویے سے برا نہ منانا بیلا۔ وہ یہ سلوک سب ہی کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ وہ کام میں اتنے مصروف رہتے ہیں' ایک مشین سی بن گئے ہیں' انہوں نے خاص طور پر تم کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ ان کی عادت بن چکی ہے۔" بیلا تجل سی ہو گئی۔ وہ بہرکیف یہاں ملازمت پر آئی تھی۔ اور ابھی تک بہاروں اور پہاڑوں کے مزے لوٹ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں ملازمت قبول کر لینے کے باوجود کوئی اس کے اندر اس کا سربلند رکھتا تھا۔ اس کے وقار کو دھچکا نہیں پہنچنے دیتا تھا۔ یہ کافی نہیں۔

"اور یوں بھی ان کی زندگی ایک بہت بڑی ٹریجڈی ہے بیلا۔ تم اس گھر کا فرد بن رہی ہو۔ اگر تم دانیال خان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ماضی سے آگاہ نہیں ہوگی تو کبھی ان کا احترام نہیں کر سکو گی۔ تم نے دیکھا' وہ کتنے اکھڑے رہتے ہیں۔ کتنی بد مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم سب ان سے پیار کرتے ہیں۔ تم ہم پٹھانوں کو نہیں جانتیں۔" ان کی بوڑھی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔ "ہم اپنی روایتوں کے لیے کیا کچھ قربان کر ڈالتے ہیں۔" ان کی آواز رندھ گئی تھی۔ اسی لیے شاید وہ چپ ہو گئیں۔

انہوں نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے آنسو خشک کیے۔ کتنی ہی دیر وہ خاموش بیٹھی خود پر قابو پاتی رہیں۔

"دانیال بغیر کھانا کھائے چلے گئے تو میرا بھی دل نہیں چاہا۔ تم نے بھی نہیں کھایا۔ میں ابھی کھانا منگواتی ہوں۔ ہم یہیں کھالیں گے۔" ہیلا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ان کو کیسے تشفی دے۔ وہ بوڑھی سی عورت جو اپنے دور کے رشتے دار کے کسی انجانے دکھ پر آنسو بہا رہی تھی' وہ ان کو کیسے چپ کروائے کہ تنہائی کے اس نیلے زہر کو اس نے خود قطرہ قطرہ کر کے پیا ہے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں کھانا لگا کر لاتی ہوں۔"

وہ ان کے منع کرنے اور تکلیف نہ کرنے کی ہدایت کے باوجود ٹرے لگا کر لے آئی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے ان کا دل بہلاتی اور ان کی آنکھوں میں دیکھ کر ہنستی وہ لڑکی آہستہ آہستہ ان کے دل میں اتر رہی تھی' اسی لیے شاید وہ دانیال کی ہدایت کے باوجود اس کا سخت سا انٹرویو بھی نہیں کر سکی تھیں۔ وہ باوقار تھی' بااعتماد تھی۔ لیکن کمتر اور حقیر نہیں تھی۔

وہ معمولی سی ملازمت کے لیے بہت دور کا سفر کر کے خود کو بہت زیر بار کر کے آئی تھی لیکن اپنا اور دوسروں کا احترام اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

کھانے کے بعد اس نے ان کو بچوں ہی کی طرح اصرار کر کے قہوہ پلایا۔ اور بھولے سے بھی اس موضوع کو نہیں کریدا جو جذبات کی رو میں بہہ کر وہ کرنے لگی تھیں۔ اگر وہ اصرار کرتی جاتی تو شاید وہ بات مکمل نہ کر پاتیں۔

ان کے دل کی تشفی ہو گئی تھی۔ یا وہ دل ہی دل میں بہت دیر تک دانیال سے شکوہ کناں رہی تھیں کہ اچانک وہ بدل گئیں۔

"دانیال اس قسم کے جاگیردار نہیں جیسے ان قبائلی علاقوں میں ہوتے ہیں۔ وہ بات کرتے ہیں تو آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ناراض ہو رہے ہیں یا مذاق کر رہے ہیں۔ ان کا چہرہ ہمیشہ دو قسم کے تاثرات دیتا رہتا ہے۔ ان کی آنکھیں مسکراتی ہیں مگر چہرہ ظلم کی حد تک سنگین اور سنجیدہ ہے لیکن وہ ظالم نہیں۔ ہاں مگر روایت سے انحراف وہ بھی نہیں کر سکتے۔ تم دانیال کو دیکھو گی تو تمہارا دل خوش ہو جائے گا ہیلا۔"

"ظاہر ہے کیوں نہیں۔" اس نے ان کے بھیگے بھیگے سے بوڑھے ہاتھوں پر اپنی تشفی کے محبت بھرے ہاتھ رکھ دیے۔

"اچھا یہ بتائیے' وہ واقعی ایسے ہیں جیسے آپ کہتی ہیں یا آپ کو لگتے ہیں؟"

ان کو اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شرارت اچھی لگی۔ جیسے وہ ان کی بچپن کی دوست ان کے رازوں کی شریک تھی۔

"میں نے تو پہلے ہی واضح کر دیا۔ جب تم دیکھو گی یا ملو گی تو۔"

ان کی نازک سی پیالی میں بھاپ دیتا قہوہ ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے بڑے غور سے اس کی شکل دیکھی۔

"اچھا تم بھی سچ سچ بتاؤ۔ تمہارا واقعی یہاں دل لگ گیا ہے یا ظاہر کر رہی ہو؟"

"میرا تو بہت دل لگا ہے بے بے۔ میں نے کبھی ایسا خوشبودار کھلا کھلا ماحول نہیں دیکھا تھا۔ باہر سڑک پہ نکلو تو ایسی مسحور کر دینے والی خوشبو ہر طرف سے آتی ہے۔"

"ہاں۔" بے بے نے سادگی سے بات ختم کر دی۔ "وہ بادام کے شگوفوں کی خوشبو آتی ہے۔ تم ہمارے باغ کے بادام چکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ یہاں ایک سے ایک اعلا نسل کا میوہ دانیال نے بڑی محنت سے اگایا ہے۔ یہ سارا علاقہ دانیال کا ہے نا۔ یہ باغات' گھر' اصطبل وغیرہ' جہاں تک دور دور نگاہ اٹھتی ہے وہ سب۔"

ہیلا خاموشی سے گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔ وہ ہیر پھیر کر بات دانیال پر لے آتی تھیں بھلا اس کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ دانیال کے علاقے کی زمین کہاں ختم ہوتی ہے؟ اور دوسرے جاگیردار کی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

اس نے اپنی زندگی تقریباً" ایک عیسائی راہبہ جیسی گزاری تھی۔ اس کے ماضی میں بہت سے لوگ نہیں تھے۔ بہت دوست تھے نہ بہت دشمن' ہاں بس کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ کتابوں کے حوالے سے اس کا نظریہ ان جاگیرداروں کے بارے میں بہت تنگ تھا۔ لیکن وہ اس نظریے کا اظہار کر کے ان کو دکھی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یوں بھی ایک نچلے درمیانے درجے کے بزنس کرنے والے گھرانے میں جاگیردار کا جو نفرت آمیز تصور ہوتا ہے' وہ اس سے نجات پا بھی نہیں سکتی تھی۔

"اگر میری ٹانگیں اچھی ہوتیں تو میں گھوم پھر کر سارا گھر دکھاتی۔ یہ سارا طرز تعمیر دانیال کے والد کے ذہن کی اختراع ہے۔ سب چیزیں انہوں نے ہی مختلف جگہوں سے پرکھ کر اکٹھی کی تھیں۔ وہ ان سب چیزوں کی قدر بھی جانتے تھے۔ وہ دانیال سے بالکل مختلف تھے۔ جو عادتیں ان میں تھیں' وہ دانیال میں نہیں ہیں۔ اور جو کچھ دانیال ہے وہ' وہ نہیں ہو سکتے تھے۔"

وہ جیسے سوتے میں خواب سے بیدار ہو گئیں۔

اس گھر کو کس طرح ترتیب دینا ہو گا۔ سوچ سمجھ کے سلیقے سے۔ اس طرح کہ دانیال خان کے جمالیاتی ذوق پر پورا اتر سکے۔ یہ ڈرائنگ روم اور گیلری تو انہوں نے خود ہی خوب خوب سنوار رکھی ہے' کیونکہ ان کے مہمان عام طور پر یہیں آتے ہیں۔ باقی کمروں کو دیکھنا ہو گا۔ چیزیں کباڑ کی طرح کمروں میں ٹھنسی ہیں' اسٹور بھی بھرا ہوا ہے آہستہ آہستہ کرنے والا کام ہے۔ ظاہر ہے وقت لگے گا۔

وہ آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پہلے کمرے کو کاغذ پر پلین کرنا پڑے گا۔ پھر چیزیں جمانی ہوں گی۔ وہ ان کے کمرے سے نکل کر گیلری میں آئی اور پری کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔

پری اتنی باتونی تو نہیں تھی پھر بھی اگلا سارا دن اس کا چند کمروں کی نذر ہو گیا۔

ڈرائنگ روم اور گیلری بے بے کے بقول چھوٹی نہیں تھیں۔ غالباً" ان ڈائننگ ہال' انہوں نے یہی سمجھایا تھا' دانیال خان کے کمروں سے پرے مہمانوں کے کمرے تھے۔ جن میں پری کے بقول شاذ ہی کوئی آکر ٹھہرتا تھا۔ وہیں ہال تھے' لائبریری تھی۔ عمارت کے پچھلی طرف نوکروں کے کوارٹر تھے۔ ان کے ساتھ اصطبل تھا' معلوم ہوتا ہے دانیال کے والد کافی شوقین مزاج تھے۔ پیسے کی افراط انسان میں ذوق بھی پیدا کر دیتی ہے اور شوق بھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اندرونی طرف سجا ہوا ایک بڑا سا پتھر کے مجسمے کا سر اس کی توجہ ہمیشہ کھینچتا تھا۔ وہ کوئی جان دار زندہ سر لگتا تھا۔ کسی سنگ تراش نے اس شخص کا کندھوں سے اوپر کا مجسمہ بنایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سخت مزاجی تھی۔ اور ہونٹ ایک دوسرے کے اوپر جمے جیسے ضدی اور اپنے ارادے میں اٹل شخص کا پتا دیتے تھے۔

وہ کتنی مرتبہ دن میں گزرتے اس مجسمے کو دیکھتی۔ وہ مجسمہ سنگ تراشی کے اعتبار سے بلاشبہ ایک فن پارہ تھا' دروازے کے عین سامنے وہ ایسی جگہ رکھا تھا کہ گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس پر نظر پڑتی تھی۔ اس نے ڈیکوریٹنگ کے فن پر پڑھتے ہوئے پڑھا تھا۔ کمرے میں کوئی چیز کسی ایسی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ جہاں سے کمرے کی باقی چیزوں سے دیکھنے والے کی نگاہ ہٹا دے۔

اس نے مجسمے کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ جیسے کمرے میں کرنٹ دوڑ گیا۔ امداد کے لیے آئی ہوئی پارٹی نے بری گل کی سمت میں چیخیں ماردیں 'سوائے "نہ نہ کرو" کے کچھ بھی سمجھنے سے قاصر رہی۔ آخر اس مجسمے میں ایسی کون سی افلاطونی شے پوشیدہ تھی۔ کسی وقت بے بے سے فرصت میں وہ اس گھر کی بہت سی تاریخ پر بحث کرے گی۔ وہ خاموشی۔ سے دوسرے کاموں کی طرف متوجہ رہی۔

کام کا پہلا دن بہت مصروف گزرا' اس نے دائیں طرف کے نچلے دو کمروں کو تقریباً "ری سیٹ" کرلیا تھا' یہ مہمانوں کے کمرے تھے۔ سوائے چند چیزوں کے تبادلے' قالین کی تبدیلی اور اکا دکا دیواری آرائش کے' بہت زیادہ کچھ کرنا بھی نہیں تھا۔ کھانے کے وقفے میں اس نے تھوڑی دیر کے لیے کھانے کو وقت دیا تھا' پھر جت گئی تھی۔

البتہ شام کا وقت اس نے نہا دھو کر اخروٹوں کے درمیان ٹہلتے گزارا۔ سارے دن کا سب سے اچھا وقت بس یہی رہتا تھا۔ بے پناہ خوشبوؤں کی مہکاریں' حد نگاہ تک پھیلا آسمان اور روادی۔ اس نے صبح سے پروگرام بنا رکھا تھا' سہ پہر کی ہر حسین شام تازہ ہوا اور پھولوں کی نذر کرے گی کہ جنگل میں جو مزے ہیں وہ شہر کی ساری زندگی میں نہیں لوٹ سکتی تھی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ذرا شام پڑنے سے پہلے وہ دور حد نگاہ تک نظر آنے والے نیلے رنگ کے پہاڑوں کے پیچھے ڈوبتے سورج کو دیکھ سکتی تھی۔

اس سلسلے میں اس کے ساتھ دونوں دن ہر سختی روا رکھی گئی۔ کل بھی اور آج بھی۔ حالانکہ یہ کوئی چلتی سڑک نہیں تھی۔ اور یہاں بے پردگی جیسی چیزوں کے امکان بھی نہیں تھے اس کے باوجود کہیں سے بھی کوئی شخص نمودار ہو جاتا اور اس کو لاطینی زبان میں اس وقت تک کسی آنے والے خوف سے دھمکاتا رہتا جب تک وہ گھر کے اندر نہ چلی جاتی۔

ملیشیا کے سے رنگ کے کپڑوں میں وہ شخص لمبی چھڑی ہاتھ میں لیے اخروٹوں کے جھنڈ میں بہت دور اس کے پیچھے آیا' اچھا' اچھا میں آتی ہوں۔ اور واپسی کے ہر قسم کے اشارے کا یقین دلانے کے باوجود جب آمادہ نہیں ہوا' وہ چھڑی لے کر اس کے پیچھے پیچھے جیسے اسے ہانکتا ہوا سڑک پر لے آیا۔ آسمان کے تمام سفید بادل ڈوبتے سورج کی شعاعوں سے نارنجی ہو چلے تھے۔ اونچے درختوں کی چوٹیاں سنہری مزد دھوپ میں سونے کی طرح دمکتی اس کے قدم روک دیتیں۔

کاش وہ کوئی کیمرہ لائی ہوتی۔ حالانکہ وہ یہاں کسی خوش وقتی کے لیے تو نہیں آئی۔ ایک نئی اور سنگین زندگی کے آغاز کے لیے اس نے اس راستے کو چن لیا تھا۔

بے بے نے اسے چند دنوں کی مہلت ضرور دی تھی لیکن صرف اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو ان لوگوں سے مانوس کر لے۔ اس ماحول کا عادی بنا لے۔ لیکن عادی بننے اور مانوس ہونے کے لیے عمریں تو درکار تھیں۔ یہ تو بے بے نے اپنی تمام تر محبت اور شفقت میں لپیٹ کر یہ سمجھانا شروع کر دیا تھا کہ اگر اس کو یہاں سے کوئی توقع وابستہ ہے تو اس کے لیے کچھ ثابت کرنا ہوگا۔

اس نے دو تین کمرے دیکھے تھے۔ کام کافی وقت لے گا۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ ان وادیوں میں گھومتے گھومتے عمر گزار دے۔ اس کو ہنکا کر سڑک پر لانے والا شخص بہت دور نکل گیا تھا' لیکن جاتے جاتے بھی مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ معلوم نہیں اس کو اس سے کس قسم کا خطرہ تھا۔ عمارت سے دائیں طرف کچی اینٹوں جیسی سڑک بہت دور تک جا رہی تھی۔

یہ سڑک غالباً "گھر والوں اور ملازمین کی رہائش کو آپس میں ملاتی تھی۔ بہت دور پست قد گائے بھینسیں ناز سے چارہ کھا رہی تھیں۔ وہ شام کو بہت دیر تک بھوسے کی جگالی کر کے سوتی تھیں۔ سنا ہے اس طرح دودھ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ اتنی دور بندھی تھیں کہ یہاں سے وہ مناسب طور پر نظر بھی نہیں آ رہی تھیں۔ وہ اکھڑ سا بددماغ غالباً "گائے بھینسوں کا رکھوالا تھا' اور اس کے خلاف شاید اس لیے بول رہا تھا کہ ان لوگوں کے گمان میں دودھ دینے والے جانوروں کو پردیسی کی نظر کھا جاتی ہے۔ رحیم چاچا کی بستی میں اس مسئلے پر بہت جھگڑا ہوتا تھا' لوگ اپنی بھینسوں کے تھن پر غلاف چڑھا چڑھا کر چھپاتے تھے اور باہر سے آنے والے مہمان کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے۔ وہ خود قابل معافی تھی البتہ کیونکہ ان لوگوں کے خیال میں وہ مظلوم تھی' جس کی نظر نہیں لگتی' آہ لگتی ہے۔

رکھوالا دھندلی سی تاریکی میں عمارت کے پیچھے کہیں غائب ہو گیا تھا' گو یہ بہت بدتہذیبی کی بات تھی لیکن وہ اس کو بہت دور تک گھور گھور کر دیکھتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کے تعاقب میں خواب کی سی کیفیت میں چند الٹے قدم چلتی اچھل پڑی۔

کسی نے اپنی سواری اس کے بالکل نزدیک آ کر اس شدت سے روکی کہ وہ خود کو بچاتے بچاتے کانٹے دار جھاڑیوں کی باڑ میں الجھ کر گر پڑی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خوف زدہ ہو گئی۔ ڈوبتی شام کے ایسے وقت میں جب وہ رکھوالے کی جاسوسی کر رہی تھی' وہ کتنی دیر تک سمجھ ہی نہ سکی کہ اچانک اس پر کون سی افتاد آ پڑی تھی۔ کون ہو سکتا ہے یہ بدتمیز۔ اس نے پتھروں کی رگڑ سے اچھل کر زخمی ہو جانے والی ہتھیلیوں کی طرف دیکھا۔ وہ زخمی کرنے والا خود بھی چاروں شانے چت اپنی گری ہوئی موٹر سائیکل میں پھنسا ہراساں سا آسمان کی طرف منہ اٹھائے تھا۔

"تو یہ آپ تھے۔ آپ ہی ہو سکتے تھے۔" اس نے فالسوں کی ایک خشک جھاڑی میں الجھا دوپٹہ گھسیٹ کر کھینچا اور اس کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔

"ہمارے ہاں اس کو بدتمیزی کہتے ہیں' مذاق نہیں۔" اس نے گھٹنوں کے بل جھک کر موٹر سائیکل سے الجھے اس لڑکے سے کہا تھا۔ "اور یہ مذاق یقیناً" آپ کو بہت منگا پڑا۔"

"الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔" اس نے موٹر سائیکل کو جھٹکا دے کر علیحدہ کیا۔ "وہاں سے مسلسل ہارن بجاتا آ رہا ہوں۔ آپ بھٹکی ہوئی روح کی طرح کسی قیس کی تلاش میں تھیں۔"

"سوری۔" وہ خوش دلی سے ہنس دی۔ "میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مجھے تو خیر جو بھی تکلیف ہوئی۔" اس نے اپنے کپڑوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کی تکلیفوں کا آج خاتمہ ہو جاتا۔" اس نے ہنس کر زخم سہنے والی لڑکی کو ڈرا دیا۔

"اگر آپ اس بائیک کے نیچے آ کر ختم ہو جاتیں تو ہمیں کہیں پہاڑ سے ہم آپ کو لڑھکا کر دریا میں گرا دیتے۔ ہمارے ہاں لاشوں کا خاتمہ بالخیر اسی طرح ہوتا ہے۔"

"اور امید ہے آپ کا خاتمہ اسی طرح ہوگا۔"

"یہ تو وارثوں پر منحصر ہے۔ آیئے آپ کی ڈریسنگ کروں۔" اس نے دیکھا بیلا کی ہتھیلیوں سے خون رس رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ معمولی چوٹ ہے 'پاؤڈر' لگا لوں گی۔"

"اور آپ شاید بڑی بڑی چوٹیں کھانے کی عادی ہیں۔"

خان گل کے لہجے کی معنی خیزی اس نے سمجھ لی تھی۔ اس نے ہر بات پر کھٹکنے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرنا پسند کیا۔ سامنے کھڑی عظیم الشان عمارت کے شیشوں سے روشنیاں چمک رہی تھیں۔ جو اس بات کی دلیل تھیں کہ عمارت کے جنریٹر نے کام شروع کر دیا ہے۔

"بائی داوے لیلیٰ بی بی! کیا آپ لاہور کی سڑکوں پر بھی اسی طرح چلتی تھیں۔ آنکھیں اور کان بند کر کے۔"

"یہ جگہ بہت خوب صورت ہے۔ شاید یہ ماحول کا اثر ہے۔" اس نے تیزی سے قدم اٹھا کر اندھیرے میں ڈوبتے جنگل سے روشنیوں کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "اور ویسے میرا نام ___"

"چلیے شکر ہوا آپ کو یہ جگہ پسند آ گئی۔ ابھی آپ کا سامنا ببر شیر سے نہیں ہوا۔ جنگل میں بھی انسان اتنا نہیں کانپتا' جتنا یہ شیر ببر"

"شیر ببر وہ کون ہے؟ دانیال خان؟" اس کو شبہ سا پڑا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

"افسوس اب لڑکیاں بھی اتنی عقل مند ہو گئی ہیں کہ اشارے سے بات لے اڑتی ہیں۔"

وہ افسردہ سی کھڑی رہ گئی۔ اس کا تو خیال تھا' اس کا انٹرویو ہو گیا' نوکری پکی ہو گئی لیکن شاید نہیں ہوئی۔ اسے اس قسم کے مالک سے خوف آتا تھا جو بے سبب رعب جھاڑتے ہوں۔ رعب سہتے رہنا اس کی عادت نہیں تھی۔ اور شاید اس کے بغیر چارہ نہیں۔

"آیئے۔ میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔" وہ بچوں کی طرح جنگل کے شیر سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"شکریہ' میں خود چلی جاؤں گی۔ گھر زیادہ دور نہیں ہے۔"

"شکر ہے آپ نے یہ نہیں کہا' گھر میں ماں بہن نہیں ہے۔"

لمحہ بھر پہلے کا طاری خوف پل میں ہوا ہو گیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ بہت تیرے کی' بزدل انسان بھی کس کام کا' اور اس کو تو بزدلی زیب نہیں دیتی۔

"تو کیا ایسے ویسے تجربے بھی کرتے رہے ہیں۔"

"کیوں نہیں لیلیٰ علی' گو ہم بہت کھلنڈرے دکھائی دیتے ہیں۔"

ایک گہری سانس لے کر اس نے موٹر بائیک کو کک ماری۔

ایک ۔۔۔ دو ۔۔۔ تین

کوئی بھی کک موٹر سائیکل اسٹارٹ نہ کر سکی۔ شاید اس میں کچرا گھس گیا تھا۔ وہ بائیک گھسیٹتا اور ساتھ ساتھ بھاگتا بلند آواز میں اپنی زبان میں کسی کو کچھ ہدایات دیتا عمارت کے پیچھے غائب ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

دو تین سیڑھیاں پار کرتے ہوئے سوچا "اور یہاں گملوں کے بجائے اونچے مٹکے ہونے چاہئیں۔" اس نے کھلے دروازے کے ساتھ رکھے گملے کو دیکھ کر سوچا۔ گویا وہ اپنی ڈیوٹی پر آ چکی تھی۔ حالانکہ نہ معاہدہ طے ہوا تھا' نہ کسی قسم کی شرائط پر بحث ہوئی تھی۔ لیکن وہ خود کو خود بہ خود ملازمت میں تصور کر رہی تھی۔

رات کے کھانے کی اطلاع اس کو مبہم زبان میں ملی۔ لیکن اب وہ اس مبہم زبان کو ہاتھوں کے اشارے اور وقت کی مناسبت سے سمجھنے لگی تھی "اس وقت رات کے سات بج کر بیس منٹ پر جبکہ باورچی خانے کے نزدیک سے گزرتے اس نے چاولوں کی اشتہا آمیز خوشبو بھی سونگھ لی تھی۔ پروریشے اس کے سوا اور کیا کہہ رہی ہوگی۔

"اچھا پرورشے۔ تم چلو' میں ذرا منہ دھو کر آتی ہوں۔" اس نے اشارے سے نلکے کھولنے اور منہ پر ہاتھ رگڑنے کی ایکٹنگ کی تھی۔

وہ بشاش اجلے چہرے سے ڈائننگ ہال سے ملحقہ کھانے والے کمرے میں داخل ہوئی تو بے بے کونے والی کرسی پر اسی ادا سے سامنے والے دروازے سے داخل ہونے والوں کی منتظر تھیں۔ روشن پیشانی والا وہ شگفتہ چہرہ ان کی مدتوں کی افسردگی مٹا دیتا تھا۔ ایک عرصے بعد ایسا کوئی شخص گھر میں داخل ہوا تھا' جو ان سے مسکرا کر ملتا تھا۔ جو ان کی آنکھوں میں دیکھ کر خوش دلی سے ہنس دیتا تھا "اسے ان کی خوشنودی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جیسے وہ ان کے دکھڑے سننے ان کے گھر آ گئی تھی بس۔

"آپ ٹھیک ہیں بے بے؟"

"شکر ہے اللہ کا' تم سناؤ' کام مشکل تو نہیں لگ رہا۔"

"مشکل تو نہیں بلکہ بہت مزا آ رہا ہے۔ بہت سی ایسی چیزیں بھی ہیں جن کو میں نے کبھی شہر میں بھی استعمال نہیں کیا۔ ان کو ہاتھ لگا کر زیادہ مزا آتا ہے۔"

بے بے نے حیرت سے اس خوف ناک سچ بولنے والی لڑکی کی شکل دیکھی۔ اطمینان کے ایک گہرے سانس کے ساتھ انہوں نے ختہ خان کو روٹی لانے کا حکم دیا' ختہ خان تندور پر خود خمیری روٹی لگاتا تھا جس کی شکل لمبوترے انڈے جیسی ہوتی تھی۔ ابھی اس روٹی کا ایک لقمہ بے بے کے منہ میں گیا ہی تھا کہ وہ رک گئیں۔

"ارے تم کب آئے خان گل؟ مجھے اطلاع ہی نہیں ہوئی۔"

"اب آپ کو ہماری اطلاع کہاں ہوتی ہے؟" اس نے شکایت سے ایک کونے پر قبضہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی شکایت کا مصنوعی پن اس چھت کے نیچے کسی سے پوشیدہ نہیں تھا۔

"تم بڑا آتے ہی مجھ سے ملنے آ گئے تھے۔"

"السلام علیکم! پخیر راغلے۔" ختہ خان نے روٹی اور پلیٹیں اس کے آگے کرتے ہوئے کہا۔ کثرت استعمال سے وہ اس لفظ کا مقصد اور مفہوم سمجھنے لگی تھی۔

"خیریت سے پہنچ گئی شیریں' کوئی مسئلہ تو نہیں اٹھا۔"

بہاں کی ہوا (blog watermark)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''وہ ہوں اور مسئلے نہ انھیں، سڑک خراب تھی۔ سارے رستے ہچکولے لگتے گئے۔ سفر کی وجہ سے تھکی آتی رہی۔ سینڈوچز بدبو دے رہے تھے۔ سیدو شریف میں کھانا ان کے معیار کا نہیں تھا؟''

انہوں نے گھبرا کر بیلا کی طرف دیکھا۔ وہ ایک اجنبی لڑکی تھی اور اس کے سامنے گھر کی اندرونی کمزوری عیاں نہیں ہونی چاہیے تھیں۔ لیکن وہ ان کی گفتگو سے بے نیاز میٹھا پلاؤ جس میں بے حساب میوہ تھا بڑی دلچسپی سے کھا رہی تھی۔

بڑے بڑے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں سے اس کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور خان گل پردہ داری کے قائل نہ تھے۔

''گرلز ہاسٹل گڑھی سے بڑا دوزخ ہے۔ ہاسٹل کا باورچی خانہ خستہ خان سے ایک آدھ آگے ہی ہے۔ پشاور میں کوئی کام کی یونیک نہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ پاکستان بھی کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے۔''

''تم بہت بولتے ہو خان گل! ہاں وہ حساس ہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو محسوس کرتی ہیں لیکن تم حد سے زیادہ مبالغہ کرتے ہو۔''

خان گل نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن نا سمجھ میں آنے والی زبان کا ایک طویل سلسلہ دونوں طرف سے چل نکلا تھا' اور اس نے منہ اٹھا کر دونوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اس شیریں پلاؤ کے اجزائے ترکیبی سوچنے میں زیادہ محو تھی ظاہر ہے وہ اس زبان میں گفتگو اس سے پوشیدہ رکھنے کے لیے ہی کر رہے تھے۔ اسے کیا پڑی تھی' وہ ان کی نظروں میں دیکھ کر ان کو شرمندہ کرے۔ پلاؤ کے کنارے پر میٹھی گاجریں تھیں۔ اور چاولوں کے درمیان منقی۔ چاول کا کوئی نوالہ میٹھا لگتا تھا کوئی نمکین۔

ان کی گفتگو اب تلخ اور ترش لہجوں میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ بھری بیٹ بکی گوشت اندیلتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی گفتگو میں ناراضی کا عنصر ختم ہو کر معذرت کا انداز آ گیا۔ معذرت کے ساتھ ہی گفتگو اردو کے مرحلے میں داخل ہو گئی۔

''میری بات کا کیا برا مانانا۔ آپ کو پتا ہے میں بہت زیادہ بولتا ہوں اور زیادہ بولنا نقصان دیتا ہے۔ آپ کو یہ سواتی پلاؤ پسند آیا؟ یہ ہماری خاص ڈش ہے۔'' وہ گفتگو کے آدھے حصے سے بیلا سے مخاطب ہو گیا۔

''بہت۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''ذرا یوسف کو بولیں۔ میرا کمرہ دیکھ لے۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور مجھے صبح صبح سفر کرنا ہے۔'' اس نے بے بے کو مخاطب کیا تھا۔

''میں دیکھ لیتی ہوں۔'' بیلا نے جواب دیا تھا۔

''ارے نہیں نہ۔'' وہ شرمندہ ہو گیا۔ ''اس میں دیکھنے والی اسپیشل چیز کیا ہے؟ ایک لمبی تان کر سونا ہے۔'' وہ قہوہ پیے بغیر سونے چلا گیا۔ اس کو خفت میں مبتلا کر کے۔ اگر وہ اس کا کمرہ چیک کر ہی لیتی تو کم از کم رزق تو حلال کر لیتی۔

بے بے نے مداخلت نہیں کی۔ وہ کھانا ختم کر کے آتش دان کے پاس نچلی سیٹی پر جا بیٹھی تھیں۔ اب وہ یقیناً ''کروشیے کی زنجیر اور دائروں میں الجھ کر اسے بھول بیٹھیں گی۔ اس نے عادتاً ہی پروشہ کی برتن سمیٹنے میں مدد کی۔ ٹھوڑی پر گدے ہوئے تین نیلے نشان اس کی خوب صورتی کو تباہ کر گئے۔ ان کے گمان میں تو شاید یہ کوئی شگون ہی ہو گا۔ کسی خوش بختی کی دلیل یا نظر کا ٹوٹکا۔ وہ اس مدد کی پیشکش پر مسکرا دی۔ نظروں

میں دوستی کا جادو لہ ادھورا رہ گیا۔ بے بے نے بیلا کو آواز دے لی تھی۔

''نیند آ رہی ہے۔ نہیں تو ادھر آ کر بیٹھو۔''

وہ ان کی خواہش پر ادھر ہی چلی آئی۔ اور یوں بھی اس کو نیند کم ہی آتی تھی۔

''مہربانی۔'' وہ اس کے سیٹ سنبھالنے پر ممنون ہو گئیں۔ آتش دان میں شعلے بھڑک بھڑک کر کمرہ گرم کیے ہوئے تھے۔ گو کمرے کو اتنی گرمی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ لیکن بے بے عمر کی مجبوری میں ٹھٹھرتی رہتی تھیں۔

''ایک وقت تھا جب کھانے کے لیے بلایا جاتا تو یہ کمرہ لوگوں سے بھر جاتا تھا۔'' وہ دکھی سی لگ رہی تھیں۔ ''آج کھانے پر بیٹھتی ہوں تو دیر تک دروازہ دیکھتی رہتی ہوں۔ لگتا ہے ابھی کوئی آئے گا ابھی کوئی آئے گا۔ بعض اوقات تو کوئی بھی نہیں ہوتا سوائے میرے۔ جب میں بنوں سے آئی تو خان گل گھٹنوں کے بل چلتا تھا۔ میں نے خود ہی سر چڑھا رکھا ہے' تب ہی تو اتنی باتیں کرتا ہے اور میں سن بھی لیتی ہوں۔ اور یوں بھی اس کو اپنی حق تلفی کا ہر وقت احساس رہتا ہے۔ دانیال خان کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتے۔ بس گل خان ہی ان پر بھروسہ نہیں کرتے۔ ان کے گمان میں دانیال خان ظالم ہیں۔ حالانکہ وہ ظالم نہیں بس ذرا لیے دیے رہتے ہیں۔ لیکن ان کو ایک ایک کی فکر ہے۔ ایک ایک کا دھیان ہے۔ اتنی دور بیٹھ کر بھی وہ ہم سے غافل نہیں۔ خان گل کے ذہن میں تو بس ایک ہی بات بیٹھ گئی ہے۔''

پتا نہیں وہ خود سے مخاطب تھیں یا اس سے۔ اس کو بھی اظہار رائے کا حق ہے یا وہ خاموش نمائندہ ہے۔ اس نے بڑے دھیان سے ان کی آنکھوں میں چمکتے پانی کی طرف دیکھا۔

''دانیال پہلے شخص ہیں جنھوں نے یہ جا گیر چھوڑ دی۔ خان جی جو دانیال کے والد تھے' وہ تو پیدا یہیں پر ہوئے۔ یہیں مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ آخری کئی سال ان کو خونی پیچش رہی۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئے۔ بے ہوشی کی حالت میں ان کو ریڈنگ لے گئے۔ ہوش و حواس میں وہ یہ علاقہ کبھی نہ چھوڑتے۔ جتنا ان کو اس جگہ سے پیار تھا۔ اور یوں دیکھا جائے تو دانیال بس آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ لیکن اس علاقے سے جتنی محبت ان کو ہے' کس کو ہو سکتی ہے۔ خان گل تو ابھی کھلنڈرے ہیں۔ ان کا بچپن نہیں گیا ابھی۔ آہستہ آہستہ ان کی شکایتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔''

وہ دل گرفتہ سی بیٹھی اپنے دکھ رول رہی تھیں۔ کتنی دیر انہوں نے آتش دان میں دہکتے شعلوں پر نظریں گاڑے رکھیں۔ جیسے وہاں شعلوں کی اسکرین پر ماضی کی چلتی ساری فلم دیکھ رہی ہوں۔

''دانیال بھی کیا کریں۔ سختی نہ کریں تو اتنی بڑی جاگیر کیسے سنبھالیں۔ ہم پٹھانوں کی طبیعت عجیب طرح کی ہوتی ہے۔ ہم محبت کی بو پا لیتے ہیں۔ لیکن ہم تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد جنگ نہ کریں' گولیاں نہ چلائیں' خون نہ بہائیں تو ہم سست سے پڑنے لگتے ہیں۔ ہم میں اور باقی قوموں میں بہت فرق ہے۔ ہم اسلحہ کو زیور کی طرح بدن پر سجائے پھرتے ہیں۔ ہم لوگوں پر جان دیتے ہیں۔ اتنی محبت کرتے ہیں کہ اپنا خون بہا دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہماری حمیت پر ذرا سی ضرب پڑے تو قتل کرنے میں ہم ایک لمحہ کا بھی تامل نہ کریں۔'' یہ ایک خفیہ پزل تھا۔ وہ اسے ڈی کوڈ نہیں کر سکتی تھی اور سوالات کی بھرمار کر کے وہ کمینے پن کا مظاہرہ بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''ان کو خان گل سے کوئی بغض نہیں۔ وہ تو شیریں کا بھی برابر خیال رکھتے ہیں۔ اور میں کیا کہوں' میری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تنہائی کا توان کو اتنا احساس ہے کہ انہوں نے یہ نوکری دراصل میرے لیے ہی نکلوائی تھی۔ ان کو خوف تھا' تنہائی مجھے پاگل کر دے گی۔ حالانکہ اتنے پیار کرنے والوں کے بیچ میں تنہائی کا کیا تصور۔ اسی لیے تو میں نے انٹرویو کیا تمہارا۔ میں نے ہی تمہیں پسند کیا۔ ورنہ کاہے کی نوکری' کون سی ذمہ داری؟"

انہوں نے ایک دم زبان دانتوں کے بیچ بھینچ لی۔ وہ کس کو کہہ رہی تھیں اور کیا؟ روانی میں ان کو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔

وہ بے ساختہ ہنس دی۔ اور کتنی دیر ہنستی رہی۔ اس کے ہنسنے سے ان کا خوف بھی زائل ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے کی تشویش ایک دم رفع ہو گئی۔ وہ جھینپ کر مسکراتی رہیں۔

"مجھے اصل میں گل خان نے پریشان کر دیا تھا۔ اور میں نے محسوس کر دیا۔ پتا نہیں کیوں دانیال کی مخالفت مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ وہ پہلے ہی اتنے پریشان ہیں۔ ہمیں چاہیے ان کی پریشانی دور کریں' نہ کہ ان کے لیے مسائل کھڑے کر دیں۔ ان کے دماغ پر بہت بوجھ ہے۔ ان سے ایک بہت قیمتی چیز کھو گئی ہے۔ وہ دراصل ایک لڑکی ہے۔" انہوں نے جیسے ایک دم انکشاف کیا۔ "کسی غلط فہمی پر انہوں نے اسے گنوا دیا ہے۔ اور دن رات اس کی تلاش میں سرگرداں اپنے آپ سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔"

وہ خاموشی سے ان کی شکل دیکھتی رہی۔ وہ دانیال کو سرٹیفکیٹ پر سرٹیفکیٹ دیے جاتی ہیں۔ ان کے پاس ان کی ہر غلطی کا واضح سبب ہے' معافی ہے' تلافی ہے۔ غلطی صرف دوسروں کی ہے اور اس کا کوئی توڑ بھی نہیں۔

اس نے اپنے بستر پر لیٹ کر کتنی دیر ہر موضوع پر تفصیل سے سوچا تھا' بے بے' دانیال خان' شیریں' خان گل یہ گھر عجیب و غریب کرداروں سے بھرا پڑا ہے۔ چند کرداروں سے پردہ اٹھ چکا ہے۔ کچھ سے اٹھنا باقی ہے۔

بے اختیار چند لمحوں میں جب انہوں نے اپنے اوپر سے اختیار کھو دیا تو انہوں نے اسے بے ساختگی میں بتا دیا تھا' اس گھر کو کسی منتظم کی ضرورت نہیں۔ وہ دراصل اسپرو کی گولی کے طور پر لائی گئی ہے۔ اور اس بات کا اسے کوئی قلق بھی نہیں۔ ہم زندگی میں شاذ ہی کسی کا درد دور کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

یہ رات بہت مختلف رات تھی۔ باہر برف کے اولے عمارت پر چھن چھن برس رہے تھے اور اس نے ایک عورت کو بچوں کی طرح روتے بسورتے دیکھا تھا۔ شاید اسی لیے اس کا سکون عنقا ہو گیا۔ بے بے میں اور اس میں کم از کم ایک بات تو مشترک نکلی۔ وہ دونوں اس گھر میں پناہ کی تلاش میں آئی تھیں۔ مسلسل اولوں کی تواتر سے پڑتی آواز اسے خوف زدہ کرتی رہی۔ اس نے یونہی ریڈیو کی سوئی لگائی۔ کبھی پشتو اور کبھی اردو گیت سنتی وہ سو ہی گئی۔

رات اس پر انکشاف ہوا تھا اور صبح اس کو گھر کی ترتیب کا باقی ماندہ کام نمٹانا تھا۔ اب معلوم نہیں اس کو کام کاج کی طرف توجہ کرنی چاہیے یا فرائض کی ادائیگی کے لیے بے بے کے سامنے جا بیٹھے جن کے سامنے اس کا مرتبہ ایک فادر کا سا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے گناہوں کوتاہیوں اور غلطیوں کا اعتراف کرتی رہیں۔

لیکن صبح ہی صبح بے بے نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔ "وہاں اسٹور میں کچھ کام کی چیزیں پڑی ہیں۔ دیکھو' باہر نکالنا چاہو' نکال لو۔ جو تبدیل کرنا چاہو' تبدیل کر دو۔" انہوں نے گچھے میں سے چن کر ایک پرانی سی چابی

نکالی اور اس کے حوالے کر دی۔

"پری کو لے لو۔ یوسف کو بلا لینا۔ مل کر نمٹا لو۔"

اسٹور بھی نئے نئے انکشافات میں سے ایک تھا۔

اس نے دروازہ کھولا اور ایلس کی طرح ایک ونڈر لینڈ میں پہنچ گئی۔

وہاں قیمتی آرائشی چیزیں' کرسٹل' قالین' ڈیکوریشن جیسی چیزیں تو تھیں ہی لیکن جس حساب سے وہاں سنگتراش کے مجسمے رکھے تھے' اس نے اسے دنگ کر دیا۔ شاف میں' الماریوں میں' ڈھکی ہوئی میزوں پر۔ وہ کون لوگ تھے جن کے یہ مجسمے بنائے گئے۔ اور یہ سنگتراش کون ہو گا۔ اس کو مصوری سے اتنی رغبت بھی نہیں تھی کہ وہ پہچان سکتی کہ یہ کسی ایک مصور کے بنائے ہوئے شہ پارے ہیں یا مختلف لوگوں کے۔ پری اور یوسف خان سے اس قسم کے سوالات وقت کا زیاں ہی تھے۔ اور وہ مشہور و معروف منظر جس میں کوئی خون خوار چیتا' ہرن کی کمر کے گوشت میں دانت گاڑے اس کا لہو پی رہا تھا' یہ مجسمہ ابھی ادھورا تھا' جیسے مصور یہ منظر مکمل کرنے سے پہلے رہا ہی نہیں۔ یا اس منظر کا خاتمہ اس سے برداشت نہیں ہوا۔

ایک اور بڑی میز پر حنوط شدہ جانور پڑے تھے۔ خوفناک چمکتے دانتوں والے سیاہ چیتے کا سر' بھیڑیے کا حنوط شدہ بچہ' عقاب' ہرن' بارہ سنگھا ہے۔

یوسف خان اس کی ہدایت کے مطابق چند چیزیں باہر نکال لایا تھا' چند اس نے باہر سے اندر ڈال دیں۔ وہ جو چیز جہاں لگواتی اور رکھواتی رہی' یوسف خان اور پری ویسا ہی کرتے رہے۔ گھر کی نئی شکل نکلی تو اس کو بڑی خوش گوار فرحت کا احساس ہوا۔ اپنے ہاتھ سے رکھی چیز جیسے اپنے گھر کا حصہ لگتی ہے۔

اور گویا اس نے آہستہ آہستہ اس گھر پر اپنا حق بھی تسلیم کر لیا تھا' اور یہ بڑی مسرت کی بات تھی' وہ سابقہ گھر سے صرف اپنے ذہنی ہی نہیں' روحانی روابط بھی منقطع کرنا چاہتی تھی۔

"یہ مجسمے کس کے بنائے ہوئے ہیں؟" اس نے کھانے کی میز پر بڑی بے دھیانی میں سالن کا ڈونگا اٹھاتے ہوئے پوچھا تھا۔ بے بے کے ہاتھ میں تندور کی خمیری روٹی لرز گئی۔ ان کی رنگت زرد ہوئی۔ پھر انہوں نے سب پر آہستہ آہستہ قابو پا لیا۔

"خدا کی پناہ۔" انہوں نے خود سے پشتو میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے یہ کہنا بھول گئی تھی بیٹا۔ ان مجسموں کو دانیال پسند نہیں کرتے۔ اگر تمہیں ناگوار نہ گزرے تو ان کو باہر نہ نکالنا۔"

"اچھا جی۔" اس نے تابعداری سے کہا "میں نے ایک دو نکلوائے تھے۔ واپس رکھوا دوں گی۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر مجسمے ان کو پسند نہیں تو انہوں نے اسٹور میں جمع کر کے کیوں رکھے ہوئے ہیں؟ وہ تو بہت قیمتی ہیں اور..."

"ہاں بیٹا...!" انہوں نے جلدی سے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ "خان گل سے میں نے کہا ہے۔ وہ تمہیں یہ علاقہ دکھا دیں گے۔ تم گڑھی کی سیر کرو تو حیران رہ جاؤ گی۔ اس سے خوب صورت علاقہ روئے زمین پر کوئی نہ ہو گا۔"

بے بے نے بات بدلی تھی لیکن شاید وہ اتنی زمانہ ساز عورت نہ تھیں کہ مہارت سے پلٹ سکتیں۔ اسی لیے ان کی کمزوری صاف پکڑی گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اچھا۔ کیوں نہ میں خود گھوم لوں۔ تنہا؟"

"بھول کر بھی ایسا غضب نہ کرنا۔" وہ ہنس پڑیں۔ "یہ شہر نہیں جنگل ہے۔ یہاں ایسے ایسے خوفناک درندے پھرتے ہیں۔ قیمت خان اور خان جی ایک زمانے میں شکار کے شوقین تھے۔ اپنے دانیال کو اس حساب میں بزدل ہی سمجھو۔ وہ تو خرگوش کو مارتے کانپ جاتے ہیں۔" وہ تصور ہی تصور میں کچھ دیکھ کر ہنسی تھیں۔ خوش دلی سے کھل کر۔

"یہ قیمت خان کون ہے؟"

"قیمت خان؟ تم قیمت خان کو نہیں جانتیں؟ وہ رکھوالا ہے اس علاقے کا ٹرینر ہے، چیتے سدھاتا ہے۔"

"چیتے؟" وہ ہکا بکا رہ گئی۔ "لیکن یہاں چیتے کیوں سدھائے جاتے ہیں؟"

انہوں نے اس کی حیرت اور خوف پر مطلق توجہ نہیں دی۔

"یہ ہم جاگیرداروں کا ایک انداز ہے۔ کون کتنا طاقت ور ہے، اس کا اندازہ صرف زمین کی لمبائی چوڑائی سے ہی نہیں ہوتا۔ ہمارا اسلحہ، گھوڑے، چیتے، ملازمین۔ ایسی ایسی ہزاروں چھوٹی چیزیں ہیں جو ہمارے وقار میں اضافے کا باعث ہوتی ہیں۔"

آہ! تف ہے بیلا جی تم پر کہ تم بھی محض ان لوگوں کے وقار میں اضافے کا ایک ادنیٰ سا مہرہ ہو۔ اس کی بھوک اچانک ختم ہو گئی۔ یہ جاگیرداری کیسی قابل نفرت چیز ہے جس میں مقابلہ کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

"ہم چیتوں کو چوبیس گھنٹوں میں صرف علی الصبح خوراک دیتے ہیں۔ وہ جو چوکیداری کے چیتے ہیں رات بھر وہ بھوک سے اتنے بیتاب ہوتے ہیں کہ کسی کو بھی کھا سکتے ہیں۔ ہم لوگ خود کسی کو رات کو اس بستی میں آنے نہیں دیتے۔ پھر صبح ان کو گوشت ڈال کر بند کر دیا جاتا ہے۔ چیتا ایسا خونخوار درندہ ہے کہ خونخوار سے خونخوار جانور کو مات کرے۔ لیکن قیمت خان کے قدموں میں ایسے تھوتھنی رگڑتا ہے جیسے پالتو کتا۔"

ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک سرد لہر نے گزر کر اس کے سارے وجود کو منجمد کر دیا تھا۔ "یہ کیسے لوگ ہیں، کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ جو اپنی جان کی حفاظت کے لیے دشمن تو کیا کسی بھولے بھٹکے مسافر کا خون بہانے سے دریغ نہیں کرتے۔" خون میں لتھڑے کٹے ہوئے انسانی اعضا اس کو خواب میں آ آ کر ڈراتے رہے۔

ساری رات اس نے خواب میں دیکھا، وہ راستہ بھول کر گڑھی کی اونچی نیچی وادیوں میں بھٹک رہی ہے۔ چاروں طرف خونخوار درندے اپنی بھیانک آوازوں میں اس کو ڈرا رہے ہیں۔ ساری رات وہ خوف زدہ رہی۔ اور صبح کی سیر کے لیے وہ اصطبل کی طرف نکل گئی۔ گو صبح کے لیے اصطبل ایک ناموزوں جگہ تھی۔ وہ عمارت سے بہت دور تھی اور تعفن کے اعتبار سے بھی صبح کا وقت مناسب نہیں تھا، لیکن اس نے جوگرز کے شال کندھوں پر ڈالی اور خراماں خراماں گھوڑوں کی طرف جانے والے راستے پر چل نکلی۔ پتھر کی سڑک سے بنایا ہوا یہ گھوڑوں کا ٹریک تھا۔ رات بھر میں جو بدمزگی اس پر طاری رہی تھی، اسے گھوڑے جیسا مخلص اور معصوم جانور ہی دھو سکتا تھا۔

وہ جب تک اصطبل پر پہنچی، سورج ذرا سا اوپر آ گیا تھا۔ اس کی مری مری نارنجی شعاعیں جو دن کے بارہ بجے بھی تیز نہیں ہوتی تھیں۔ وہ خوش گوار سی خنک سی صبح کا لطف لیتی، گھوڑوں کا جائزہ لینے لگی۔ وہ خوب پلے ہوئے چمکتے گھوڑے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کا رنگ مشکی تھا۔ ان سب کے آگے سیمنٹ کے بنے ناندوں میں سوکھے چنوں اور گھاس کا ڈھیر تھا، کچھ ادھ پکے مکئی کے بھٹوں کی فصل کٹی رکھی تھی۔ اس نے گھوڑے کے سامنے سے ایک پیلا مکئی کا بھٹا ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ بے ساختہ اس کا جی چاہا، اسے کوئلوں پر سرخ کر کے چبا جائے۔ لیکن یہ اس کی قسمت میں نہیں گھوڑے کے مقدر میں تھا۔ اس نے اچھی طرح بھٹوں کا جائزہ لے کر گھوڑے کی خوراک اس کو واپس کر دی۔

وہ جب سے اصطبل میں داخل ہوئی تھی، وہاں موجود ملازمین ایک قطار میں مودب کھڑے ہو کر اس کے کسی اگلے حکم کے منتظر تھے۔

"یہ جو چھلیاں اُدھر آپ لوگ کھاتے ہیں نا، یہ اِدھر ہم گھوڑوں کو کھلاتے ہیں۔" وہ شخص دائیں طرف سے نمودار ہوا تھا اور اسے اس کو پہچاننے میں کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ وہ تند مزاج شخص تھا جو اخروٹوں کے باغ سے اس کو درشتگی سے دھکیل کر باہر لے آیا تھا۔

اس کے مزاج میں جاگیردارانہ غرور تھا، وہ اردو بول سکتا تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر اس کے ساتھ اردو نہیں بولی۔ وہ اس دن بھی اس کو اپنی زبان میں نیچا دکھا رہا تھا۔ وہ آج بھی اس سے مالکانہ غرور سے مخاطب تھا۔

اس کو اس کے انداز میں گستاخی کی بو سونگھائی دی۔ وہ اس کو خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ غالباً "اسے اس کو یوں بے مہار پھرنا پسند نہ ہو۔" وہ تو کم از کم یہی اندازہ لگا پائی تھی۔

"اندازاً" کتنے گھوڑے ہوں گے تمہارے پاس؟" وہ اس کے سامنے جم کر اس کی آنکھوں میں سنجیدگی سے دیکھ کر بولی تھی۔ شاید اس کا گمان تھا، وہ اس کو خوف زدہ کر کے بھگا دے گا۔

وہ لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا گیا۔ اس کا جنگلی پن ہوا ہو گیا۔

"آں۔ آں۔" اس نے چاروں طرف گھوڑوں کو دیکھا جیسے گنتی کر رہا ہو۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے نخوت سے پوچھا۔ حالانکہ یہ کمینگی اسے اچھی نہیں لگی۔ لیکن یہ ایک جنگل تھا جہاں وہی زندہ رہ سکتا ہے جو طاقتور ہو۔

اب اس کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی تھی کہ جب تک آپ روم میں ہیں، وہ کریں جو رومی کرتے ہیں۔

"قیمت خان۔" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اب کے سانپ اس کو سونگھ گیا تھا۔

"اوہ۔ تو تم چیتے سدھاتے ہو۔ ٹرینر ہو۔"

"جی ہاں۔"

وہ خاموشی سے جس طرف سے آیا تھا اس طرف چلا گیا۔ وہ سمجھ گئی۔ وہ اس کے مزید سوالوں سے بچ رہا تھا۔

وہ باہر کی لڑکی تھی اور اندرونی باتیں کرتی تھی۔

لیکن وہ اتنا بیوقوف نہیں تھا کہ سوالوں میں گھر کر کھل جائے۔

وہ کتنی دیر اصطبل دیکھتی رہی۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا قیمت خان بالکل ہی چلا نہیں گیا۔ وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جہاں جاتی، جدھر گھومتی، جس طرف سے مڑتی، دو خاموش آنکھیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ معلوم نہیں وہ اسے کیا سمجھ کر شک کر رہا تھا، بے بے نے بتایا تھا، جتنا بڑا قبیلہ ہو، اتنی بڑی بڑی دشمنیاں ہوتی ہیں۔ ایک قتل کا بدلہ دو قتلوں سے اور دو کا بدلہ چار قتلوں سے لیا جاتا ہے۔ کہ وہ اس پر اپنے سدھائے ہوئے پالتو چیتے چھوڑ دے اور جان بہرکیف اسے گھوڑوں سے زیادہ عزیز تھی۔
لہٰذا یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ سیر کے لیے موت کے منہ میں جائے۔
وہ اخروٹوں کا جھنڈ ہو، گھوڑوں کا اصطبل ہو یا کچھ بھی اور۔
اس کی کھڑکی کے نیچے سے نظر آنے والے خوب صورت مناظر بھی بہت پرکشش ہیں۔ اور اس گھر کے کھیت سے باہر بھی ایک دنیا ہے۔ جہاں پہ دو قیود کا خطرہ بھی نہیں۔
لہٰذا اگلی شام اس نے وادی کی نذر کی۔

☼ ☼ ☼

اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وادی قدرتی پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پرپیچ پہاڑی راستوں اور حد نگاہ تک نظر آنے والے پہاڑوں نے اس کا ضبط لوٹ لیا۔ کتنی شدت سے اس کا جی چاہا، وہ گھر کے کھیت سے دور وادی کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑتی جائے دوڑتی جائے۔
اور واقعی وہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی دوڑ رہی تھی۔ ایک وقت تھا جب اقبال پارک میں وہ اور کوثی جوگنگ کی راہداریوں پر دوڑتی تھیں۔ وہ قدرتی ایتھلیٹ سی تھیں۔ بیٹھ کر کھیلنے والے اور دماغ لڑا کر چلنے والی چالوں سے ان کو بھاگتے دوڑتے گیمز زیادہ اچھے لگتے تھے۔ بیڈمنٹن ہلکے موڈ میں، ٹینس کیلوریز جلانے کے لیے اور ہر شام جوگنگ کی نذر۔ حالانکہ وہ فٹ تھیں۔ لیکن موٹے لوگوں کے سارے عذاب ان کو پسند تھے۔ ہاں سوائے خوراک کے۔ اس نے دوڑتے دوڑتے مسکراتے سوچا۔ کوثی کھانے پر آتی تو رکتی نہیں تھی۔ پکوڑے، سموسے، کباب، ہر چٹپٹی چیز کے لیے وہ ترستی تھی ہاں اگر خیالوں میں دوڑتا اس کا بے لگام گھوڑا ٹھٹک کر رک گیا۔
بائیں طرف سبز پہاڑیوں کا طویل سلسلہ تھا اور دائیں طرف ڈھلوان میں لپٹی سرسبز پھولوں سے ڈھکی وادی میں اس نے کچھ عجیب سا دیکھا تھا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی عجیب و غریب چیزیں دیکھ رہی تھی۔ عجیب و غریب تجربے کر رہی تھی۔
اس نے بھلا یہاں، وادی میں یہ سرخ سی عجیب سی کیا چیز دیکھی تھی۔
اس نے جھک کر دیکھا۔ یہ عجیب الخلقت جیپ تھی۔ جس کے دو پہیے ہوا میں معلق تھے اور دو وادی کی زمین کے سہارے بس کرنے کو تھے۔
وہ کسی میکانکی جذبے کے تحت ہلکے ہلکے قدموں سے وادی میں اترتی اس جیپ کے قریب آ گئی۔
"اوہ۔" وہ اپنی بے وقوفی پر شرمندہ ہو گئی۔ یہ کوئی عام سی جیپ تھی جو تیز رفتاری کے باعث کھڈ میں لڑھک گئی تھی۔ ایسی خبریں اخبار میں بہت آتی تھیں۔
وہ اندر ہی اندر لرزنے لگی۔ معلوم نہیں یہ جیپ کون چلا رہا تھا اور ڈرائیور کے سوا اس میں اور کتنی سواریاں ہوں گی۔ پتا نہیں وہ بچے بھی یا ختم ہو گئے۔
پہلا خیال اس کے دماغ میں یہی آیا کہ وہ یہاں سے بھاگتی جائے، کسی کو بلا لائے۔ بجلی کی طرح لپکا اور

کوندے کی طرح وہ دوڑ پڑی۔ سڑک پر آنے سے پہلے اسے کسی کی گھٹی ہوئی کراہ سنائی دی۔ وہ سہم کر رک گئی۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے دوڑ رہی تھی۔ اگر ایک گھنٹہ اور دوڑتی تو وہ گھر تک پہنچ سکے گی۔ اور اس بات کا کوئی یقین نہیں کہ زخمی اس وقت تک بچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ کراہنے کی آواز جیپ کے نچلے پہیوں کے پاس سے دوبارہ آئی۔
وہ اتنے مضبوط اعصاب کی لڑکی نہیں تھی لیکن وقت اسے ہمیشہ کڑے کڑے امتحانوں کے سامنے لا ڈالتا تھا۔
سڑک سے نیچے وادی کا راستہ ہموار تھا لیکن بہت زیادہ ڈھلوانی تھا۔
وہ بچ بچ کر، سنبھل سنبھل کر اترتی دوبارہ جیپ کے پاس آ گئی۔
"کون ہے؟" اس نے بلند آواز میں پکارا۔
"کون؟" سوال کے جواب میں سوال۔
اچانک اس کی نگاہ اٹھی۔ جیپ کے پچھلے پہیے کے مڈگارڈ کے پاس سفید کپڑوں میں ملبوس کوئی اوندھے منہ گرا ہوا تھا، وہ تھوڑی دیر کے لیے پوری جان سے لرز گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، شاید لمحوں کا مہمان تھا، جیپ ایسی حالت میں ترچھی پڑی تھی کہ کسی بھی وقت کھڈ میں گر سکتی تھی اور جیپ کھڈ میں لڑھک گئی تو اس آدمی کو یقینی طور پر ساتھ گھسیٹ لے جائے گی۔ زخمی شاید مکمل طور پر ہوش میں تھا۔ وہ مسلسل پہیے میں سے اپنی ٹانگ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا، ایسی پریشانی کے عالم میں بھی وہ اس کے نروز پر رشک کیے بغیر نہ رہ سکی۔
وہ تیزی سے اس کے جھکے ہوئے اوندھے منہ کے پاس دوزانو ہو گئی۔
"میں گڑھی سے کسی کو بلا لاؤں؟"
اس نے اپنا سبزے پر گرا سر اٹھا کر آنے والے کی طرف امید سے دیکھا۔ اور ناامیدی سے پھر گرا لیا۔ عورت نے اسے مایوس کر دیا تھا۔ اس وقت اسے کسی طاقتور اور ذہین فوری فیصلہ کرنے والے، توانا مرد کی ضرورت تھی۔ وہ کسی عورت کی ہسٹیریک چیخوں اور رحم، ہمدردی کے الفاظ وصول کر کے کرتا بھی کیا۔
"ہوں۔" حیرت میں ڈوبے الفاظ نے اس کا ڈوبتا سر پھر اٹھا دیا۔
"میں بھاگ کر کسی کو لے آتی ہوں۔"
"بے کار ہے۔" اس نے مخاطب کی طرف سر اٹھا کر پہچاننے کی پوری کوشش لیکن وہ ناکام ہی رہا۔
"پھر میں کیا کروں؟" اس نے بے بسی سے خود سے سوال کیا تھا لیکن جواب اس نے دیا تھا۔
"آپ پہیے میں سے میرا پاؤں نکالنے کی کوشش کریں۔ میرا مطلب۔" اس نے غور سے اس کی آنکھوں میں اتر کے ارادے کو جا پہنچا۔ "اگر آپ نکال سکیں۔"
اس نے آہستگی سے پاؤں کھینچا۔ پھر زور لگایا۔ جیپ درخت سے بالکل پک کر گر جانے والے پھل کی طرح لرز رہی تھی۔ لیکن اس کے پاؤں سے ایک سینٹی میٹر کی گنجائش نہ نکل سکی۔ چمڑے کے موٹے موٹے فل بوٹ کسے ہوئے تسموں سے اس کے پاؤں میں پھنس رہے تھے۔ اس نے بڑے سکون سے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پاؤں نکالنے کی جدوجہد ختم نہیں کی۔ اس جدوجہد میں اس کے اپنے گھٹنے چھل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گئے۔ کہنیوں پر خراشیں آ گئیں۔ لیکن پتا نہیں اس کا پاؤں کدھر پھنسا تھا کہ ہل بھی نہیں رہا تھا۔

مایوس تو وہ کبھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی زندگی ایک جوئے کی نذر تھی۔ پیچھے سے پاؤں گھسیٹ کر گاڑی میں فریکچر کروا لے یا جیپ کے ساتھ نیچے سینکڑوں فٹ گہری کھائیوں میں گھسٹتا چلا جائے۔

اچانک ہی تیر کی طرح اس کے دماغ میں خیال آیا۔

اس نے فل بوٹس کے تسمے کھول کر اور کھینچ کھینچ کر ڈھیلے کر دیے۔ اس کام کے لیے اسے تقریباً گاڑی کے نیچے گلیسرز کی طرح لیٹ جانا پڑا۔ موبل آئل اور گریس نے اس کی صورت کا تماشا بنا دیا۔

لیکن ہاہ، یہ کیسی حیرت انگیز بات تھی کہ اس کا پاؤں سہولت سے باہر آ گیا۔

اس نے درد سے بھیگی ہوئی ایک کروٹ لی اور سیدھا ہو بیٹھا۔ اس کی سفید پتلون دھول مٹی میں خاک ہو رہی تھی۔ درد کی شدت سے وہ اپنے سفید پڑتے ہونٹوں کو دانتوں سے بار بار دبا رہا تھا' اس نے اپنے زخمی پاؤں کی طرف جھکنے کی دو تین مرتبہ کوشش کی لیکن درد سے نڈھال ہو کر چھوڑ دی۔ اس کے پاؤں میں شاید موچ آ گئی تھی یا کوئی زخم آیا تھا یا معلوم نہیں اس نے جنگلیوں کی طرح گھسیٹ گھسیٹ کر اس کے پاؤں میں موچ ڈال دی تھی۔

"ذرا آپ تکلیف کر کے یہ جراب اتار دیں گی؟" اس کی ساری توجہ اپنی زخمی ٹانگ کی طرف تھی۔

اس نے آہستہ آہستہ کر کے اس کی جراب کھینچی۔ جراب کھینچنے کا یہ مرحلہ بھی بہت وقت سے اور بہت اذیت سے مکمل ہوا' اس کے پاؤں کا رنگ سرخ ہو رہا تھا اور بیلا کو لگا آہستہ آہستہ سوجن بڑھ رہی ہے۔

اس نے سیدھا ہو کر پریشانی سے پاؤں کی طرف دیکھا۔ "میرا اندازہ صحیح تھا۔"

معلوم نہیں اس نے کیا اندازہ لگایا تھا۔ بیلا کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ کچھ پوچھ سکے۔ وہ سکون سے گھاس اور پتھروں کے بیچ لیٹا جیسے تخت شاہی سے قسمتوں کے فیصلے کر رہا تھا۔

"کیا کہا تھا آپ نے گڑھی جانے کے لیے؟" اس تمام عرصے میں اس نے پہلی مرتبہ اس پر نگاہ کی۔

"معلوم ہے آپ کو گڑھی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"معلوم ہے۔ میں وہاں رہتی ہوں۔"

"آپ وہاں رہتی ہیں۔" اس نے اوپر سے نیچے تک اس کے حلیے کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں کس حیثیت سے رہتی ہو گی سوچا لیا' یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

"آپ گھٹنا سیدھا کر کے دیکھیں کہیں فریکچر نہ ہو۔"

"آپ علاوہ جادوگر کے حکیم بھی ہیں؟ اگر فریکچر ہوا تو...؟" اس نے گہری سنجیدگی سے سامنے اوندھی ترچھی پڑی جیپ کی طرف دیکھتے کہا۔

"کیا آپ اب جائیں گی گڑھی تک دوڑتی ہوئی اسی اسپیڈ سے جس سے آپ اس وقت دوڑتی آ رہی تھیں؟"

"لیکن سر یہاں تھوڑی دیر تک چیتے آ جائیں گے میں یہاں آپ کو اکیلا چھوڑ کر...."

"چیتے؟ کون سے چیتے؟" اس نے انتہائی حیرت سے اس بے وقوف لڑکی کی طرف دیکھا جس نے ابھی ابھی ایک عقل مندی کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

"وقت اتنا زیادہ نہیں ہے۔" اس نے اسی سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا۔ "میں یہاں شیر اور چیتوں کو

سنبھالتا ہوں۔ آپ گڑھی سے کسی سواری کو لائیں۔"

اس کا چہرہ بتا رہا تھا' اس کی تکلیف میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اور وہ اس اضافے میں کسی بھی کمی کا باعث نہیں بن سک رہی تھی۔

"اگر کسی طرح آپ جیپ کو سیدھی کر لیں تو...؟" وہ رائے دے کر بجل سی ہو گئی۔ اسے معلوم تھا وہ جب سے اس سے زخمی حالت میں ملی تھی' اس کا مسخرہ بنا رہا تھا۔

"آپ جیپ چلائیں گی؟ آپ نے پہلے چلائی ہے کبھی؟"

"پہلے تو کبھی نہیں چلائی۔" اس نے صداقت سے بتایا۔

"تو؟ یہ پیل سے نہیں چلتی۔"

ڈوبتے سورج کا عکس اس کے بالوں سے لپٹ کر اس کے چہرے کو سرخ کر رہا تھا۔ درختوں کی چوٹیوں سے مرجھائی ہوئی دھوپ اب بالکل ہی ختم تھی۔ معلوم نہیں یہ شخص چیتوں کے سلسلے میں اتنا انجان کیوں بن رہا تھا' وہ خاموشی سے اس ڈھلوانی راستے سے چلتی واپس اوپر سڑک پر آ گئی۔ یہ باس کا حکم تھا' ورنہ وہ لمحہ بھر کے لیے بھی کسی انسانی جان کو چیتوں کا لقمہ بننے کے لیے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ قلعے جیسی دیوار اتنی دور تھی کہ یہاں سے اس کا نشان بھی دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر نیچے کھائی میں پڑے شخص کی طرف دیکھا۔ اس کی ٹانگ میں سخت تکلیف تھی۔ درد کی شدت سے وہ بار بار دوہرا ہو رہا تھا اور سیدھا ہو رہا تھا۔ جانے کہاں سے اس کے دماغ میں ساتویں جماعت کی جنرل سائنس نے ہلہ بول دیا۔

وہ تیزی سے واپس آ گئی۔

تیز تیز قدم اٹھاتی کھائی سے اترتی وہ سیدھی جیپ کی طرف گئی۔

وہ اس کی واپسی کے انتظار میں چت لیٹا بتدریج پھیلتے اندھیرے کو آسمان سے اترتا دیکھ رہا تھا' اس ضدی سی لڑکی کی ضد نے اسے جھنجلا دیا' وہ ہی واحد ذریعہ تھی جس کو وہ کام میں لا سکتا تھا' اور وہ بار بار جاتی تھی' بار بار آ جاتی تھی۔ اس پر اس کا کوئی بس بھی نہیں تھا۔ وہ جیپ کے پاس کسی چیز کو تلاش کرتی پھر رہی تھی؟ اس بڑے سے پتھر کو وہ گھسیٹ کر کیا کرے گی؟ وہ یہ بڑا سا لکڑی کا ٹکڑا نشیب سے کیوں اٹھا کر لائی ہے؟

اس کے خیال میں عورتیں احمق ہوتی ہیں۔ کم از کم اس کی زندگی میں ایسی ہی عورتیں آئی تھیں جو آنکھ کان' ناک اور جسم سجانے کے سوا کسی چیز کو جانتی نہیں جو کم عقل' کج فہم' ضدی اور کج بحثی ہوتی ہیں۔

یہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔

لیکن وہ زخمی پاؤں کے باوجود بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔

گرنے کو تیار جیپ اچانک سیدھی ہو گئی تھی۔ اس نے لیور کا سادہ سا استعمال کیا تھا۔ پتا نہیں جیپ ایسی حالت میں تھی کہ اچانک سیدھی ہو گئی۔ یا لیور ہی ٹھیک لگا تھا' خفت سے یا تجربے کی کامیابی سے وہ خود سرخ ہو رہی تھی۔

لیکن تجربے کی یہ کامیابی اسے بھلا کیا اجر دے گی؟

وہ دوبارہ مایوسی سے زخمی پیر کو دیکھنے لگا' دھوپ پہاڑ کی چوٹیوں سے بھی غائب ہو گئی تھی۔ ذرا سی دیر میں یہ کھائی ایک مہیب اور خوف ناک غار بن جائے گی۔ دور جنگل میں واویلوں سے پرے گیدڑوں کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چلانے کی صاف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گو وہ یہ ہرگز نہیں جانتی تھی کہ علاوہ چیتوں کے گیدڑ بھی کسی موقع پر خونخوار ہو جاتے ہیں۔

"سر! آپ کوشش کیجیے کسی طرح سیٹ تک آ جائیے۔" وہ آسمان کی طرف مسلسل دیکھتا غیبی امداد کی تلاش میں لگتا تھا۔

"سر!"

اس کے دوبارہ اصرار پر ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈال کر اس نے سیدھی کھڑی جیپ کو دیکھا۔

"اچھا فرض کیا بیٹھ گیا پھر؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ وہ گڑھی عیسیٰ خان کا مالک تھا اور غالباً "ہر وقت حکم دیتے رہنے کی وجہ سے سمجھانے کی عادت نہیں رہی تھی۔

اس خاموشی سے وہ اس کی شکل دیکھتی جھنجلا گئی۔

"اور آپ کو اٹھانے کے لیے کرین تو آنے کی نہیں۔" اس نے لیور کا ڈنڈا غصے میں اٹھایا اور گھسیٹتی ہوئی اس کے پاس لے آئی۔ "اب آپ اس کی مدد سے اٹھنے کی کوشش کیجیے۔"

"اچھا افسر۔" اس نے سنجیدگی سے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

"میں نے سوچا۔ پتا نہیں آپ کے کیا ارادے ہیں؟"

(ان کا چہرہ ہمیشہ دو قسم کے تاثر دیتا ہے۔ ان کی آنکھیں مسکراتی ہیں مگر چہرہ ظلم کی حد تک سنگین اور سنجیدہ)

"معاف کیجیے گا۔" اس نے ایک ہاتھ سے لاٹھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے کندھے کا سہارا لیا۔ وہ اذیت میں مبتلا چہرہ جو سہارے کی تلاش میں اس کے بالکل نزدیک تھا کہیں سے اڑتا ہوا بے بے کا فقرہ اس کے کانوں میں گونجا۔

پاؤں پر ہلکا سا زور ڈال کر اٹھانے میں بھی اس کا چہرہ نیلا ہو گیا تھا۔

"آپ پاؤں اٹھائیے اور میرے کندھے کے سہارے چلیے۔"

شاید تکلیف کی شدت کی وجہ سے اس نے اس کے لہجے کے تحکم کا برا نہیں مانا۔ اور اس کو اس کے سہارے چلنا بھی کتنا تھا۔

دو قدم یا تین قدم۔

اور ان قدموں سے اس نے دنیا کے گرد جانے کتنے چکر لگا لیے تھے۔

کبھی کبھی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ جاتا۔ کبھی تیز ہواؤں کے جھکڑ سے اڑتے اس کے منتشر بال۔ وہ بہت وزنی تھا یا مجبوراً "ہی اس نے اپنا سارا بوجھ اس پر لاد دیا تھا" وہ سیٹ پر بیٹھا تو اس کا کندھا وزن سے ٹوٹتا لگ رہا تھا۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور اپنی اذیت کی شدت کو دباتا پسینے پسینے ہو گیا تھا۔

"نہ میں کلچ دبا سکتا ہوں نہ ایکسیلیٹر۔ صرف بریک سے گزارا چل جائے گا؟"

"میں کوشش کروں گی۔" اس نے خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ گاڑی الٹ جانے کے باوجود چابی اگنیشن میں اٹکی تھی۔ کلچ اور بریک سنبھال کر اس نے سنجیدگی سے شیشے سے پار اس طرف دیکھا۔

"ہرگز نہیں۔" اس نے اس کے اسٹیرنگ گھماتے دونوں ہاتھ روک دیے۔ "میں اپنی جان بچانے کے لیے آپ کی جان سے نہیں کھیل سکتا۔"

وہ لمحہ بھر کو رک سی گئی۔ وہ مذاق نہیں اڑا رہا تھا۔ تمسخر نہیں بنا رہا تھا۔ حکم نہیں چلا رہا تھا۔ لیکن اس معمولی سے فقرے میں ایک اجنبی لڑکی کے لیے جو اتھاہ ہمدردی اور احساس تھا اس کی آنکھیں تر کر دیں۔

"میں گاڑی چلا لیتی ہوں۔" اس کے مضبوط ہاتھوں کے نیچے ابھی تک وہ ہاتھ اس طرح دبے تھے۔ جنہوں نے اس کی جان بچائی تھی۔ وہ شاید احسان فراموش بھی نہیں تھا۔

"بے شک چلا لیتی ہوں گی۔ کھائی سے سڑک تک آنا مذاق نہیں۔"

"اس کے سوا ہمارے پاس چوائس بھی تو نہیں۔ اگر ہم رات بھر یہیں پڑے رہے تو شاید جنگلی جانوروں کا لقمہ بن جائیں۔ یا سردی سے ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔ تو کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟"

اس نے گردن گھما کر غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اندھیری رات میں اس ہمدرد سی لڑکی کا گریس اور مٹی میں لتھڑا چہرہ ٹھیک سے نظر بھی تو نہیں آ رہا تھا۔

"بالکل نہیں۔" اس نے قطعیت سے بغیر ہاتھ اٹھائے کہا۔ "اور میں آپ کو پہلے بھی اجازت دے چکا ہوں۔ آپ دوڑ سکتی ہیں بھاگ کر گھر پہنچ جائیے۔"

"اور آپ نہیں جانتے کہ میں اس طرح بالکل نہیں جاؤں گی۔ اور رات زیادہ ہو گئی تو میں کھائی سے سڑک پر بھی نہیں آ سکوں گی۔ پلیز آپ میرا۔"

وہ اپنے ارادے میں غیر متزلزل تھی۔ اس نے خاموشی سے اپنے ہاتھ علیحدہ کر لیے۔ بائیں طرف گہری کھائی تھی۔ ذرا سا سلپ ہو جانے کا مطلب سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں تنکے کی طرح لڑھکتے چلے جانا تھا اور دائیں طرف وہ سڑک تھی جو جانے پناہ کی طرف جاتی تھی۔

وہ سیٹ پر ایسے مضبوطی سے جم کر بیٹھی جیسے ساری عمر جی ٹی روڈ پر ٹرک چلاتی آئی ہو۔ ہاتھ اسٹیرنگ پر جما کر اس نے کن انکھیوں سے زخمی کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھ ہٹا لیے تھے لیکن غالباً "اس کو اس گریس اور مٹی میں لتھڑی لڑکی پر ذرا بھی بھروسہ نہ تھا کہ وہ گاڑی کو ایک انچ ہلانے پر بھی قادر ہو گی۔ لیکن اس کے دیکھتے دیکھتے جیپ نے ترچھے ہو کر دائیں طرف کا موڑ لیا۔ اور آہستہ آہستہ نشیبی راستے سے اوپر آنے لگی۔ کبھی وہ حیرت سے اس کے مشاق ہاتھوں کو دیکھتا تھا کبھی سڑک کی طرف۔

لمحہ بھر کے لیے اس کو لگا جیپ سلپ ہوئی ہے لیکن وہ ایک بڑے سے پتھر سے رگڑ کھا کر سڑک پر آ گئی۔ ایک دبا دبا سا گہرا سانس بیلا نے کھینچا۔ سامنے ہی کولتار کی چمکتی ہوئی سڑک تھی۔ اس نے اپنے ارادوں کو آج ہی کتنے مقام پر کامیاب ہوتے دیکھا۔ وہ اس ناہموار سی سرمئی سڑک پر فوروہیل ڈرائیو بھگائے لیے جا رہی تھی جیسے ایرپورٹ روڈ پر وہ پرانے ماڈل کی فوکسی لے کر دوڑتی تھی۔ فرق صرف اس قدر تھا یہاں اس کی ہمراہی میں اس کا باپ نہیں ایک اجنبی شخص تھا لیکن وہ تو ویسی ہی تھی۔ شاداں فرحاں خوش باش و آزاد۔

"دوبارہ زندگی مل جانے پر دنیا کیسی لگتی ہے؟" اس نے گردن گھما کر شیشے سے باہر کی طرف دیکھا۔

زندگی تو دوبارہ اس کو بھی ملی تھی جو بڑی محویت سے گردن ذرا سی اٹھائے سڑک پر پیچھے چھوڑی کھائی دیکھ رہی تھی لیکن زندگی دوبارہ پانے کے تصور سے سرشار نہیں بے نیاز تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نے ابھی تک دانیال کے زخم نہیں دیکھے تھے۔ بلکہ اس کا موقع بھی نہیں ملا۔ اس کی اب پہلی کوشش تو یہی تھی کہ کسی طرح اس کو "فوراً" سے پیشتر اس کے گھر تک پہنچا دے۔ حالانکہ "اصولاً" اس کو دوسری طرف ہسپتال کا رخ کرنا چاہیے تھا' لیکن اس کا خیال بھی اس کو آدھا راستہ عبور کرنے کے بعد آیا' اور شاید گڑھی میں کوئی نہ کوئی ڈاکٹر موجود ہی ہو۔ اس نے سوچا بھی کہ اس سلسلے میں اس سے کوئی سوال کرے یا اس کی رائے معلوم کرے۔ لیکن سڑک پر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اور جا بجا بل کھاتے موڑوں پر بھاگتی جیپ سے سر اٹھا کر وہ کوئی رسک لینے پر آمادہ نہ ہوئی۔ راستے نا واقف تھے۔ وہ ہلکی اسپیڈ میں تیز روشنی چھوڑتے بڑے محتاط قدم اٹھا رہی تھی۔ اس لیے اس نے ساتھ بیٹھے شخص کی طرف ایک لحہ کو بھی نہ دیکھا۔ جیسے وہاں کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں گڑھی کا پتھر رکھا ہو۔

اور معجزہ ہی تھا کہ وہ رات کے بہت زیادہ تاریک ہونے سے پہلے بلند فصیلوں والے پھاٹک سے اندر داخل ہو گئی۔ گیٹ پر متعین گارڈ نے کندھے پر لگی بندوقیں نیچے کر کے پھاٹک پاٹوں پاٹ کھول دیا۔ وہ جیپ کو پہچانتا تھا' مالک کو بھی۔ گارڈ نے بندوق کے بٹ پر تھپ سے ہاتھ مار کر غالباً "سلوٹ کیا۔ انگریز یہاں تک آیا تو نہیں لیکن اپنے اثرات کہاں کہاں چھوڑ کر نہیں گیا۔

"وعلیکم السلام!" دانیال نے سر کے اشارے سے اس کا سلام قبول کیا۔

جیپ کے اندر داخل ہوتے ہی قلعے نما فصیلوں والا دروازہ پیچھے سے بند ہو گیا۔ اوپر چوکی پر کھڑے سپاہیوں نے بندوقیں نیچے کر لیں۔

گویا جیپ زمانہ جنگ سے زمانہ امن میں داخل ہو گئی تھی۔

خوبانیوں اور باداموں کے طویل باغ کے گھماؤ سے موڑ کھا کر جیپ پھولوں کی بیلوں سے لپٹے ستونوں والے پورچ میں آ کر رک گئی۔

اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی' ایکسیلیٹر سے پاؤں اٹھایا۔ جیپ کی آواز سن کر چہار طرف سے لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ قاعدے کے مطابق اس وقت ملازمین رات کے کھانے میں مصروف ہوتے تھے لیکن شاید انہوں نے مالک کی جیپ کی آواز پہچان لی تھی۔ کسی نے پیچھے سے جیپ میں پڑے چپ دیکھے' کسی نے تازہ کیچڑ کے نشان' لوگوں نے دور سے سونگھ کر ہی خطرہ بھانپ لیا تھا۔ وہ اجنبی آوازیں خطرے سے دوسروں کو آگاہ کرتے جیپ کی طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔

اس نے جیپ سے نیچے چھلانگ لگائی۔ مدد کے لیے دوڑ کر آنے والے لوگوں سے پہلے اس نے انٹرینس کی دو تین سیڑھیاں عبور کیں اور کھلے مرکزی دروازے سے جھپاک سے اندر ہو گئی۔ طویل راہداری میں اس نے بے بے کو حواس باختہ ننگے پاؤں باہر کی طرف دوڑتے دیکھا۔ غالباً" کسی نے اس حادثے کی خبر ان تک بھی پہنچا دی تھی۔ وہ اتنی بوکھلائی ہوئی تھیں کہ ان کی نظر شکستہ شکستہ مرے مرے قدم اٹھاتی مٹی میں بھری بیٹا پر بھی نہیں پڑی۔ جو کیچڑ بھرے قدموں سے راہداری کا قیمتی قالین تباہ کر رہی تھی' اس کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں تھا' اس لیے دوڑنے والے لوگوں کے بیچ میں سے دوڑتی وہ بھی اپنے کمرے تک چلی گئی۔

وہ بہت تھک گئی تھی۔ زندگی اور موت کے درمیان ایسی رسہ کشی نے اس کو سہا دیا تھا' وہ جیسے تیسے گاڑی گھسیٹ کر یہاں تک تو لے آئی تھی لیکن یہاں اترنے کے بعد اس کو اندازہ ہوا' وہ بھی اتنے مضبوط

اعصاب کی مالک نہیں تھی۔ وہ بھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

وہ فوری طور پر سو جانے کی شاید خواہش لے کر بستر پر گری۔ لیکن کتنی دیر آنکھیں پھاڑے چھت کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ جب بھی آنکھیں میچ کر سونے کی کوشش کرتی آہستہ آہستہ نشیب کی طرف لڑھکتی جیپ اور جیپ کے پہیے میں پھنسا دانیال خان کا پاؤں اسے ڈرا دیتا۔ وہ خوف زدہ ہو کر آنکھیں کھول دیتی۔

یہ ایک دفعہ گزرنے والا عمل اس پر سے بار بار گزر رہا تھا۔ اس نے اپنے جوگرز کھول کر وارڈ روب کے نچلے خانے میں ڈالے۔ موزے لانڈری کی باسکٹ میں پھینکے' ماحول گرم ہو گیا تھا یا اسے آج زیادہ ہی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ خرگوش ایسے نرم گرم کمبل میں اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ جانے کہاں سے اتنی بہت ساری سوئیاں سی جسم میں چبھی جا رہی تھیں۔ اور باوجود کمرے کا دروازہ بند کر لینے کے باہر کا شور و غل وہ یہاں تک صاف محسوس کر رہی تھی۔

باہر ایمرجنسی تھی۔ ہر شخص جاگ رہا تھا۔ اور کتنی مرتبہ اس نے بند دروازوں کے باہر قالینوں پر ابھرتے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ کتنی مرتبہ اسے لوگوں کی بلند سرگوشیاں سنائی دیں۔ معلوم نہیں دانیال خان کتنے زخمی ہوئے تھے۔ فرسٹ ایڈ مل گئی۔ گڑھی میں کوئی ڈاکٹر موجود بھی تھا؟ بہت دفعہ اس کا جی چاہا ان سوالوں کے جواب کے لیے وہ اٹھ کر باہر جائے لیکن پھر اسے مناسب نہیں لگا۔ ان کا مالک زخمی ہو کر گھر آیا تھا۔ وہ سب اپنی محبتوں کا اظہار اپنے اپنے انداز میں تشویش سے کر رہے تھے۔ وہ کس ناتے ان کے درمیان جائے' ان کی بابت سوال کرے؟ ان پر تو اس کا نہ کوئی حق تھا نہ رشتہ۔

رات میں پتا نہیں کس وقت وہ سوئی۔ اور اتنا سوئی کہ دن چڑھے تک سوتی رہی۔ حالانکہ اتنی بے نیاز وہ کبھی نہیں رہی تھی کہ دروازے کا بولٹ چڑھائے بغیر سو جائے۔ وہ جاگی تو اس کی کھڑکی پر روزانہ دستک دینے والی بڑھتی چڑیا جیسے اس سے مایوس سی ہو گئی تھی۔ سورج چڑھ آیا تھا اور مریم اس کے سر پر کھڑی ایک تواتر سے اسے جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو مریم باوجود حد آداب کے منہ چھپا کر ہنس پڑی۔

یقینی طور پر اس کو بے بے بلا رہی تھیں۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا' دن چڑھ آیا تھا۔ یقیناً" اگر سورج نکلتا تو کمرہ دھوپ سے بھر جاتا۔

"تم چلو' میں آ رہی ہوں۔"

وہ مشکل سے آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھی۔ مریم جا چکی تھی لیکن اس کا جسم اس طرح ٹوٹ رہا تھا کہ اس سے ہلا بھی نہیں جا سکا۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر شیشے میں جھانکا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا' یہ رات بھر میں اس کے چہرے پر کالے پیلے دھبے کہاں سے آ گئے ہیں۔ اوہ۔ جیسے پس منظر کی فلم کی طرح رات کا ڈراؤنا خواب اسے پھر ڈرانے لگا۔ اس نے سستی سے چپل پاؤں میں ڈالے غسل خانے میں گھستی وہ بیسن کے سامنے کھڑی ہوئی تو اپنی ہیئت کذائی اسے خود بھی ہنسا گئی۔ کتنی مرتبہ صابن رگڑا تو وہ گریس کے دھبے چھڑا سکی۔ اور کتنی دیر گرم پانی کی پھوار میں بیٹھ کر وہ اس قابل ہو سکی کہ لوگوں کے سامنے جا سکے۔

اس نے دروازے کھول کر باہر جھانکا۔ رات والا ہنگامہ اب ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اچانک سر پر افتاد آ پڑنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے جیسے لوگ پہلے تو بوکھلا ہی جاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ جیسے وہ معمولات کی طرف پلٹ گئے۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کھانے والے کمرے میں پہنچی۔ ناشتے پر خلاف معمول لیٹ ہو گئی تھی۔ بڑی روانی اور تیزی میں اس نے اندر قدم رکھا لیکن وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔ اس نے بڑے افسوس سے سوچا غالباً ناشتا سرو کیا جا چکا تھا۔ اب وہ خستہ خان یا پروشہ کے ساتھ کیا مغز پچی کرے۔ اور انھیں کیونکر سمجھایا جائے کہ اسے ناشتا چاہیے۔ اس نے ناشتے کا ارادہ منسوخ کر کے بے بے کے کمرے کی راہ لی۔ اور اس قسم کے حالات میں انسان کسی قسم کی بھی بد انتظامی کی توقع کر سکتا ہے۔ یہ تو ایک معمولی بات تھی۔

وہ بے بے کے کمرے میں پہنچی تو جھجک سی گئی۔ ٹرالی پر چائے سجائے اس کے انتظار میں بیٹھی بیٹھی وہ جیسے سو گئی تھیں۔ شاید وہ بھی ساری رات جاگی ہوں۔ اسے اپنے آپ پر ندامت محسوس ہوئی ' اس نے پریشانی میں ان سب سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

"السلام علیکم۔ سوری ' رات میں دیر سے سوئی تو۔۔۔"

"میں تو الٹا تم سے معذرت کرنے لگی تھی۔" بے بے نے شگفتگی سے ٹرالی اس کی طرف دھکیل دی۔ "ہم لوگ رات کو پریشان ہو گئے تھے کہ کھانے والے کمرے میں اکٹھے نہیں ہوئے۔ اور تم نے بھی اتنا تکلف کیا کہ بھوکی سو گئیں۔ اب میں صبح سے بیٹھی خود کو کوس رہی تھی۔"

وہ دل کھول کر ہنس دی۔ واقعی اس نے رات تو کھانا ہی نہیں کھایا۔ اور کھانے کی کمی کا احساس تو اسے رات میں ہوا نہ صبح کو۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اتفاق سے رات مجھے بھوک نہیں تھی۔ ورنہ کھانا میں خود بھی نکال کر کھا سکتی تھی۔" وہ بڑے سلیقے سے ان کا فرائی انڈا ان کی پلیٹ میں انڈیلتی ہوئی بولی۔ "آپ کے سلائس پر کچھ لگاؤں؟"

"نہیں۔" وہ اپنے دھیان میں غرق بہت دیر منتظر رہیں۔ ان کا خیال تھا وہ ان کی پریشانی دریافت کرے گی۔ لیکن اس نے شاید ان کے اچٹتے سے فقرے سے کوئی معنی نکالے ہی نہیں۔

"رات بھر ہم بہت پریشان رہے۔" انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔

"دراصل رات دانیال آئے تو ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ان کی ٹانگ زخمی ہو گئی۔ قیمت خان اور خان گل اسی وقت سیدو شریف جانا چاہتے تھے۔ لیکن دانیال نے ہی منع کر دیا۔ یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ اتنی دور سے ڈاکٹر بلایا جاتا۔ رات ہو جاتی اور باہر دشمن ہر وقت موقع کی تاک میں رہتا ہے۔ یہاں تو لوگ برے سے برے وقت میں بھی دشمنی نکالنے سے باز نہیں رہتے۔"

اس کے چہرے پر ایک ہلکا سا گھبراہٹ کا رنگ آیا۔ پھر وہ اپنی خفت چھپانے کے لیے پیالی پر جھک گئی۔

"سب لوگ کوشش کرتے رہے کہ وہ پلستر بندھوا لیں۔ لیکن وہ کسی طور آمادہ نہیں ہوئے۔ گرم روئی باندھنے سے بھی بہت آرام ملتا ہے۔ لیکن دانیال چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ہم سب کو ان کی حکم عدولی کی عادت نہیں۔"

"تو ڈاکٹر کا کیا ہوا؟" اس نے بے ساختگی میں پیالی پرچ میں واپس رکھ دی۔

"یہاں پر ہمارا ایک گڑھی کا اپنا ڈاکٹر ہے۔ گو وہ زیادہ قابل نہیں ' لیکن وقت طور پر گزارا ہے ' اس نے پاؤں باندھ دیا۔ پھر صبح کی نماز کے بعد خان گل وغیرہ سیدو شریف ڈاکٹر کو لینے چلے گئے۔ وہ ان کا دوست بھی ہے۔ اگر اس دوران میرے کہنے سے دانیال پلستر بندھوا لیتے۔"

بے بے کی اذیت بھری بے چینی نے اس کو محرومی کے شدید احساس سے دوچار کر دیا۔ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں ایسے لوگ ' جن کو بے بہا محبت ملتی ہے۔ اور وہ محبت کے لیے سرگرداں نہیں نارمل ہوتے ہیں بہت مطمئن اور پر سکون۔

بے بے ناشتا کرتے کرتے اپنے خیالوں میں ڈوب گئیں۔ انہوں نے با آواز بلند سب کو حکم سنا دیا تھا کہ دانیال خان اس وقت سو رہے ہوں گے۔ گھر میں کسی قسم کا شور نہ ہوا اور سرجن کے آنے سے پہلے کوئی ان کے کمرے میں قدم نہ رکھے۔

وہ خاموشی سے قد آدم آتش دان پر سجی شیشے کی ننھی منی چیزوں کو ایک ترتیب سے جمانے لگی۔ بے بے پریشان تھیں۔ اس لیے خاموش ہو گئیں۔ بیلا کو علم تھا آج لمبی چوڑی گپ شپ کا کوئی پروگرام نہیں۔ پری بھی فارغ تھی۔ وہ بے کار وقت میں کمروں کے کام پر لگ گئی۔ وہ جس کمرے میں کام کر رہی ہوتی ' بے بے اس کے آس پاس کروشیا سنبھال کر آ جاتیں۔ کبھی وہ بے ساختگی میں کروشیا ہاتھ سے گرا کر اس تیزی میں اٹھ کر دوڑتیں جیسے کسی نے انہیں پکارا ہو۔

پھر وہ اسی اطمینان سے واپس آتیں جیسے انہیں کبھی کسی نے نہیں پکارا۔

اس کو بے بے کا یہ بے چینی سے اٹھ اٹھ کر دوڑنا پریشان کر رہا تھا ' یہ ان کی عمر کا تقاضا بھی نہیں تھا۔ لیکن اسے کیا حق تھا ' وہ محبت کرنے والوں کے بیچ میں ناصح بن کر کیا آ سکتی تھی۔

گیارہ بجے کے قریب پورچ میں پھر شور برپا ہوا ' بہت سی گاڑیاں رکیں ' بہت سے قدم دوڑے۔ جن میں بے بے ' پرورشہ ' پری ' مریم سب ہی شامل تھے۔ وہ لکڑی کا حبشی آدمی کا روغنی مجسمہ ہاتھ میں پکڑے حیران ' پریشان کھڑی تھی کہ دنیا پھر خالی ہو گئی۔ وہ بڑے اہتمام سے لکڑی کا مجسمہ وارنش سے چمکا رہی تھی کہ کسی نے دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔

"السلام علیکم۔ بے بے کہاں چلی گئی ہیں؟"

"پتا نہیں۔" اس نے آنے والے کو لہجے اور انداز سے پہچانا تھا۔

"آپ بے کار ہی اس گھر پر اپنا دماغ خرچ کر رہی ہیں؟" وہ مسکراتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔

"کیوں؟" اس کے دماغ نے پریشانی میں بہت دور تک جالا بن لیا۔

"دانیال خان ٹھیک تو ہیں۔"

"ٹھیک؟" وہ جاتا جاتا ایڑیوں پر پلٹا۔ "ٹھیک ٹھاک ہٹے کٹے۔ ان کو کیا ہوا بھلا۔ پیر میں معمولی سی موچ ہی تو آئی ہے۔ وہ تو بھاگتے دوڑتے کسی نیچے کے بھی آ جاتی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے وہ دو تین دن میں پھر سے بھاگنے دوڑنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

"اونہہ۔" اس کو خان گل کی لاپروائی پر حیرت سی ہوئی۔ سارا گھر ہراساں ہو تو خان گل کا ضبط کمال کا ہوتا ہے۔ گویا وہ بھی دانیال خان سے اپنی دشمنی میں انسانیت فراموش کر دیتا ہے۔

"ہٹے کٹے ہیں تو اتنی دور سے سرجن کو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟"

اس کے لہجے کی تلخی کو اس نے ذرا حیران ہو کر سہا۔ چند لمحوں کے لیے اس نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"سرجن کو بلانے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ وہ ان کے عزیز دوست ہیں۔ اب ان کو چند دن کے لیے ہلنا جلنا منع ہے۔ تو سرجن نثار انھیں کمپنی دینے گڑھی آئے ہیں اور آپ کا خیال ہے کہ وہ ان کی ٹانگ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کاٹنے آ گئے ہیں؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ اس کو کیا پڑی تھی؟ ان کے گھر کے اندرونی معاملوں میں دخل دیتی۔

"ضرور یہ کہانی کا ڈرامائی حصہ آپ کو بے بے نے سنایا ہے۔ رائی کا پہاڑ بنانے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ اور اب عین ڈرامے کے ڈراپ سین پر وہ پتا نہیں کہاں غائب ہو گئیں۔"

وہ جواب کے لیے اس کا منتظر تھا۔

"معلوم نہیں۔ باہر کی طرف گئی تھیں۔"

"اور آپ کو پتھر کا بنا گئیں۔" وہ جاتے جاتے پھر رک گیا۔ "ایک زحمت دینی تھی۔ بے بے پتا نہیں کہاں ہوں گی۔"

"کیا بات ہے؟" اس نے اپنی مخصوص نرم روی سے پوچھا۔

"سرجن نثار علی اور میں، دونوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا پیا۔ حتیٰ کہ چائے کی ایک پیالی بھی نہیں پی۔ میں تو جیسے تیسے بھوک برداشت کر لیتا ہوں لیکن سرجن نثار دوست ہیں دانیال خان کے۔ اور مزاج میں عین مین انہی پر گئے ہیں۔"

"میں بھجواتی ہوں ناشتا۔" وہ ہنس دی اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اسے دونوں ہی کے مزاجوں سے آگاہی نہیں تھی۔

"بہت بہت شکریہ۔ میں بہت زیادہ بے جا مخل تو نہیں ہو رہا؟"

"نہیں۔ کیونکہ مجھے کرنا ہی کیا ہے۔ جو آپ نے کہا پری سے کہہ دوں گی۔ پری، خستہ خان سے کہہ دے گی۔ اور بس۔"

"ڈگڈ۔" وہ گھوم کر پلٹ گیا۔

کتنی دیر وہ پری کی آمد کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن آخر وہ کتنی دیر بیٹھ کر انتظار کر سکتی تھی۔ اس گھر میں جانے کون سا ایسا خفیہ راستہ تھا کہ سب کسی دم اس راستے سے غائب ہو جاتے۔ وہ راہداریوں میں ڈھونڈتی پھرتی، پر کہیں نہ ملتے۔

وہ آہستگی سے چلتی اندرونی گیلری کی طرف آئی۔ وہاں زندگی کے کچھ آثار تھے۔ کوئی شخص گرم پانی کی بوتل لے کر دوڑ رہا تھا، کسی نے ابلتا پانی تھام رکھا تھا۔ اور کسی نے روئی کا بنڈل، جیسے اندر کوئی آپریشن تھیٹر قائم ہو۔

وہ ان دوڑتے بھاگتے لوگوں میں پری کو کھوجنے لگی۔ اگر وہ پیغام کسی اور کے ذریعے بھیجتی تو امکان تھا زبان کی تبدیلی کی وجہ سے پیغام ہی بدل جائے۔ سرجن نثار نے کیا تشخیص کیا تھا۔

وہ باہر کھڑی تو یہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ کون زیادہ صاحب رائے ہے، بے بے یا خان گل؟

جو اندر جا جا کر باہر آ رہے تھے، وہ اپنی زبان میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ کر دائیں سے بائیں دوڑ جاتے۔ کتنی دیر کوریڈور میں کھڑی مالک کے کمروں کی طرف لوگوں کی روانی دیکھتی رہی۔ یہاں آ کر بے بے باہر نکلیں تو اسے ضرور تفصیل سے آگاہ کریں گی۔ لیکن وہ تو کہیں دور کھو ہی گئی تھیں۔ کتنی دفعہ اس نے سوچا۔ تام چینی کی سلفچی اٹھائے آنے والے شخص سے کچھ پوچھے۔ اتنے وہ ارادے بناتی، ہمتیں باندھتی آنے والا شخص کوئی دوسری چیز اٹھا کر غائب ہو جاتا۔

کتنی دیر سے وہ اس ظالم چہرے والے مجسمے کے ساتھ مجسمہ بنی کھڑی رہی۔ لیکن اس طرح تو بات نہیں بنے گی۔ خان گل اور سرجن رات سے بھوکے ہیں اور ان میں برداشت بھی نہیں ہے۔ اس کو بہر کیف ناشتا منزل تک پہنچانا ہے۔

اخلاقاً اسے خود ہی باورچی خانے کا رخ کرنا پڑا۔ گو وہ اچھی طرح پہچانتی بھی نہیں تھی کہ باورچی خانہ کہاں ہو گا؟ اسے اب تک باورچی خانے سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ پتا نہیں اس کا باورچی خانے میں داخلہ کس گنتی شمار میں آئے۔ وہ اندازے سے چلتی کھانے والے کمروں کی سیدھ میں گئی۔ وہاں سے ڈھونڈ کر پینٹری میں پہنچی اور پینٹری میں موجود کسی شخص کی مدد سے وہ باورچی خانے میں چلی ہی گئی۔

خستہ خان تشویش اور پریشانی کے عالم میں چوکی پر بیٹھے گھٹنوں میں سر دیے غالباً مالک کی صحت کی طرف سے فکر مند تھے۔ اس کو یوں بے محابا باورچی خانے میں گھستا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

"ناشتا تیار کرنا ہے۔ وہ جو ڈاکٹر صاحب آئے ہیں نا، ان کے لیے۔"

خستہ خان نے ساری بات توجہ سے سنی۔ خاک سمجھ کر سر بھی ہلا دیا۔ لیکن ایک لفظ سمجھے بغیر اسی طرح اسے ٹکر ٹکر دیکھے گئے۔ چند منٹ اس نے خستہ خان کے ارادوں کا انتظار کیا، پھر بے جھجک اس نے کیبنٹ کھول کر برتن اکٹھے کیے۔ اسٹور کے فریج میں گھس کر وہ تھوڑی دیر کے لیے رک گئی۔

وہ۔ وہ ناشتا تو تیار کر سکتی تھی، جو وہ خود کھاتی ہے۔ لیکن ویسا ناشتا شاید ایک مدت تک نہ بنا پاتی جو سرجن نثار پسند کریں۔ اس نے پہلے منجمد اور سوکھے گوشت کے پیکٹ اٹھائے، پھر واپس رکھ دیے۔ وہ کبھی نیشن سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہی آملیٹ ڈبل روٹی والا ناشتا اچھا ہے۔ سادہ بھی اور ناقابل اعتراض بھی۔ وہ پیازوں میں مصروف ہوئی تو خستہ خان چونکے۔ وہ اپنی جناتی زبان میں اسے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ ایک لفظ سمجھنے کی اہل نہیں تھی۔

"مہمان۔ مہمان۔" انہوں نے کچھ کہا تھا۔

"ہاں۔ ہاں مہمان کے لیے ہی ناشتا تیار کر رہی ہوں۔"

وہ اسی طرح خفا رہے۔ اور یہ اس کو بڑی مشکل سے سمجھ میں آیا کہ ان کو مہمان کا کام میں جتا رہنا پسند نہیں۔ مہمان کا مطلب یہ کہ ہر آدمی کو اپنے مقام پر ہونا چاہیے۔ اس نے ناشتے کی ٹرے سجا دی تھی۔ وہ ہنستی مسکراتی باہر نکل آئی۔ خستہ خان، حدادب میں لپٹے بڑبڑاتے اسے روک بھی نہ سکے۔

ناشتا تیار تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ٹرے اٹھائی بڑی تیزی سے وہ واپسی کے راستے پر چلتی پینٹری، ہال اور راہداریوں سے گزرتے وہ لمبی گیلری کے سامنے آ کر رک گئی۔ وہاں سے دائیں طرف راستہ دانیال خان کے کمروں کی طرف جاتا تھا۔

وہ ٹرے ہاتھ میں پکڑے رک گئی۔ وہ یوں بے دھڑک ان کے کمروں کی طرف تو نہیں جا سکتی تھی۔ وہاں کوئی آتا جاتا نظر آئے تو؟

اور یہ قسمت ہی تھی کہ خان گل نے اس کا سارا مسئلہ حل کر دیا۔

خان گل نے اسے یوں بہت بے شرماتے جھجکتے ٹرے ہاتھ میں لیے کھڑے دیکھا تھا۔ وقت ہمیں حماقتوں کے جال میں جکڑتا رہتا ہے۔ خوش فہمیاں بھی دراصل باریک ریشم کے لچھے ہیں جن میں الجھ کر پھنس کر انسان تنگ ہوتا جاتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خان گل اپنی ذات کے طلسم میں گرفتار کھڑے تو بے خوش گمانیوں کی یلغار میں ڈوب گئے۔

"شکریہ بہت شکریہ، بہت بہت۔" اتنی عنایتوں کے سامنے الفاظ کے چمکتے دمکتے ذخیرے بھی خیرہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے ٹرے اس کے ہاتھ سے تھام کر بھی کتنی دیر نظریں اس کے شفاف ہاتھوں پر لگائے رکھیں۔

اس نے بڑے مان سے حکم دیا تھا۔ بڑے چاؤ سے فرمائش کی تھی۔

لیکن اس کے ناواقف سرد مہر رویے نے اس کے سارے جذبوں پر اوس ڈال دی تھی۔ "آپ نے تکلیف کی آپ کو زحمت ہوئی۔" اس نے کئی فقرے ترتیب دینے کی کوشش کی۔ وہ فقرے تو اس کے ماتھے سے ٹپ ٹپ ٹپک رہے تھے۔

بیلا شگفتہ دلی سے مسکرا دی۔

"اب معلوم نہیں آپ کے سرجن کس قسم کا ناشتا کرتے ہیں۔ مجھے تو جو سمجھ میں آیا بنا دیا۔"

"ہمارے سرجن تو آپ ہی کے علاقے کے آدمی ہیں۔" اس نے پلیٹ اٹھا کر آملیٹ کے سنہری پن سے لطف لیا۔

"اور میرے لیے بہترین ناشتا وہ ہے جو آپ نے تیار کیا۔"

وہ بے ساختگی میں زور سے ہنس دی۔ "چلو اتنی محنت اکارت نہیں گئی۔"

وہ ٹرے خود اٹھا کر دانیال خان کے کمروں کی طرف نکل گیا۔

گھر میں اچانک خاموشی چھا گئی تھی۔ غالباً "مرحوم بچی" کا افراتفری کا مرحلہ بخیر و خوبی حل ہو گیا تھا۔ اچانک ہی کسی کونے سے بے بے بھی نمودار ہو گئی تھیں۔ تھکی تھکی پژمردہ سی چال۔ اس کے نزدیک آ کر انہوں نے غیر شعوری طور پر اس کا سہارا لے لیا۔

"ایک تو دانیال خان کی یہ بات بہت بری ہے۔ کسی کا احسان نہیں لیتے۔ بس زیر بار نہیں ہونا چاہتے۔" وہ اس کے کندھوں پر اپنے ہلکے وجود کے ساتھ کچھ دیر رکیں پھر سیدھی ہو گئیں۔

"شکر خدا کا تکلیف زیادہ نہیں ہوئی۔ کوئی ہڈی وڈی نہیں ٹوٹی۔ موچ آئی ہے چند روز میں چلنے پھرنے لگیں گے۔" وہ اس کا سہارا چھوڑ کر خان گل کی تلاش میں نکل گئیں۔

"دیکھو خان گل۔ کہیں سے کالے بکرے کا بندوبست۔" وہ ان پر پیچ راستوں میں کہیں بکھر گئیں۔

☆ ☆ ☆

وہ خاموشی سے اپنی پسندیدہ اسپاٹ پر آ بیٹھی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کا یہ کونا اس کی ایک جنت تھا جہاں سے دنیا اس کے قدموں میں بکھری رنگ برنگی نظر آتی تھی۔ خوبانیوں اور اخروٹوں کے گھنے جنگلوں اور سانپوں کے ننھے ننھے پھولوں سے ڈھکا یہ مہکتا ہوا قدرتی نظارہ کل اس عمارت میں الگ خوفناک باب رقم ہوتے ہوتے رہ گیا ورنہ حالت مختلف بھی ہو سکتے تھے۔ اسے یہ جگہ چھوڑنی پڑی۔ اور اس جگہ میں کچھ عجیب و غریب مقناطیسیت تھی۔ کوئی گہرا طلسم تھا جو اس کو اپنی طرف کھینچتا تھا، اپنا اسیر کرتا تھا، وہ اس علاقے کے سحر میں گرفتار شاید آسانی سے یہاں سے نکل نہیں سکتی تھی۔

کھڑکی سے سر نکا کر اس نے حد نگاہ تک چراگاہوں کا جائزہ لیا۔ خوبانیوں کے جنگل میں تیز تیز قدم اٹھا کر دوڑتے قیمت خان کا "آسمان پر دھل کر نکھرے بادلوں کا" اور تازہ دم چست گھوڑوں کا۔

پری اس کے لیے چائے بنا لائی تھی۔ وہ سائیڈ ٹیبل پر میٹ پر کپ دھرتی ابھی تک اس سے شرمائی شرمائی تھی۔ پری بھی ان ہی خوب صورت نظاروں کا حصہ تھی۔ یہ سہمے سہمے ڈرے ہوئے خوف زدہ چہرے اس کا اپنے اوپر سے اعتبار اٹھا دیتے تھے۔ وہ ظالم نہیں پر قدرت کے مظلوموں نے اسے آقاؤں کا ایک حصہ سمجھ لیا تھا۔ وہ پری کو دیکھ کر شگفتگی سے مسکرا دی۔ نکھری ہوئی بے ریا مسکراہٹ، دوستی کی طرف ایک قدم۔ لیکن اس کو مسکرانے کا اذن نہیں تھا شاید۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لپکی جو اس نے دانتوں میں کچل کر توڑ ڈالی۔

"بہت بہت شکریہ پری۔" اس نے چائے کا بڑا سا گھونٹ حلق میں اتارا۔ "اب تمہارے مالک کیسے ہیں پری؟" اس نے اس کو یونہی کھولنے کے لیے سوال جڑا تھا، شاید اسی طرح ان لوگوں کے دل میں اس کا خوف کچھ کم ہو۔

"بابا بتاتے ہیں اب اچھے ہیں۔"

بیلا مسکرا دی بڑا نپا تلا جواب تھا۔ گیارہ بارہ سال کی اتنی سی کم عمر لڑکی کے اس سیاست دانی جواب پر وہ ہنس دی۔ لیکن وہ اس کے سامنے اسی طرح کھڑی تھی مودب اور خاموش اس نے چھوٹی کرسی اس کے سامنے رکھتے ہوئے دوسری کرسی خود سنبھال لی۔

"بیٹھ جاؤ پری۔" وہ بیٹھ گئی لیکن قالین پر۔

"یہ بتاؤ باہر وادی میں گھوڑے کیوں نکالے جا رہے ہیں؟ کیا یہاں گھڑ دوڑ ہوتی ہے۔"

"مالک لوگ سواری پر جا رہے ہیں۔ بابا نے بتایا تھا۔"

"لیکن بڑی مالک گھوڑے پر تو نہیں بیٹھ سکتے۔"

"خان گل جی اور میاں ڈاکٹر صاحب جائیں گے جی۔ آپ کی پیالی خالی ہو گئی۔"

"نہیں۔" وہ جان بوجھ کر پیالی ادھوری چھوڑ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

"تمہارے علاقے کے گھوڑے بہت خوب صورت ہیں۔"

"ہاں جی۔" اس نے وثوق سے کہا۔

"اور لوگ بھی؟"

"ہاں جی۔"

اس نے دور تک پھیلے سبزہ زاروں میں خوبانیوں اور باداموں کے درختوں کے اندر اندر کسی شخص کو دوڑتے دیکھا، وہ بہت عجیب آدمی تھا۔ اس نے حیرت سے سوچا۔ وہ ہمیشہ انہی سبزہ زاروں میں منڈلاتا رہتا ہے۔ لیکن اس کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ یہاں کوئی چھوٹی موٹی تفریح منا سکے۔ شاید خوبانیوں کے باغ کے اس طرف کسی دوسرے سردار کی زمین شروع ہوتی ہو۔

"یہ آدمی کہاں جا رہا ہے پری؟" اس نے برسبیل تذکرہ پوچھا تھا، پری مودب اٹھ کر آئی۔ بیلا کے کاندھے کے پیچھے سے اچک کر جھانکا اور ایک دم پیچھے ہو گئی۔

"کون سا آدمی جی۔" بیلا کو احساس ہوا وہ کم عمر ہونے کے باوجود بے وقوف نہیں تھی۔

"ابھی تو تم نے دیکھا ہے اس شخص کو۔ بری بات پری "مہمانوں کے ساتھ جھوٹ بولنے سے گناہ ہوتا ہے۔" پری کا منہ رنگ گیا، کچھ بھی ہو وہ اس عمر میں گناہ گار نہیں ہونا چاہتی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"وہ—" الفاظ اس کے حلق میں پھنسے۔ اس نے تھوک نگلا۔

"وہ بڑی خطرناک جگہ ہے۔ وہاں چیتے ہیں۔ آدم خور چیتے۔ وہ ہماری جاگیر کے چیتے ہیں۔ ہم نے پالے ہیں۔ بڑے خونخوار ہیں۔ وہ اپنا پرایا کچھ نہیں دیکھتے۔"

"تمہیں کیسے پتا؟"

"سب جانتے ہیں جی۔"

"تو وہ آدمی وہاں کیوں جا رہا ہے پری؟ چیتے اس کو نہیں کھاتے۔"

"اس کو نہیں کھاتے جی۔" وہ ہنسی ہی پڑی آخر۔ "وہ تو ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ان کا رکھوالا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا؟"

"ارے وہی تو میرا بابا ہے جی۔ سوہنا ہے چیتا بڑا ظالم درندہ ہے۔ وہ بھوکا ہو تو اپنے سامنے بڑے سے بڑے درندے کو چیر پھاڑ دیتا ہے۔" تو قیمت خان ہی پری کا بابا ہے۔ اس نے چائے ایک گھونٹ میں خالی کر دی۔

پری خالی پیالی لے کر شکر کا کلمہ پڑھتی نکلی۔ وہ خاموشی سے پھر باہر جھانکنے لگی۔ قیمت خان دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کے جھنڈ میں کہیں نظروں سے غائب ہو گیا تھا۔ جہاں تک اس اونچی جگہ سے وادی اور آبادی نظر آ رہی تھی چھپے چیتوں کا ٹھکانے کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ غالباً "حفاظتی اقدام" کے تحت درندوں کو بستی سے میلوں دور بسایا گیا تھا۔ لیکن رات میں تو انہیں کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور کیا معلوم جو وہ رات کو ٹہلتے ٹہلتے اس کھڑکی تک آ جاتے ہوں۔ اسے جھرجھری آ گئی۔ غالباً "اسی لیے بے بے کی ہدایت ہیں کہ کھڑکی کے دروازے رات تک اچھی طرح مقفل ہونے چاہئیں۔

اس نے ایک نظر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سبز سبزہ زاروں پر سفید چاق و چوبند گھوڑے مالک کے اشارے کے منتظر تھے۔ خان گل کو وہ پہچانتی تھی۔ ساتھ میں دوسرا شخص سرجن نثار ہی ہو سکتے تھے۔ وہ خوش باش ہنستے مسکراتے لوگ تھے۔ انہیں زندگی سے لطف اٹھانا آتا تھا کیونکہ زندگی نے ان کو کوئی خاص دھچکے نہیں پہنچائے تھے۔ اس کے دیکھتے دیکھتے انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور ٹاپوں کی مسحور کن آوازیں آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئیں۔ قیمت خان کی طرح وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ حالانکہ جب تک وہ نظر آتے رہے وہ ان کی ساری خوشی، ساری زندگی یہاں سے محسوس کرتی رہی تھی۔ کتنی شدت سے اس کا جی چاہا وہ بھی ان کے ساتھ گھوڑا دوڑاتی بھاگے۔ لیکن افسوس یہ اس کے باپ کا گھر نہیں تھا، وہ یہاں صرف ملازم ہی تو تھی اور ابھی اس نے رائیڈنگ میں مہارت بھی کہاں حاصل کی تھی۔ ابھی تو گھوڑے پر بیٹھنے (جس کو جاکی ماسٹر مونٹ بولتے تھے) اور ایڑ لگانے کے درس پر تھی کہ سارے سبق ادھورے رہ گئے۔

یہ بھی غنیمت ہوا کہ مریم کو بھیج کر بے بے نے اسے بلوا لیا، وہ بار بار ماضی کی طرف دوڑ جاتی تھی۔ حالانکہ اب تو ماضی بھی اس کا اپنا نہیں رہا تھا اور حال بھی کوئی قابل ذکر چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ گھوڑے نہ چیتے۔

"تم پریشان ہو؟"

وہ بعض اوقات بے بے کے علم نجوم پر ہراساں ہو جاتی تھی۔ وہ اون سلائیوں میں الجھی مختلف نمونوں

کے بار بار خانے گنتیں، بار بار بھولتیں وہ مخاطب کی طرف نگاہ کیے بغیر تیر کی طرح اس کے دل میں اتر جاتی تھیں۔

"نہیں تو۔" اس نے خجالت سے کہا۔

انہوں نے تھوڑی دیر کام روک کر بڑے غور سے اس کی شکل دیکھی۔ پھر الٹے گھروں پر چڑھائے سیدھے گھر گننے لگیں۔

"تم آرام تو نہیں کر رہی تھیں۔ میں نے یونہی بلا لیا۔ میں نے کہا تم کہیں گھبرا نہ رہی ہو۔"

"آرام ہی ہے ہر وقت، بے بے یہاں کام ہی کون سا ہے؟"

"سرجن نثار ناشتے کی تعریف کر رہے تھے تو خان گل نے بتایا یہ ناشتا تم نے تیار کیا ہے، وہ غالباً "کوئی حلوہ یا کوئی ایسی ہی چیز تھی۔" وہ جانتی تھی ناشتے میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی لیکن خان گل نے اپنی ممنونیت میں مہمان کو بھی شامل کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

"ہاں مجھے یاد آیا۔" بے بے چونکی۔ "وہ سوجی کے حلوے کی تعریف کر رہے تھے۔ پھر دانیال خان نے بھی ان کی اجازت سے ایک دو چمچے کھائے تھے۔" اس کا منہ رنگا گیا۔

"سب لوگ بہت مصروف تھے۔ میں نے سوچا..." اس نے شرمندگی سے کہا۔

"اچھا کیا ناں مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا تمہیں پکانے کا شوق ہے۔ تمہارا دل چاہے تو باورچی خانے میں جا کر بنا لیا کرو۔ میں خستہ خان کو سمجھا دوں گی۔ گو وہ باورچی خانے میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ لیکن ظاہر ہے تمہاری بات اور ہے۔" خستہ خان کو وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ ہلکے سے مسکرا دی۔ گھٹنوں پر زردے کروہ اٹھیں۔ اور سلائی ایک طرف پھینکی۔ "آؤ تمہیں باورچی خانے لے چلوں۔"

وہ معمول کی طرح ان کے پیچھے چل دی۔ اس کو ان کے احکامات کی مسلسل بجا آوری کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

"کبھی کبھی باورچی خانے میں اچانک چلے جانا چاہیے۔" انہوں نے اس کو گر کی بات بتائی۔ "تب ہی باورچی خانہ صاف ستھرا ملتا ہے۔"

خستہ خان کا مددگار ناشتے کے برتنوں کی صفائی میں جتا ہوا تھا۔ خود خستہ خان چولہے پر کسی اہم کھانے کی تیاری میں مصروف لگتے تھے۔ بے بے نے چاروں طرف کا جائزہ لیا، کیبنٹ کھولے سنک میں جھانکا۔ پھر وہ کتنی دیر خستہ خان سے مذاکرات کرتی رہیں۔ نمک، مرچ، ہلدی کی تفصیل، دانیال خان کی خاص خوراک اور یہ کہ یہ بیلا ہے۔ اس کا جب جی چاہے باورچی خانے میں آ سکتی ہے۔

وہ ساری زبان سمجھتی تو نہیں تھی لیکن اس کے سوا بے بے نے اور کہا بھی کیا ہوگا۔

خستہ خان اور بے بے ایک ساتھ بڑبڑانے لگے۔

وہ ریاست باورچی خانہ کے زوال پر اور یہ دانیال خان کی ضدوں پر۔

"جانتی ہوں میں جو مرضی پکوا کر بھیج دوں۔ کھائیں گے وہی جوان کا جی چاہے گا۔ یہ ہلدی کیا فائدہ دیتی ہے چربی کا کیا فائدہ؟"

انہوں نے بڑبڑا کر غالباً "دانیال خان کے کبھی کے کہے الفاظ دہرائے ہوں۔

دوپہر کے کھانے پر باورچی خانہ خوب بارونق تھا۔ اس نے اجازت ملنے کی خوشی میں پہلا ہی دن جشن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مناتے گزرا۔ جو اس کا جی چاہا تھا پکا کر کھلایا گو اس کو پکانے کے معاملات میں اتنی دلچسپی نہ تھی کہ وہ اس کو اپنے لیے تمنا امتیاز بنا لے یا زندگی کے سارے خوش گوار لمحے باورچی خانے کی نذر کر دے۔ ابھی اس کا موقع ہی کہاں آیا تھا ابھی تو کتابوں سے سر نہیں اٹھایا تھا کہ سنگ باری شروع ہو گئی۔ ہاں کبھی کبھی خوشی کے موقعوں پر وہ خوشی کے ساتھ مل کر باورچی خانے کا حسن ملیامیٹ کرتی تھی۔

آج ایک ایسا ہی دن تھا۔ گاربیج کا خالی کین انڈوں کے خولوں سے بھر گیا۔ سنک میں چمچ کانٹے چھوٹی پلیٹ بڑا ڈونگا بڑی پلیٹ چھوٹا ڈونگا ہر قسم کے برتنوں کا ڈھیر لگ گیا۔

خستہ خان اس کو گھورتے۔ اس کی بکھری چیزیں سمیٹتے آہستہ آہستہ اس عجیب و غریب مہمان میں دلچسپی لینے لگے تھے۔

وہ نوکروں کے ساتھ کام کرتے تیوری چڑھا کر بازو نہیں ہلاتی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بے ساختہ سی بے تکلفی سے ہنس پڑتی۔ اپنی کوکنگ کی غلطی وہ خستہ خان کے سر نہیں ڈالتی تھی بلکہ بڑی دلچسپی سے اپنی پلیٹ دیکھ کر خوش ہوتی۔ وہ پہر کے کھانے کی پکار پڑی تو خستہ خان پیغام لانے والے پر برس پڑے "کیا جلدی ہے۔ ابھی پکے ہی کے گا ناں" ظاہر ہے کھانے کو پوچھنے آنے والے کو بازوؤں کی آستینیں موڑ کر وہ باورچی خانے سے باہر دھکا دیتے اور کہہ بھی کیا رہے ہوں گے۔ انہوں نے بڑی جلدی اپنی وفاداری بیلا بی بی کی طرف موڑ لی تھی۔ درمیان درمیان میں بیلا کا لیکچر جاری تھا۔ پلیٹ "پلیٹ" دو پلیٹ اٹھا کر اس وقت تک دہراتی رہتی جب تک خستہ خان خود اپنے منہ سے پلیٹ نہ کہہ دیتے۔ وہ کھانے کے کمرے میں برتن سجانے گئی تو اس نے انگلیوں پر گنا اس کی پشتو کی vocabulary دس تک پہنچ چکی تھی اتنی ہی اردو کی خستہ خان کی ہو گئی ہو گی۔

بے بے نے بے چینی سے جالی کا دروازہ کھولا۔

"ہو جاتا ہے خستہ خان اس کو جھاڑ کر بھیج دیتے ہیں۔ معلوم نہیں کھانے میں کیوں دیر ہو رہی ہے۔"

"وہ میرا قصور ہے بے بے۔" اس نے بھولپن سے کہا۔ "میں کچھ پنجابی کھانے ٹرائی کر رہی تھی۔"

"ہاہ" بے بے نے بے ساختہ اسے گلے لگا لیا۔ "جگ جگ جیو معتمد روانی ہو۔"

بے بے کا ٹھنڈا گہرا سانس دعا کی قبولیت کی گہرائی میں اترا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی کبھی بے بے کو اداس کر دیتی تھی۔ وہ کسی بھیانک سی یاد میں مغموم ہو جاتیں۔ حالانکہ اس کا قصور بھی نہیں تھا اس کے خوش دلی سے کام کرتے ہاتھ انہوں نے غالباً سست پڑتے دیکھے اور اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"ارے ہاں کیا میں نے خستہ خان سے کہا تھا کہ نثار بھی یہاں ہی کھانا کھائیں گے۔ ہمارے ساتھ۔"

وہ غائب دماغی سے بیلا سے سوال کر رہی تھیں۔

"مجھے یاد نہیں بے بے شاید کہا ہو۔"

"اچھا ان کی پلیٹ بھی لگا دینا۔ وہ سادہ آدمی ہیں زیادہ تکلف نہیں کرتے۔"

بیلا ٹھٹک سی گئی وہ آزمائشوں سے ڈرنے لگی تھی۔

پھر بھی اس نے خاموشی سے ان کا میٹ ان کی پلیٹ اور نیپکن سجا دیا۔

بے بے اول میز کے گرد گھر کی بزرگ خاتون کی طرح بیٹھ کر بچوں کا انتظار کرنے لگیں۔ پروشہ جگ اور گلاس لے جاتی پھر رہی تھی کہ کمرے سے باہر ایک طوفان سا مچ گیا۔ بیلا طوفان کا اندازہ لگانے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ بے بے نے جیسے کان لگا کر سنا۔

"او خان گل آ گئے خستہ خان سے کہو روٹی شروع کرے۔"

اس نے کھلے دروازے کی طرف دیکھا وہ لوگ چمڑے کے فل بوٹ اور چمڑے کی جیکٹوں میں ہی اندر آ گئے۔ وہ تفریح کے سارے مزے لوٹ کر آئے تھے اس لیے گھڑ سواری کے لباس میں ہی دندناتے پھر رہے تھے۔

"پانی ٹھنڈا اور میٹھا ہے بے۔" سرجن نثار پروشہ سے گلاس لے کر سادہ پانی پینے لگے۔

"اوہو صبر تو کرو میں جوس نکلواتی ہوں۔" بے بے اٹھتی رہ گئیں۔۔ وہ لوگ گلاس پر گلاس چڑھا کر فارغ ہو گئے۔

"ڈاکٹر صاحب۔" خان گل نے کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کھڑی بیلا کو ایک نظر دیکھا۔ "آپ کا بیلا سے تعارف ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ روک کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ "غائبانہ تو ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"آپ نے خود کروا دیا تھا ناشتے پر۔"

وہ جھینپ کر ہنس دی۔ ناشتے کا اچھا مذاق بنا تھا بے بے نے پیار سے اس کی خجالت مٹائی۔

"اور تمہیں پتا ہے یہ کھانا بھی بیلا کا بنایا ہوا ہے۔ کھاؤ گے تو ناشتے کو بھول جاؤ گے۔"

"تب تو مجھے فوری طور پر کھانے پر پہنچنا چاہیے۔"

وہ واقعی چند ہی منٹ میں کپڑے بدل کر واپس آ گئے۔ خان گل بھوک کی بے چینی میں ساری کچی سبزی چٹ کر گئے تھے آدھی لسی پی چکے تھے اور آدھا رائتہ خالی کر دیا تھا سرجن نثار خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے آئے۔ اس کے کرسی پر بیٹھ جانے کے انتظار میں کچھ دیر کھڑے اور اس کے بیٹھتے ہی دراز ہو گئے۔

"لاؤ بھئی بسم اللہ۔" انہوں نے آستینیں چڑھائیں۔ "دلجوئی میں غالباً ان کو کمال حاصل ہے" بیلا نے جھینپ کر سوچا۔ اتنا کہ اپنی کلینک چھوڑ کر دوست کی خاطر مدارت کے لیے گھڑی آ بیٹھے ہیں۔ لیکن بیلا نے سوچا۔ معلوم نہیں وہ ان کے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ وہ دونوں ہاتھ بڑھا بڑھا کر ڈونگے گھسیٹ رہے تھے اور زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔

اتنی بہت سی ہمت افزائی کی اسے توقع بھی نہیں تھی۔

اس نے یونہی اپنے علاقے کی طرف سے دوستانہ پیشکش کے طور پر یہ آئیٹم رکھے تھے۔ لیکن داد کی اسے امید نہیں تھی۔ بے بے وقفے وقفے سے مسکراتی فخر سے اس کی طرف دیکھتیں جیسے دیکھو یہ کارنامہ میرا ہے۔

وہ اس محفل میں خوش بھی تھی لیکن خوف زدہ بھی۔

سرجن نثار کی بے حد بولتی طبیعت سے خائف لوگ تھوڑی دیر بولنے کے بعد اس کے ماضی کی طرف آ جاتے ہیں اور تکلیف دہ سوال کر کر کے اس کی طبیعت جینے سے بالکل ہی اچاٹ کر دیتے۔ لیکن شکر ہوا بہت زیادہ بولنے کے باوجود انہوں نے اسے نشانہ مشق نہیں بنایا۔ وہ خان گل کا مذاق اڑاتے اور اس کو ہمنوا بناتے رہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بہت بہت شکریہ خاتون۔" انہوں نے نیپکن سے ہاتھ پونچھ کر اٹھتے ہوئے کہا "بچپن کی بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں جب میں اسلامیہ پارک کی گلیوں میں ننگے پاؤں پھرا کرتا تھا۔ ایک ہاتھ میں تختی دوسرے میں بستہ۔ وابی بی خوش رہیں۔ آؤ ذرا اس نالائق کو پوچھیں۔ وہ تو کیا بیٹھا عیش کر رہا ہوگا۔"

ڈاکٹر صاحب کے تعاقب میں خان گل اٹھا۔ بے بے نے پشت پر پڑے تولیے سے ہاتھ رگڑے۔

"ٹھہرو۔ میں بھی آتی ہوں۔"

مرکری کی دودھیا روشنی میں چمکتے ہوئے قیمتی برتنوں میں وہ ایک غیر قیمت سی بیٹھی رہ گئی۔

ابھی وہ تالیاں سمیٹ رہی تھی۔ گھر کے اہم اور ضروری رکن کی طرح داد وصول کر رہی تھی کہ دیکھتے دیکھتے وہ اکیلی رہ گئی۔ پروشہ یوسف خان برتن سمیٹنے آئے تو وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

واہ واہ کرتے ڈاکٹر صاحب۔ بے پناہ عزت دیتے خان گل اور فخر کرنے والی بے بے۔

باری باری سب ہی اٹھ کر چلے گئے تھے۔ اور وہ تنہا تھی۔

بے شک اسے اپنی تنہائیوں سے سمجھوتا کرنے کا درس لینا تھا۔

اور یوں بھی وہ ان میں سے ایک تو نہیں تھی۔ ان کا حصہ تو نہیں تھی۔

وہ خاموشی سے کام میں مصروف ہو گئی۔

اس کے کام کے اوقات تو مقرر نہیں تھے۔ جب نظاروں سے گھبرا جاتی تو کام کی طرف آ جاتی۔ کام سے تنگ پڑنے لگتی تو پتھروں سے بہہ کر آنے والے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھی رہتی۔ اس کے سوا کوئی بھی مصروفیت ہی کیا تھی۔

وہ شام کی چائے میں شامل نہیں تھی کیونکہ وہ دیوار کی ڈیزائننگ میں مصروف تھی۔ اس نے کتنے فریم بدلے۔ کتنی تصویریں لگائیں۔ نظارے جمائے۔ لیکن وہ دیوار اس رخ تھی کہ کھڑکی سے سورج کی روشنی براہ راست دیوار پر چمک پیدا کرتی تھی۔ اس نے اسٹور میں ایک ریلیف ورک دیکھا تھا۔ ریلیف ورک چونکہ اسپاٹ نہیں ہوتا اس لیے امکان ہے کہ روشنی اس جگہ سے منعکس ہو کر وہ چمک نہیں پیدا ہونے دے گی۔

چابیاں اس کو یاد آیا' چابیاں تو اس نے بے بے کو اسٹور کی تلاشی کے بعد فوراً "واپس کر دی تھیں۔ اور اس وقت جب وہ شام کی چائے کی معذرت کر چکی ہے اور رات کا کھانا سرو ہونے میں کچھ منٹ باقی ہیں وہ بے بے کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور یوں بھی ہوم ورک مکمل ہو چکا تھا' اب جب تمتماتا سورج نکلے گا۔ تب ہی وہ ریلیف ورک کا شاہکار یہاں لٹکا کر صحیح صورت حال سمجھ سکے گی۔ اس نے سارا کام سمیٹ کر کونے میں جمع کر دیا' دیوار کا یہ حصہ پیمائشوں اور ناپ کے بعد صبح ہی کو پایہ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ تھک جاتی تو اس کے مددگار سکون کا سانس لیتے۔ انہیں تو کچھ اور نہیں کرنا پڑتا تھا سوائے "پکڑانا" اور "رکھنا" کے۔ وہ مسلسل ایک ہی اکتا دینے والے کام سے گھبرا جاتے۔

☆ ☆ ☆

وہ گھبرائی نہیں تھی۔ وہ بزدل بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ محفل سے کترانا چاہتی تھی۔ شام کی چائے پر اور پھر رات کے کھانے پر ایک محفل جمے گی۔ لوگ اس کو برابری کے درجے پر لا کر بھی گویا اس پر رحم کھاتے تھے۔ وہ ان کے برابر تھی بھی نہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ سب انسانوں کے برابر ہونے کے کتابی

فلسفے کا عمر بھر پرچار کرتی آئی تھی۔

اس سے قبل کہ رات کے کھانے پر بلایا جاتا اس نے پری کو کہلا بھیجا تھا۔

"بے بے سے کہہ دینا میرے سر میں شدید درد ہے۔ میں کھانا نہیں کھانا چاہتی۔ میں جلدی سو جاؤں گی۔"

پری چند قدم دور نکل گئی تو اسے خیال آیا اس نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری تھی۔ سر درد کا حال سن کر سرجن نثار ضرور آئیں گے۔ حالانکہ وہ ایسے احباب سے ہی تو چھپ رہی تھی۔

لیکن یہ اس کی خوش فہمی ہی ثابت ہوئی۔ پری ہتھیلی پر دو سر درد کی ٹکیوں کے سوا کچھ بھی نہیں لائی۔

یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ وہ مایوس نہیں ہوئی۔ وہ لوگوں سے غلط توقعات قائم کرنے کے کامپلیکس سے نکل آئی تھی۔

جب وہ ان جیسی نہیں تھی تو ان کے درمیان ایک آؤٹ سائیڈر کی حیثیت سے محفل کو بدمزہ کرنے سے حاصل۔ اس نے بستر پر لیٹ کر خاموشی سے اپنی کتاب اٹھائی۔ یہ کتاب مریم نے کہیں سے حاصل کی تھی۔ اور اس کو تحفے میں ہمیشہ کے لیے بخش دی تھی۔ یہ کسی عورت کا لکھا ہوا کچا سا رومانی ناول تھا' وہ عام زندگی میں ایسی کتابوں کو سانپ بچھوؤں کی طرح گھناؤنی سمجھتی تھی لیکن اب جب سے یہ کتاب اس کے ہاتھ لگی تھی وہ روزانہ اس کے چند صفحے پڑھ کر سوتی تھی۔ باقاعدہ پڑھنے کی نوبت تو اب تک آئی نہیں ہاں ان آنکھوں کو اس مشق کی جو عمر بھر کی عادت تھی اس کی تسکین ہو جاتی۔ نیند بھی سہولت سے آ جاتی۔

ہاں البتہ صبح کا ناشتہ وہ گول نہیں کر سکتی تھی۔ بے بے ناشتے پر اس کی ایسے عادی ہو گئی تھیں جیسے لوگ صبح کے اخبار کے۔

وہ معمول سے لیٹ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کھانے کا کمرہ سونا پڑا تھا۔

وہ تیزی میں پلٹ کر بے بے کے کمرے میں آ گئی بے بے آتش دان کے سامنے ماضی میں گم اپنے پسندیدہ پوزے چوٹھیں۔

"تم کچھ ٹھیک ہوئی ہو۔ تم نے تو مجھے پریشان ہی کر دیا۔ کیسی ہو اب۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ شرمندہ سی ہو گئی "یوں ہی سر درد تھا۔"

"میں تو سوچتی رہی۔ کیا کروں تمہارے پاس آؤں۔ پھر میں نے سوچا تم تنگ ہو گی۔ سرجن تو تھے نہیں۔ میرے پرس میں ان کی گولیاں پڑی تھیں۔"

"سرجن کہاں گئے؟"

"وہ تو چلے گئے واپس۔"

وہ اپنی بدگمانی پر شرمسار ناشتے میں مگن ہو گئی۔

"آپ پراٹھا کھالیں گی؟" وہ روز کی طرح ان کی خاطر مدارات پر کمر کس کے آ گئی۔

"ہاں کیونکہ میں نے بھی رات کا کھانا نہیں کھایا۔ تنہا کیا کھاتی؟"

واقعی ہم کبھی کبھی زیادتی کی حد کر دیتے ہیں۔ اپنی ذات کے بارے میں ہماری اتنی بدگمانیاں لوگوں کو اتنا نقصان پہنچاتی ہیں۔ اس نے فرضی درد والے سر کو ہلکے سے چھوا۔ اگر وہ اتنے اہتمام سے جھوٹ نہ بولتی تو بہت سی کوفت سے بچ جاتی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اور خان گل۔ ان کا کیا بنا؟"

"وہ سیلانی آدمی ان کا کیا بھروسہ۔ سرجن نثار کے ساتھ ہی نکل گئے۔ وہ لوگ دوپہر کو چلے گئے تھے۔ کھانا کھاتے ہی تم اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں، تمہیں پتا نہیں چل سکا۔"

یہ سزا ٹھیک رہی۔

اس نے پراٹھا کھاتے اپنی سزا کو خود ہی جائز قرار دیا۔

"آج سردی بہت ہے اپنا خیال رکھنا۔"

وہ اتنی محبتوں کی حق دار نہیں ہے۔ اور کبھی محبتوں پر اس کا اعتماد بالکل ہی ختم ہو جاتا اور کبھی اس کو لگتا محبتیں انجام کار انسان سے چھن جاتی ہیں۔ وہ مہمانوں کے کمرے کی دیوار میں پھر مصروف ہو گئی۔ اسٹور میں جو کام سب سے زیادہ اس کو پسند آیا وہ مٹی کی ایک چوکور ریلیف ورک تھی۔ یہ مٹی کا دروازہ تھا جس کے ایک طرف مٹی کی بیل ستونوں سے لپٹی اوپر تک چلی گئی تھی۔ دروازے کے سامنے تین خستہ سیڑھیاں۔ گھر پرانا لگتا تھا لیکن پتا نہیں کہاں تھا، لگتا تھا زندہ ہے جیسے ابھی مدتوں کا بند دروازہ کھول کر کوئی باہر آجائے گا۔ اس نے یہ تصویر مرکز میں لگائی۔ چند اور تصویریں آس پاس سجاوٹ کے لیے رکھی تھیں۔

اس نے اس دیوار پر بہت وقت لگا دیا۔ اس کا اس کو اندازہ تھا لیکن یہ گیسٹ روم کی مرکزی دیوار تھی۔ اس دیوار کی آرائش کے بعد ہی بیڈ کو سیٹ کرنے کا مسئلہ آنا تھا، سائیڈ لیمپ کی روشنی براہ راست سائیڈ کی تصویروں پر جانی چاہیے۔ درمیان والی بڑی تصویر کے عین نیچے بستر کا مرکز آنا تھا۔

اس نے کام روک کر کھانا کھایا۔ گزشتہ روز اس نے کچھ زیادتی کر دی تھی۔ بے بے ایسی جاں نثار اور معصوم کے ساتھ ایسے پرائمری اسکول کے جھوٹے بہانے چلتے اچھے نہیں لگتے۔ وہ ہنستی مسکراتی ان کے ساتھ لیونگ روم میں آگئی۔ ٹرالی خوب صورت برتنوں اور خوش شکل کھانوں سے معمول کے مطابق چمکتی ملتی۔ ان سے بھوک چمک اٹھتی۔

وہ جب سے گڑھی آئی تھی اس کی بھوک خوب کھل گئی تھی۔ ورنہ وہ ایک مدت سے برائے نام کھا رہی تھی۔ شاید یہ گڑھی کا ماحول تھا۔ وہاں کی خوراک تھی یا وہاں کے سرخی مائل پانی کا اثر کہ وہ کھاتی بھی خوب تھی۔ بھاگتی دوڑتی بھی خوب اور دن بھر کی مشقت کے بعد ذرا بھی نہ تھکتی۔ سفید نازک چینی کی پلیٹ پر جھکی وہ بے بے کے لمبے لمبے قصے سنتی رہتی، جنوں اور کوہاٹ کی باتیں، بڑے بڑے شہروں کے قصے۔

پھر وہ رات کے کھانے کے بعد ہلکی سی چہل قدمی کرتیں پہلے وہ مریم کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے گیلری میں لمبائی کے رخ دو تین چکر لگاتی تھیں۔ اب بیلا آگئی تو وہ بچپن کی باتیں سناتی کتنے ہی چکر آہستہ آہستہ پورے کر لیتیں۔ یہ ان کو سرجن نثار کا مشورہ تھا۔ ورنہ امکان تھا کہ ان کے گھٹنے بالکل ہی ناکارہ ہو کر رہ جائیں۔ پھر نیند کا وقت آجاتا۔

اور صبح سے معمولات پھر اسی طرح شروع ہو جاتے۔ حتیٰ کہ تین چار دن پہلے ہونے والے حادثے کے منفی اثرات رفتہ رفتہ لوگوں کے ذہن سے زائل ہو گئے۔ وہ بھی مکمل طور پر بھلا تو نہیں پائی تھی لیکن ایک تو کام کی مصروفیت اس پر دانیال خان بالکل ہی کمرے میں بند۔ لوگوں پر منفی اثرات مرتب کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کے احکامات کسی کی زبانی باہر آتے یا پھر دن بھر میں چند منٹ کے لیے بے بے ان کے کمرے میں

چلی جاتیں۔ شاید وہ مردم بیزار تھے کہ بستر پر لیٹے رہنے جیسی کڑی سزا کی تنہائی میں بھی ان کو کسی ہمدم کی محتاجی نہیں تھی۔

شاید سردار دانیال خان ایسے ہی غیر متعلق سے شخص تھے اور وہ غالباً گڑھی کے عوام کی زندگی میں عدم مداخلت کی پالیسی پر یقین رکھتے تھے۔ اس نظریے نے انہیں تھوڑا سا لاپروا بنا دیا، وہ نسبتاً آزادی محسوس کرنے لگی تھی کہ اس کو بے بے کا پیغام ملا۔

ان کا حکم تھا نہا دھو کر کپڑے بدل کر تیاری کر کے آؤ۔

ایسا ناگہانی حکم ان کی طرف سے پہلے تو کبھی نہیں آیا تھا، وہ پیغام لانے والے سے کرید کرید کر بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی سوائے اس کے کہ ضرور بے بے کے کوئی ایسے واقف گڑھی میں مہمان ٹھہرے ہوں گے جن کے سامنے اس کی عزت افزائی چاہتی ہوں۔ وہ نہا دھو لی۔ اس نے کپڑے بھی تبدیل کر لیے جوگرز کے بجائے سینڈل پہن لیے، بالوں میں خوب برش کیا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بھی وہ کتنی دیر یہ فیصلہ نہ کر پائی کہ اسے اور کیا تیاری کرنی چاہیے۔ جیولری کی اس کو عادت نہیں تھی۔ ہاں ٹاپس تھے کانوں میں جو ہر وقت پڑے رہتے۔ میک اپ کا نہ اسے شوق تھا نہ اس نے ضرورت سے زیادہ کوئی سامان رکھا۔

بے بے کے پاس پہنچی تو انہوں نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا کہ اس کی صحت مند شفاف جلد کسی آرائش کی محتاج نہیں تھی۔ کپڑے بھی اس کے سادہ تھے لیکن جچ رہے تھے۔ ان کی اوپر سے نیچے تک پڑتی تنقیدی لیکن توصیفی نگاہوں سے وہ بوکھلا گئی۔

"کیا بات ہے بے بے۔ آپ نے بلایا تھا؟"

"ہاں۔" انہوں نے آگ کے شعلوں سے نزدیک ہوتے ہوئے کہا۔ "دانیال خان نے پیغام بھیجا ہے وہ چائے ہمارے ساتھ پئیں گے۔"

"ہمارے ساتھ... مطلب؟" وہ تھوڑا سا گھبرا گئی۔

"میرے اور تمہارے ساتھ اور گھر میں ہے ہی کون؟"

"میں ڈائننگ ہال چیک کر لوں۔" وہ گویا مستعدی سے اپنی ڈیوٹی پر آگئی۔

"اوں ہوں۔" انہوں نے اس کو تیزی میں اٹھ جانے سے روکا۔

"وہ شام کی چائے ہمیشہ اسٹڈی میں پیتے ہیں۔"

وہ رک سی گئی۔ وہ کبھی ان کے کمروں کی طرف نہیں گئی تھی۔ ایک دن اتفاق سے اس نے ان کا آفس دیکھ لیا تھا بس، اور اس بات کو بھی ایک وقت گزر گیا تھا۔ بے ساختہ خوف زدہ دل کو ہموار کرنے کی جدوجہد میں وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کسی سے ڈرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کو مرعوب ہونا پسند نہیں تھا، لیکن اپنے دل کے اس ڈر پر خود اس کا اختیار بھی نہیں رہا تھا۔

"تم ان سے اعتماد سے بات کرنا جیسے تم کرتی ہی ہو۔" انہوں نے اس کے خوف زدہ چہرے پر ایک اطمینان کی نظر ڈالی۔

"جب انہوں نے مجھ سے کہا وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں تو میں نے شکر کیا، تمہارا ان سے ابھی تک باقاعدہ تعارف بھی نہیں ہوا۔ اس دن بھی وہ جلدی میں تھے اسی لیے تو میں نے کہا تھا تیار ہو کر آنا۔ شاید وہ تم سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گھر کی ارینجمنٹ کے سلسلے میں کوئی بات کریں۔ پہلی ملاقات ہی اصل انٹرویو ہوتی ہے۔"
وہ ان کی ہدایت کے بموجب تیار ہو کر تو آئی ہی نہیں تھی۔ ایک نظر اس نے خود کو جھک کر دیکھا۔ اچھا ہوا وہ کسی غلط فہمی میں میک اپ وغیرہ نہیں کر کے آئی۔ وہ ان کے سامنے کیس اور چھی سے لگتی لپ اسٹک اور پلشر کے ساتھ حالانکہ وہ گریس اور مٹی میں اچھی طرح لتھڑا اسے دیکھ ہی چکے تھے۔
"وہ چائے کتنے بجے پیتے ہیں؟"
"انہوں نے چھ بجے بلایا ہے۔" انہوں نے معقول اور مختصر جواب دیا۔ بے ساختگی میں اس کی نظر دیوار پر لگے سنہری کلاک پر پڑی۔ اس کا مطلب تھا اس کے پاس ایک گلاس پانی پینے کا بھی وقت نہیں۔
انہوں نے اپنی سلائیاں سمیت کراون کے گولے لکڑی کے فریم والے تھیلے میں ڈالے۔ یہ تھیلا بے بے کا ایک لازمی جزو تھا۔ وہ خاموشی سے ان کے تھیلے پر بنی مسکراتی چینی عورتوں کو دیکھتی رہی۔ نکلنے سے پہلے انہوں نے کسی کو آواز دے کر کوئی چیز منگوائی۔ بیلا کتنی دیر منتظر رہی۔ لیکن مریم نکلی تو ان کی گرم چادر تھی ساتھ۔ انہوں نے وقار سے اپنے کندھوں پر ڈالی اور اس کے ساتھ چلنے لگیں۔ غالباً" بے بے دانیال سے ملاقات کے وقت خود بھی بہت محتاط ہوتی ہیں اور دوسروں سے بھی یہی توقع کرتی ہیں۔ راہداری پار کر کے ان کی رفتار تیز ہو گئی یا بیلا کے قدم سست پڑنے لگے ان کے آفس کے عین نیچے تیز قدم سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ وہ اوپری سیڑھی پر جم سی گئی ہے۔
ان کے گمان میں وہ ان سے مرعوب ہو رہی تھی۔ ان کی بے پناہ شخصیت کے سحر سے مسحور ڈگمگا رہی ہے۔
"آؤ نا۔" انہوں نے دو قدم نیچے جاتے رک کر کہا۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں سے ان کے اٹھتے قدموں کے تعاقب میں آتی پندرہ سولہ سیڑھیوں کے مرکز میں بچھے قالین پر اس کا پاؤں کتنی مرتبہ اسے لگا رپٹ جائے گا۔
آگے آگے جا کر بے بے نے تقدیر کی طرح بند دروازے پر دستک دی اور غالباً" جواب کا انتظار کیے بغیر ہینڈل نیچے کر کے داخل ہو گئیں۔
اور وہ ان کی ہمراہی میں ان کے پیچھے پیچھے۔
کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے محسوس ہوا وہ نوادرات اور عجائبات کی دنیا میں داخل ہو گئیں ہے۔ سارا کمرہ لکڑی کے پینل ورک سے مزین تھا دیواروں کے شوکیس میں جہان بھر کی قیمتی اور منفرد چیزیں سجی ہوئی تھیں۔
لمحے بھر میں اسے احساس ہوا وہ نہایت حساس پسند رکھنے والے شخص کے کمرے میں داخل ہو گئی ہے۔
"آہا دانیال خان۔" بے بے لپک کر ایک کونے کی طرف چلیں۔
آتش دان میں لکڑیوں کی دہکتی آگ کے سامنے وہ آرام کرسی پر دراز زخمی پاؤں کمبل میں چھپائے آگ پر نظریں جمائے تھے۔ ان کی آنکھیں کچھ سوچتی کسی مسئلے میں غرق لگ رہی تھیں۔ وہ اپنے پیچھے کھلے دروازے کو بند کر کے جیسے انہی عجائبات کا ایک حصہ بن گئی۔ خوب صورت اور قیمتی لیکن جامد۔
انہوں نے غالباً" دروازہ کھلنے کسی کے اندر آنے کی چاپ سنی ہی نہیں۔

یا آنے والے ان کی نظر میں اتنے اہم نہیں تھے کہ وہ اپنے بلند خیالوں سے پلٹ کر ان پر نظر کر سکیں۔ وہ اس محویت سے آگ پر نظریں جمائے رہے۔
بے بے نے جیسے روز کی عادت کے مطابق پذیرائی کے بدلے سرد مہری وصول کر کے اپنے لیے کوئی جگہ پسند کر لی۔ وہ وہیں ہچکچا کر اپنی توہین سمیٹتی پھری۔
"دانیال خان۔ یہ بیلا ہیں۔"
"ہوں۔" انہوں نے گردن گھمائے بغیر کہا۔ گویا ہیں تو ہوا کریں۔
ان کی نگاہیں آگ پر مرکوز تھیں اور سوچتی ہوئی ذہین آنکھیں کرئی جالا سا بن رہی تھیں۔ جیسے آتش دان کی اسکرین پر کوئی پسندیدہ منظر دکھایا جا رہا تھا اور دنیا کی دلچسپیاں اس کے سامنے ہیچ تھیں۔
"بیٹھ جاؤ بیلا۔" بے بے نے چند لمحے اس ناخوش گوار سے استقبال کو سمجھنے میں صرف کیے۔ پھر اس کے لیے اپنے نزدیکی صوفے پر جگہ بنائی۔ بے بے دانیال خان کے سامنے پڑے صوفے پر آرام سے موڈ میں آ بیٹھیں۔ اس کے حصے میں جو جگہ آئی وہ دانیال خان کے آتش دان سے بائیں طرف تھی، وہ بیٹھتے ہوئے ہچکچا سی گئی۔ اگر دانیال خان آگ سے نظر اٹھا کر دیکھیں گے تو وہ سیدھی ان کی تنقید کی زد میں آ جائے گی۔ بے بے کی پیش کردہ کرسی اسی طرح خالی پڑی تھی اور غالباً" بے بے اس کی کشمکش بھی سمجھ رہی تھیں۔
"یہ والی کرسی ادھر لے لو بیلا۔" انہوں نے نسبتاً" محفوظ ٹھکانے کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"ان کے لیے جگہ بنانے کی ضرورت نہیں' یہ تو دوسروں کو جگہ دیتی ہیں۔"
"ایں۔۔؟" بے بے چونکیں۔
انہوں نے آتش دان سے نگاہ اٹھا کر پہلی مرتبہ غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ بے بے کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتی جھجک گئی۔ آج ان کی آنکھوں کے ساتھ ہونٹ بھی مسکرا رہے تھے۔ اس نے پہلی مرتبہ ان بے پناہ مصروف رہنے والی آنکھوں سے چاندنی ایسی جھلملاتی رو سی لپکتی دیکھی۔
"کیا پنجاب میں لوگ بیمار کی عیادت کو نہیں جاتے؟"
وہ سن سی ہو گئی۔ اس کے پاس صوبوں کی اس تفریق کا کوئی جواب بھی نہیں تھا۔
اس نے خاموشی سے آنکھیں جھکا لیں۔ لیکن شاید جواب اس پر فرض تھا' لیکن وہ جواب بھی کیا دے۔
اس نے آنکھیں اٹھائیں۔ دانیال خان کی گہری عمیق نظریں گویا جواب طلبی کے لیے اس پر گڑی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں وہ اب بھی سنجیدہ تھے یا اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔
لمحوں کے لیے اٹھائی پلکیں اس نے واپس گرا لیں۔
"یا آپ مجھے زخمی کر کے جشن منا رہی تھیں۔" اب ان کے ہونٹوں سے وہ موہوم سی مسکراہٹ بھی غائب ہو چکی تھی لیکن اپنی بات منوا لینے والی نگاہیں۔ اس پر گاڑے وہ ابھی تک جواب کے منتظر تھے۔
بے بے نے ایک حیرت بھری نظر دانیال خان پر ڈالی۔ ان کا یہ رویہ غالباً" ان کے لیے نیا نہیں عجیب ضرور تھا۔
"کیا مطلب؟" انہوں نے قطعی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بیلا کا سہارا لیا۔
"اس کو کہتے ہیں نیکی برباد گناہ لازم۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کیا مطلب؟" بے بے نے دوبارہ سوال کیا۔ لیکن ان دونوں میں سے کسی کی طرف سے جواب نہیں آیا۔

"مجھے دراصل پتا نہیں تھا آپ کا کمرہ کہاں ہے؟" اس نے اپنے پرانے اعتماد کو بحال کر کے اس کی تماشا بناتی نگاہوں کا سامنا کیا۔ وہ بزدل نہیں تھی بہر کیف۔

"واہ۔ آپ پنجاب سے گڑھی تک کا راستہ تو ڈھونڈ نکالتی ہیں اور گڑھی سے دس کلو میٹر دور راک کرتی نکل جاتی ہیں اور میرا یہ کمرہ قطب شمالی میں ہے شاید؟"

وہ پھر مسکرا رہے تھے اور اس مسکراہٹ سے وہ کیا مطلب نکالے۔ اس کی سمجھ سے بالا تھا۔ وہ اس کو اس کی اوقات جتا رہے تھے۔ اس کو نوکری کی طرف دھیان دینا چاہیے بس۔ وہ یہاں نوکری کرنے آئی تھی۔ پکنک پارٹیاں منانے جنگلوں کی سیر کرنے نہیں۔ اتنا تو وہ خود بھی آگاہ تھی۔

یا وہ بے بے کے بقول عادتاً "مسکرا رہے تھے" حالانکہ ان کا چہرہ اس سے بالکل مختلف تاثر چھوڑتا تھا۔

"اس کا قصور نہیں ہے۔ دراصل ہم لوگ ہی..." بے بے نے بات کی تمہید باندھی۔

انہوں نے اپنی کرسی سے سر ایک جھٹکے سے بے بے کی طرف موڑا۔

"کیا ان سے جب بھی کوئی سوال کیا جائے جواب آپ دیں گی۔ یا آج کے لیے یہ رعایت ہے۔" ان کے لہجے میں کاٹ کے باوجود بے بے کے لیے احترام تھا اور یہ احترام شاید صرف بے بے کے لیے ہی تھا۔

وہ ایک دم چپ ہو گئیں۔

یہ غالباً "دانیال خان کی ان رویوں کے عادی ہیں۔ وہ نہ واقف تھی نہ عادی۔

بے بے نے ایک نظر بے بسی سے بیلا کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اس امتحان میں فیل ہو جائے۔ حالانکہ کتنا تو اس کو پڑھا سمجھا کر لائی تھیں اور آج تو بیلا جیسی پرسکون اور صابر لڑکی بھی ضدی ہو رہی تھی۔ کیا حرج تھا اگر وہ معذرت کے دو بول کہہ دیتی۔ اس کی نوکری جانے سے زیادہ ان کو اپنے ساتھ کے چھٹ جانے کا ملال تھا۔

بیلا اب تک اس گھر میں اور ہی انداز میں رہی تھی۔ اس کو اب تک اس مالکانہ لہجے کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور شاید اس لیے بھی کہ اب تک اس کا سابقہ مالکوں سے پڑا ہی نہیں تھا۔ باقی سب گھر کے افراد بھی اسی کی طرح تھے۔ بے بس، بے سہارا، کسی اور کے گھر میں سہارے کے متلاشی۔

اس کی پھسلتی نگاہ اس ٹارگٹ پر آ ٹھہری جہاں کچھ دیر پہلے نظریں گاڑے دانیال خان کم بے ضرر اور کم تکلیف دہ لگ رہے تھے۔ انہوں نے ایک نظر بیلا کی نظروں کے تعاقب میں اس سمت دیکھا۔

"آپ لوگ آگ کے پاس آ جائیے۔ باہر کافی سردی ہے۔"

وہ اب بالکل سنجیدہ تھے۔ اپنے سابقہ رویوں کے برعکس خوش اخلاق اور مہمان نواز۔

بے بے نے احکامات کی تعمیل کے عادی شخص کی طرح ایک جھٹکے سے اپنا تھیلا اٹھایا اور آتش دان کے پاس ایک مخملی سیٹی پر آ بیٹھیں۔

"تم یہاں آ جاؤ بیلا۔" انہوں نے اپنے نزدیک کی جگہ اس کے لیے عادتاً "ہی خالی کی۔ حالانکہ وہ دیکھ چکی تھیں کہ اب ان کو اس کا اختیار نہیں رہا۔

"نہیں آپ اس جگہ بیٹھیے۔ یہ آگ کے قریب ہے۔" انہوں نے ایک بڑا کشن ہاتھ بڑھا کر اپنی کرسی

اور آتش دان کے درمیان پھینک دیا۔

"علاوہ ازیں مجھے آپ سے بات کرنے کے لیے گردن گھمانی پڑتی ہے اور میں اس طرح زیادہ آرام محسوس کر رہا ہوں۔" وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور کشن پر آ بیٹھی۔ کشن پر بیٹھنے سے پہلے اس نے اس کا ہلکا سا رخ موڑا ہی تھا کہ وہ بول اٹھے۔ "اس کو بالکل وہیں رہنے دیں جہاں میں نے رکھا ہے۔"

وہ بیٹھ گئی چپ چاپ کہ حکم کی بے جا تعمیل اس کے لیے دشوار تھی۔

"ہاں اس طرح ٹھیک ہے۔ تھینک یو۔ اور اب بتایئے گڑھی نے آپ کو اور آپ نے گڑھی کو اچھی طرح سمجھ لیا۔"

وہ اپنی کرسی کی آرام دہ پشت پر سر ٹکا کر اس سے سوالات پر اتر آئے۔ اطمینان اور سکون سے۔

گویا وہ بھی ان کا کوئی پالتو جانور تھی۔ وہ اسے سدھار رہے تھے پہلے کوڑے برساتے رہے اور اب تھپتھپانے پر اتر آئے۔

اتنی جلدی تو اس پر رقت طاری نہیں ہوتی تھی۔ لیکن کبھی ایسا وقت آتا ہے جب۔ اس نے آنسو بہانے کے بجائے پینے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس کے لیے کشن بھی تو اسی جگہ پھینکا تھا جہاں وہ سیدھی ان کے تیروں کی زد میں آتی تھی۔

اطمینان سے کرسی کی پشت پر دھرا سر انہوں نے سیدھا کیا، کتنی دیر اس کی نگاہوں کی سیدھ میں اس کی نیچے اوپر جھکتی پلکوں کو دیکھتے رہے۔

"کیا میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے دل شکنی کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔" وہ اب کہیں سے نہیں مسکرا رہے تھے۔

"آئی ایم سوری بے بے۔ آپ ہمیشہ منع کرتی ہیں اور میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔" بے بے اس نئی صورت حال سے گھبرا گئی تھیں۔

"میرا خیال ہے بیلا عادتاً "ہی خاموش ہیں۔ یہ نسبتاً "کم گو ہیں اور شاید نازک بھی۔"

بے بے اس کے دفاع کے لیے ہر وقت ہی آمادہ رہتی تھیں۔

"اچھا۔" ان کی آنکھوں میں لحظے بھر کے لیے شرارت چمکی۔

"اور اب تک میں یہ سمجھ رہا تھا یہ بہت دلیر ہیں۔ بہر کیف۔" وہ سنجیدہ ہوئے۔ "میں بہت سی چیزوں کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ آپ کے طفیل مجھے نئی زندگی ملی۔ اور یہ زخم ملا، آپ بروقت نہ پہنچتیں تو واقعی چیتے مجھے کھا چکے ہوتے۔" بے بے نے بے چینی سے سر اٹھایا، اس سے قبل کہ وہ اس نہ سمجھ میں آنے والے پزل کو چھیڑتیں دانیال خان ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"بے بے ہم لوگوں نے تو ان کو آج یہاں چائے پر مدعو کیا تھا، کیا چائے نہیں ملے گی۔" وہ تیزی سے اٹھیں۔ پہلے انہوں نے بیل بجائی۔ پھر کسی کا انتظار کیے بغیر خود ہی تیز قدم اٹھاتی سیڑھیاں چڑھ گئیں۔

"میرا خیال تھا آپ سب لوگوں کی طرح میرا حال پوچھنے آئیں گی تو میں تفصیل سے آپ کا شکریہ ادا کروں گا مجھے ڈاکٹر نے فی الحال پاؤں پر زور ڈالنے سے منع کیا ہے ورنہ میں خود آ جاتا۔ کوجان بچانے والی چیز کے سامنے شکریہ جیسا لفظ بڑا بے معنی بڑا رسمی سا لگتا ہے۔ لیکن آخر ہم اپنے احساس کا اظہار کیسے کریں۔ اور میں نے تو شاید کچھ کہہ کے آپ کو برہم ہی کر دیا ہے۔ حالانکہ میری نیت نہیں تھی۔ شاید میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے الفاظ نہیں بچتے۔ آپ جانتی ہیں اردو میری مادری زبان نہیں۔"

وہ جانتی تھی ان کی مادری زبان کوئی بھی ہو ان کو اپنی گفتگو پر عبور حاصل ہے۔

وہ اس کا یساں مرتبہ اور مقام جان کر اس کا شکریہ بھی اس طرح ادا کر رہے تھے جیسے اس پر بست بھاری احسان کر رہے ہوں۔

اسے انکسار ہے ہوں کہ وہ ان کے ساتھ بد تمیزی پر اتر آئے۔

وہ بھی تو اپنی برداشت آزمانے نکلی تھی۔

مریم کے آگے آگے بے بے چائے کے لوازمات لیے آئیں۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی گھبرا کر بیلا کی طرف دیکھا۔ ان کو خاموش دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا گویا جس ہنگامے کا خدشہ تھا وہ نہیں ہوا۔ اسٹڈی کے آخری حصے میں رکھی کھانے والی میز کے سامنے کرسی بچھا کر وہ چائے بنانے لگیں۔

"تم جاؤ مریم۔" انہوں نے دانیال خان کی طرف دیکھتے غیر محسوس طریق پر اردو میں کہہ دیا۔ وہ جانتی تھیں وہ نوکروں کی یلغار سے گھبراتے ہیں۔

"آپ کچھ لیں گے دانیال؟"

"کیا ہے؟"

"کباب ہیں اور بسکٹ۔"

"ہاں دے دیجئے۔"

"ذرا تم تکلیف کرو گی بیلا۔" انہوں نے ان کی چائے میں چینی گھول کر اس کو پکڑا دی۔ وہ کچھ رکی۔ پھر اس نے سامنے دھری تپائی پر چائے کی پیالی اور سرونگ ڈش سے باری باری چیزیں سرو کیں اور جواب میں ہلکا سا سرد سا شکریہ وصول کر کے اپنی پیالی لینے چلی گئی۔ بے بے اس کی پیالی میں چائے انڈیلے اس کی منتظر بیٹھی تھیں۔ وہ خاموشی سے اپنی پیالی تھما کر وہیں میز کے سامنے رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آپ واپس اپنی جگہ پر آ جیئے۔" اس نے ابھی پہلا گھونٹ ہی بھرا تھا کہ ٹھٹک گئی۔

واقعی یہ انداز تحکم حاکمانہ مختارانہ تو تھا ہی کچھ پچھ پرائمری اسکول کے ماسٹر کی طرح ان کو رعب جمائے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ (یہ ان کی ساری عمر کی عادت تھی بقول بے بے)

اور اس کو حکم ماننے کی عادت کتنی عمروں میں پڑے گی۔ وہ مظلوم سی بھی نظر آنا پسند نہیں کرتی تھی۔

اس نے خاموشی سے اپنی پیالی اٹھائی اور واپس اسی کشن پر آ بیٹھی۔ اس سارے عمل کے دوران وہ چائے کی پیالی ہاتھ میں روکے اس کے اٹھتے اور بڑھتے قدموں پر ایک تحسین سی نظر رکھے ہوئے تھے۔

"یہاں آنے سے پہلے آپ کیا کرتی تھیں۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتی تھیں اور اب بھاگتی ہوئی کہاں جا رہی تھیں۔"

"کسی خاص جگہ نہیں۔ یونہی۔"

"کچھ اندازہ ہے آپ کو آپ گڑھی سے کتنی دور تھیں؟"

اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ سنجیدگی کے ٹھوس لبادے میں نہایت غیر سنجیدہ سوال داغ رہے تھے۔

"اندازہ نہیں۔" اس نے صاف آواز میں کہا۔

"وقفہ کو رہ چیتے ان سے آپ کی پرانی یاد اللہ ہے۔ وہ آپ کو کچھ نہیں کہتے؟"

"چیتے شیر انسان۔۔۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب تینوں سے آپ مقابلہ کر چکی ہیں۔ ان تینوں میں سے کم خطرناک کون ہے؟"

وہ پیالی میں سے چائے کا پہلا گھونٹ لیتے رک گئی۔ گڑھی عیسیٰ خان کا مالک یہ شخص اتنا بے وقوف نہیں جتنا الجھے سوالوں سے اسے بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟

اس نے ان کی اپنے پر مضبوطی سے جمی نگاہ کا بہادری سے سامنا کیا۔

"درندہ تو کوئی بھی کم خطرناک نہیں ہو سکتا۔"

ان کے چہرے پر کسی نامعلوم رنگ کا کوندا لپکا۔

"انسانوں کی درندگی کے بارے میں کیا دیکھا؟"

"میں نے انسان کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔" اس نے صداقت سے بتایا۔ "کتابوں کہانیوں سے دیکھا ہے اور میرے خیال سے لوگ برے نہیں ہوتے۔"

"اچھا۔۔۔ تبھی۔" انہوں نے کسی نتیجے پر پہنچ کر اطمینان سے کہا۔

"میں بھی حیرت زدہ تھا یہ آپ کا چہرہ کسی عیسائی راہبہ جیسا تاثر کیوں دیتا ہے۔ بہن بھائی ہیں آپ کے؟"

"نہیں۔"

"والدین۔۔۔؟"

"نہیں۔"

گڑھی میں رہتے رہتے وہ ان سوالوں کے جواب دینے کی اس قدر عادی ہو چکی تھی۔ اب اس کا گلا نہیں رندھتا تھا۔ اس کی آواز نہیں بھراتی تھی۔

لیکن شاید یہ اس کا گمان ہی تھا کیونکہ سوال کرنے والے نے کتنی دیر کا وقفہ دیے رکھا۔

"آپ جہاں رہتی تھیں وہاں آپ کے دوست احباب تو ہوں گے۔ آپ کے رشتے دار ملنے والے۔"

"ہم لوگ اتنے سوشل نہیں تھے۔"

"ہم لوگ۔۔۔؟" انہوں نے تھوڑا سا زور دے کر پوچھا تھا۔

"ہاہ چائے ٹھنڈی ہو گئی اور تم نے ایک گھونٹ نہیں بھرا۔" بے بے نے تیزی سے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے لی۔ انہوں نے اپنی سادگی میں دانیال خان کی برہم نگاہوں کی پروا بھی نہیں کی۔

"لاؤ میں دوسری بنا کر دیتی ہوں۔"

"ذرا تکلیف کیجئے دوسری پیالی مجھے بھی بنا دیجئے۔" وہ بڑے ماہر انٹرویور تھے۔ انہوں نے اپنی گرم پیالی سے ایک قطرہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔

"میرا خیال ہے پہلے بیلا کو چائے پینے دیں۔" انہوں نے دونوں کو اپنی اپنی پیالیاں تھماتے ہوئے کہا۔

"کون بیلا؟" انہوں نے حیرت سے اپنی بھنویں اچکا کر پوچھا۔

"بیلا یہ اپنی بیٹا اور کون۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اوہ۔" انہوں نے مطلق شرمندہ ہوئے بغیر سنجیدگی سے اپنی چائے سے گھونٹ بھرنے شروع کر دیئے۔

اس کے ہاتھ میں گرم پیالی تھی اور بے بے کی طرف سے ان کو اجازت نہیں تھی۔ وہ جب تک چائے ختم کریں اپنے سوالوں کا سلسلہ جوڑ سکیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں کوئی روایت اس نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھی تھی۔ پھانسی کے ملزم نے رعایت مانگی تھی۔ وہ جب تک پانی کا کٹورا نہ پی لے اسے قتل نہ کیا جائے۔

کاش وہ بھی اتنی چالاک بن سکے کہ جاں بخشی کے لیے اپنی چائے کی پیالی ان کے قیمتی قالین پر اوندھا دے لیکن مکار سودی نہیں تھی اور چائے کی پیالی بھی آب حیات نہیں تھی۔

آخر ختم ہو ہی گئی تھی اور اس کے ساتھ مہلت بھی۔

"پڑھا تو خیر آپ نے ہے۔ یہ تو میں اندازہ لگا ہی سکتا ہوں۔ گاڑی چلانا کس سے سیکھی تھی؟"

"ابا سے۔"

"حالانکہ آپ کہہ رہی تھیں آپ نے کبھی نہیں چلائی۔"

"میرا مطلب تھا جیپ نہیں چلائی۔"

"واہ کیا خوب مطلب تھا۔"

"کون سی جیپ۔"

بے بے کو جواب دینے کے لیے پیالا نے گردن گھمائی تھی کہ تیز لہجے میں دانیال خان نے اس کی توجہ کھینچ لی۔

"مطلب یہ کہ آپ نے زیادہ لوگ نہیں دیکھے۔ جو دیکھے وہ کیسے تھے؟ گڑھی کے جیسے۔ بے بے جیسے میرے جیسے اچھے یا برے؟"

"نہیں! ان میں سے کچھ زیادہ اچھے تھے۔ کچھ زیادہ برے۔"

وہ چونک گئے "او حق گو خاتون' آپ یقیناً سچ بولتی ہیں۔ آپ نے دنیا زیادہ نہیں دیکھی۔" انہوں نے ایک سوچا ہوا گہرا سانس لیا۔

"اور اچھا ہوا کہ نہیں دیکھی۔" انہوں نے جیسے خود سے بڑبڑا کر کہا۔ پھر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہی دو مختلف ناقابل فہم انداز میں مسکراتے اور سنجیدہ رہتے۔ لیکن دراصل وہ اس کو بھی نہیں دیکھ رہے تھے پیالا کو لگا وہ اور خیالوں میں کسی سے مخاطب تھے۔

"آپ کی دنیا بہت شاندار ہے۔ لوگ مخلص ہوتے ہیں' سچ بولتے ہیں۔ سچی محبت کرتے ہیں اور سچی نفرت' ایمان دار ہیں۔ حق گو ہیں۔ کسی پر ظلم نہیں کرتے' بلکہ ظلم ہونے بھی نہیں دیتے اور دنیاداری کے ہر جھمیلے سے آزاد ہیں۔ سو بی بی تارک الدنیا' پاکیزہ تن اور دوشیزہ' خدا کرے آپ کی یہ احمقوں کی جنت کبھی مسمار نہ ہو۔" انہوں نے غالباً "بطور خاص یہ سارے فقرے انگریزی میں ادا کیے۔

اس نے خاموشی سے ان کی دعاؤں کی طرف دھیان دینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کرسی پر پہلو بدل رہے تھے غالباً "وہ ایک ہی رخ بیٹھے بیٹھے تھک چکے تھے۔ اپنی زخمی ٹانگ کو انہوں نے تھوڑا سا ہلایا۔ پھر اسے تکلیف دہ جھٹکے سے سیدھا کر لیا۔

وہ اپنی بے ساختہ سادگی سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھ گئی۔

"کیا واقعی یہ موچ میرے غلط گھسیٹنے سے آگئی ہے" وہ ان کی زخمی ٹانگ کے نزدیک محبت اور توجہ سے ان کی طرف جھکی ہوئی تھی۔

ان کے چہرے کا وہ تکلیف دہ تاثر یک لخت ہوا ہو گیا۔

وہ گڑھی کے مالک کے بجائے ایک چھوٹے سے معصوم بچے کی طرح نظر آنے لگے تھے۔ بچپن کی شوخی سے بھرپور زندہ دلی سے مسکراتے۔

"اگر آئی بھی ہے تو میں اس موچ کا ممنون ہوں۔"

بے بے نے چونک کر سر اٹھایا۔ شاید مسکرانے کے باوجود دانیال خان کی تکلیف میں ایکا ایکی اضافہ ہو گیا تھا۔

"آپ کا بہت شکریہ۔ آپ سے ملاقات رہے گی۔"

انہوں نے بے پروا لہجے میں اچانک مسکرانے کا سحر توڑ دیا۔ وہ بیزار انداز میں خود سے الجھ رہے تھے۔

اگر بے بے اس کی کہنی پکڑ کر اس کو چلنے کا اشارہ نہ کرتیں تو وہ قیامت تک نہ سمجھ پاتی کہ انہوں نے محفل برخواست کر کے ان کو چلے جانے کا حکم دے دیا ہے۔

✡ ✡ ✡

چمکتی سنہری وادی کا سبزہ ہلکی دھوپ کی روشنی میں دمک رہا تھا۔

پہاڑ کی چوٹی سے وادی ہمیشہ اپنے قدموں میں بکھری گری پڑی نظر آتی ہے۔ جیسے آپ کائنات کی اہم ترین تخلیق ہیں اور ساری دنیا خدا تعالیٰ نے صرف آپ ہی کے لیے پیدا کی ہے۔ طویل اور شدید کشمکش کے ایک پر آزمائش دور سے کامیاب نکلنے کی خوشی آپ کو اس فتح سے دوچار کر سکتی ہے۔

سب کچھ اس کے قدموں میں تھا۔ حتیٰ کہ اخروٹوں کے دیو قامت درخت کی چوٹیاں اس کے پیروں کو چھو رہی تھیں۔ ہلکے پھلکے ہو کر آسمان میں اڑ جانے کی مسرت اس کی رگ رگ میں پہلی دفعہ اتری تھی۔

دانیال خان کے انٹرویو سے بے بے کی رپورٹ تک کے تین دن میں وہ سو بار جی تھی سو بار مری تھی۔ معلوم نہیں دانیال خان نے کیا فیصلہ کیا تھا۔ پتہ نہیں وہ یہاں رہے گی یا اس کی چھٹی کر دی جائے گی۔ پہلے ان سے یہ کشمکش اسی طرح چلتی انٹرویو کے کلائمکس تک آن پہنچی تھی اور دانیال خان نے چالاک منصف کی طرح فیصلے کا حق محفوظ کر لیا تھا کہ تیسرے دن بے بے نے بیسمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر اعلان کیا تھا۔

"دانیال خان کا کہنا ہے۔ تمہاری تنخواہ تم سے پوچھ کر مقرر کر دی جائے اور تم مشرقی حصے سے کام شروع کرو۔"

بے بے کے انداز میں لاپروائی اور بے نیازی سی تھی۔ جیسے انہیں اس واقعے سے بہت زیادہ دلچسپی نہ ہو یا شاید انہیں علم تھا کہ فیصلے میں کتنے بھی دن لگیں انجام کار ایک دن فیصلہ یہی ہو گا۔ انہیں اس کے خوشی سے جھلملاتے چہرے نے حیرت زدہ کیا نہ اطمینان کی گہری سانس نے۔ انہوں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر اس کو کتنی مرتبہ بے تابی سے ٹہلتے اور بے چینی سے پھرتے دیکھا تھا لیکن ان کے چہرے پر ایک غضب کا اطمینان تھا۔ انہوں نے بلا ضرورت زموڑیں اور شیشے کے پٹ چوپٹ کھول کر اس کو دیکھا۔

"موسم ٹھنڈا نہیں؟ تم گرم کپڑے زیادہ نہیں پہنتیں۔ کیا بات ہے اور یہاں سے لانے کرنا میری کوتاہی ہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے پچھلے ماہ کی تنخواہ بھی نہیں دی اور عنقریب وہ سرا مہینہ شروع ہو جائے گا۔ خان اس سلسلے میں مجھ پر برہم ہو رہے تھے۔ وہ اس قسم کی بے پروائیوں کے سخت خلاف ہیں۔ میں نے ان سے معذرت کر لی۔" وہ حیران سی ہو گئی۔ وہ برہمی کا ذکر ایسے کر رہی تھیں جیسے ان کے نزدیک یہ بھی ان کا بہت بڑا انعام ہو اور معذرت کرنا ان کا روزمرہ کا معمول۔

وہ ہمیشہ کی طرح فقروں کی ترتیب اور موضوع کو دھیان میں رکھے بغیر بے ربط بول رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ تم اپنی تنخواہ کے سلسلے میں خود ان سے کہہ دینا۔"

"نہیں بے بے!" وہ بوکھلا سی گئی۔ "مجھے کچھ نہیں کہنا۔ آپ اپنی مرضی سے طے کر لیں اور ان سے کہہ دیں۔"

"نہیں بے بے!" وہ بوکھلا سی گئی۔ "مجھے کچھ نہیں کہنا۔ آپ اپنی مرضی سے طے کر لیں اور ان سے کہہ دیں۔"

"ارے تم بھی دانیال خان سے ڈرتی ہو۔ وہ ڈرنے والے آدمی تو نہیں۔ وہ بہت خوش خلق ہیں۔ چلو خیر میں ہی ان سے بات کر لوں گی۔ تم زیادہ دیر باہر نہیں ٹھہرنا۔"

کھڑکی کے پٹ اس پر بند ہو گئے لیکن قسمت کے کھل گئے تھے۔

وہ کتنی دیر وادی میں اوپر سے نیچے دور تک بہنے والے پہاڑی نالے کی ناچتی گاتی رفتار دیکھتی رہی آج سے دنیا اس کے لیے بدل رہی تھی۔

تین قیامت کے دن گزر ہی گئے اور جتنے دن طول پکڑ رہے تھے اتنا اس کا صبر جواب دیتا جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ اس خوشی کو شیئر کرے کوئی تو ہو جو اس خوشی میں اس کا شریک ہو۔ پہلا خیال اس کے دل میں گوشی کا آیا تھا لیکن گوشی اس خوشی کی خبر کو آسانی سے ہضم کرنے کے بجائے سارے شہر میں اڑتی پھرتی اور نتیجہ یہ نکلتا کہ ایک دن اہل لاہور اس کو پہاڑوں کی اس آزاد فضا سے واپس قید میں بند کر دیتے۔ جہاں اس کی زندگی کے رہے سہے پر سکون لمحات بھی تباہ ہو چکے تھے۔

اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اس خوشی میں شریک ہونے والا جو پہلا شخص اس کو نظر آیا۔ اس کو لگا وہ دراصل اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پہاڑی نالے کی تنگ راہداری جو لمبے راستے سے اوپر تک آتی تھی۔ اس نے کسی موٹر سائیکل سوار کو تیز رفتاری سے اوپر آتے دیکھا۔

وہ اسی رفتار سے نیچے کی طرف دوڑنے لگی۔ اس نے ابھی اتنے قدم نہیں اٹھائے تھے کہ موٹر سائیکل راستہ عبور کر کے اس تک پہنچ گئی۔

"خان گل۔۔۔ مجھے جاب مل گئی۔"

وہ اس کو وادی سے نیچے دوڑتا دیکھ رہا تھا اور دوڑتے ہوئے اس کے چہرے پر پھوٹتی بے تحاشا خوشی بھی اس سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے موٹر سائیکل اس کے نزدیک روکا اور مسکرایا۔

لیکن اس کے پہلے فقرے نے ہی اس کے مسکرانے کا مزا کرکرا کر دیا۔

وہ حیرت سے اس کے خوشی سے سرخ پڑتے چہرے کی خوشی کا مفہوم نکالتا رہا۔

"کہاں مل گئی؟"

"یہیں گڑھی میں اور کہاں۔"

"کیا مطلب؟" خان گل اس کے پاگل پن کو سمجھنے سے بالکل قاصر نظر آ رہا تھا۔

"بھئی میں نے یہاں اپلائی جو کیا تھا۔ دانیال خان نے مجھے سلیکٹ کر لیا ہے۔"

"لاحول ولا۔" اس نے گہرا سانس لیا۔

"تم بھی کیا چیز ہو لیلیٰ!" وہ بے ساختہ ہنستے ہوئے بولا۔ "صرف پہلی ملاقات میں مجھے ایک منٹ کے لیے شبہ ہوا تھا کہ تم عقل مند لڑکی ہو۔ اس کے بعد تم نے مجھے ہمیشہ مایوس کیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ کو میری خوشی سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔"

"خوشی کیسی؟ ہمیں تو یقین تھا آپ کی کامیابی کا اور دانیال خان کی کیا جرات کہ آپ کو ریجیکٹ کریں۔" وہ اپنی کامیابی پر ہنس دی۔ واقعی کبھی کبھی ہم اپنے آپ کو کتنا کمزور تصور کرتے ہیں۔

"یہ کیسی پرکشش جگہ ہے خان گل۔" اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بے خودی کے سے عالم میں کہا تھا۔

"اتنی جلدی میں یہاں سے چلے جانے کے تصور سے پریشان ہو رہی تھی۔ حالانکہ مجھے ابھی یہاں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ پھر بھی ایسا لگتا ہے جیسے میں یہاں ہمیشہ سے رہتی تھی۔ یہ پہاڑ، یہ سبزہ، دریا اگر ایک لمحے کے لیے بھی میں اس وادی سے الگ ہونے کا تصور کروں تو مجھے خوف آنے لگتا ہے۔"

"کہیں یہ جنموں والا چکر تو نہیں۔" وہ خوش خلقی سے ہنس پڑا۔

"تم کتنے غیر سنجیدہ ہو خان گل۔" اسے سخت مایوسی ہوئی۔ ابھی بھی اس پر ایک موڈ طاری تھا۔ خان گل نے اپنی طبیعت کے مخصوص مظاہرے سے اس کا سارا مزا غارت کر دیا۔

وہ جھنجلا کر بولنے لگی۔ "تمہیں اس وادی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ شاید یہ محل تمہیں پسند نہیں اور محل کے لوگ تمہیں پسند نہیں۔ اس لیے یہاں سے بھاگے پھرتے ہو۔ اصل بات یہ ہے جو چیز آپ کی دسترس میں ہو اس کی آپ کو پروا نہیں رہتی اور تم کہاں پھرتے رہتے ہو۔ آخر یہاں ٹھہرتے کیوں نہیں۔"

اس نے اس کے جھنجلانے کا مزا لینے کے برعکس نہایت سکون سے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا۔

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا یہ میرے دسترس میں ہے۔ ہاں شاید اسی لیے مجھے اس سے نفرت ہے۔ کہ یہ میری دسترس سے باہر ہے۔ محل میں رہنے والوں سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو ہمدردی کیے جانے کے مستحق تو یہی لوگ ہیں۔ تنہا، بے یار و مددگار اپنی ذات کے قیدی۔ رہی آپ کی آخری بات تو آپ نے کبھی خواہش کا اظہار ہی نہیں کیا۔ ورنہ ہم یہیں رہ پڑتے۔ کیونکہ بہرکیف اس محل میں قید کرنے کے لیے آپ کو تو رکھا نہیں گیا۔"

وہ خاموشی سے حد نظر تک بکھرے سبزے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نظر خان گل کی طرف دیکھا اور معذرت سے مسکرا دی۔ وہ موٹر سائیکل تھامے اسے وضاحتیں صفائیاں پیش کر رہا تھا۔ جیسے وہ یہاں معزز مہمان کی حیثیت سے لائی گئی تھی۔ جیسے اس کا کام ہمہ وقت اپنی عزت کروانا، اپنی خدمت کروانا ہو۔ وہ ہلکے سے مسکرا دی۔

"میں سوچ رہی تھی۔ تم آؤ گے تو ان سارے علاقوں میں خوب گھوم پھر کر دیکھوں گی۔ دراصل اس کھڑکی سے صرف ایک ہی رخ نظر آتا ہے اور وہ میں دیکھتے دیکھتے اکتا گئی ہوں۔"

"واہ صاحب اور ابھی دھوم دھڑکے سے اس وادی سے اظہار عشق کر کے آپ اس وادی سے ہی ہمیں حسد میں مبتلا کیے دے رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے اکتاہٹ کا اظہار۔"

وہ ایک مدت بعد پھر جھوم کر ہنسی تھی۔ کھل کر ہنسی تھی۔

جب خوشی اندر ہو تو ہر بات سہانی لگتی ہے۔ ہر چیز انسونی۔ وہ خان گل کی تقریر کے جواب میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تم لوگ آخر اتنی مشکل اردو کیسے بول لیتے ہو؟"

"لوگ؟ کون لوگ؟" اس کو اچنبھا سا ہوا۔

"تم۔ بے بے۔ دانیال خان۔"

"تو دانیال خان کی اردو روانی کی آپ بھی قائل ہو ہی گئیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ وہ لوگوں کو اپنا قائل کر ہی لیتے ہیں۔"

بیلا نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب انداز میں اپنے بھائی کی بات کر رہا تھا۔ وہ کچھ سمجھنے سے قاصر ہی رہی۔

یہ ایک تکلیف دہ موضوع تھا۔ وہ ان کے آپس کے جھگڑوں سے الگ ہو کر پہاڑوں پر اگے ان بے شمار شگوفوں میں گم ہو جانا چاہتی تھی اور یہ اتفاق تھا یا اس کی خواہش کا احترام کہ اگلے دو دن خان گل گھڑی ٹھہرا تھا۔ ہمہ وقت اس کو اپنی خوشگوار کمپنی سے نوازتا ہنساتا رہتا۔

بے بے آتش دان کے پاس اپنا کروشیا سنبھال کر نسبتاً "نچلی سیٹ پر بیٹھی بنائی میں مصروف رہتیں وہ دونوں ان کے آس پاس ہوتے۔ کبھی نیچے قالین پر بیٹھے تاش پھیلا کر آپس میں جھگڑتے رہتے۔ ان کی چڑیا کی دکی سے حکم کے یکے تک ہر پتے پر جان جاتی۔ بے بے آنکھ اٹھا کر ان کو تاش کے پتوں پر چھینا جھپٹی کرتے دیکھتیں۔

پھر وہ کیرم لے کر آ بیٹھتے اور کالی سفید گوٹیوں کی خاطر ایمان جیسی قیمتی چیز ملیا میٹ کیے ڈالتے۔ وہ خاموشی سے مسکرا کر چپ ہو جاتیں۔ یہ خوب صورت سا گھریلو ماحول ان کو قسمت سے نصیب ہوا تھا۔ اسی لیے وہ اس کے لمحے لمحے کو تعویذ میں لپیٹ کر سنبھال لینا چاہتی تھیں۔ یہ بیلا ہی تھی۔ وہ جانتی تھیں۔

جس نے اس گھر کو گھر بنایا تھا۔ جس نے اس چھت کے نیچے پہلی دفعہ لوگوں کو ہنسنا سکھایا تھا۔ خود ہنس کر دکھایا تھا جو دکھوں کی بات اس توجہ سے اور محبت سے سنتی تھی جیسے کوئی دلچسپ قصہ سنا جاتا ہے۔ بے بے نے ایک طویل اور گہرا سانس لیا۔

ایسے طویل طویل گہرے سانس ان کی شخصیت سے چمٹ گئے تھے۔ وہ خود ہی خواہشوں کے جال بنتی تھیں۔ خود ہی موتیوں کی طرح ڈور در ڈور میں اپنی مرضی سے لوگوں کو پروتیں پھر ایک جھٹکے سے ان کا جال بکھر جاتا۔ لڑیاں ٹوٹ جاتیں اور قیمتی موتی یوں ہی ادھر ادھر رلتے پھرتے۔

پھر ایک طویل اور ٹھنڈی آہ وہ ان لڑیوں کی بربادی پر بھرتیں۔

یہ ان کے اپنے خواب تھے۔ ان کی اپنی خواہشوں کے طلسم تھے وہ ان کے تصور کی ڈوری تھی۔ ہولناک سے واہمے ان سب کو ملیا میٹ کر دیتے۔ سب کچھ برباد ہو جاتا۔ سوائے اسی ایک آہ کے اور انہوں نے کیا ہی کیا تھا۔ ان کی آنکھیں مسلسل بربادیوں کی داستان سناتی تھیں۔

پھر ان کے مشترکہ جھگڑے کی چیخ چیخ ان کو چونکا ڈالتی۔

کبھی خان گل سارے ہتھیار پھینک کر صلح کے موڈ میں آ جاتا۔ اچانک وہ تاش اور کیرم کی ساری بازیاں ہار جاتا۔ یہ رضا کارانہ نورا کشتی بیلا کے دل کو بھاتی بھی نہیں تھی۔ خیرات کی جیت کے بجائے طاقت سے لڑ کر حاصل کی ہوئی جیت اصل خوشی ہے۔

اسی ایک دن میں انہوں نے خالی زمین کی کھدائی کر کے ایک نسبتاً "ہموار زمین کے ٹکڑے پر بیڈ منٹن کورٹ بنا لیا تھا۔ یہ قسمت ہی تھی کہ بے بے نے اسٹور سے ریکٹ اور شٹل کاک کے کین نکال دیے۔ ان ڈور گیمز سے اکتا کر وہ سارا دن اپنا کورٹ چمکاتے رہے۔ عمارت کے نشیب میں ایک خوشگوار سے قطعہ پر یوسف خان کی ہمراہی میں وہ اتنی سنجیدگی سے لان کی تیاری میں مصروف رہے جیسے یہاں کوئی بین الاقوامی مقابلہ منعقد ہو رہا ہو۔ چونے کی لائن ہموار کرتے اس نے ایک نظر دیکھا۔

سامنے وہی پر جلال اور پر شکوہ عمارت۔۔۔ اپنی ذات میں اسی وقار سے سربلند کھڑی تھی۔

دائیں طرف اوپر کی منزل میں لہرانے والے براؤن پردے لائبریری کی کھڑکی سے جھانک رہے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکے سے پردہ باہر آ جاتا۔ کبھی اندر کو ہو جاتا۔ لائبریری کی یہ کھڑکی جو مشرق کے رخ کھلتی تھی جہاں صبح سویرے سورج کی اولین کرنیں داخل ہوتی تھیں۔ (اگر سورج نکل آئے)

لائبریری میں اس وقت کوئی کام ہو رہا تھا۔ تبھی یہ ہمیشہ کی بند کھڑکی کھلی نظر آ رہی تھی۔ معلوم نہیں اس وقت لائبریری میں کون ہو گا نہ چاہتے بھی اس نے کام روک کر کھلی کھڑکی کے سرسراتے پردوں کی طرف دیکھا۔ پری نے بتایا تھا۔ مالک اپنی لائبریری میں کسی کو گھسنے نہیں دیتے۔ اس وقت ان کی لائبریری میں جو بھی ہے یقیناً "وہ مالک کے بہت قریب رہا ہو گا۔

فرسٹ فلور کی لائبریری کے نیچے گراؤنڈ فلور پر ان کے آفس ہیں۔

اور آفس کے نیچے بیسمنٹ تھا۔ وہ اتنے نشیب میں تھے کہ ان کے تہہ خانے کا vent وہ یہاں سے دیکھ سکتی تھی۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں اس کی تقدیر کا سب سے اہم فیصلہ اس کے حق میں ہوا تھا۔

اس کی تقدیر میں اور کیا تھا" یہ کون بتا سکتا تھا۔

"کیا کر رہی ہو؟ ساری لکیریں ٹیڑھی کر دیں۔" خان گل کی بد مزاجی نے اس کو چوکنا کر دیا۔ خان گل نے بڑے اہتمام سے انچی ٹیپ سے ناپ ناپ کر اور کھیلوں کی مقرر کردہ کتاب سے پڑھ کر اس میدان کے گز فٹ پورے کروائے تھے۔ اس نے بے دردی سے چونا پھیرتے اس کی محنت پر ذرا بھی دھیان نہ دیا۔

وہ بے ساختہ ہنس دی۔ اس کی ہنسی بہت بے ساختہ تھی۔ شاید اسی لیے ہمیشہ دلکش لگتی تھی۔ خان گل غصے میں بھرا پھاوڑا اٹھا کر اس پر لپکا تھا۔ بجائے شرمندہ ہونے کے اس کو ڈھیٹوں کی طرح ہنستے دیکھ کر وہیں ٹھٹک گیا۔

"ہمیشہ خوش رہو۔" اس نے بزرگوں کی طرح دعا دی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے گم صم سا ہو گیا تھا۔

"ذرا پرے ہٹو۔" اس نے پھاوڑے کی لکڑی سے اس کو ایک طرف دھکیلا۔

"اتنی محنت سے نشان لگایا تھا۔ پتا نہیں کہاں گم ہو گیا۔" اس نے بد مزاجی کے حصار میں دوبارہ گم ہو کر چونے کے ڈھیر میں لکڑی سے ٹٹولا۔ "دینا ذرا ٹیپ"

کام پھر الجھ گیا تھا۔ معلوم نہیں کھیل کب شروع ہو گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ خاموشی سے گھاس پر چوکڑی مار کر گنے کا رس دانتوں سے چوسنے لگی۔ کئی گھنٹوں کی محنت شاقہ کے بعد لان کھیل کے لیے تیار ہوا تھا۔ ملازمین کی چھٹی ہوئی۔ خان گل دوڑتا ہوا اندر گیا اور ٹریک سوٹ اور جوگرز میں۔ مقابلہ کے لیے تیار ہو کر لمحوں میں باہر آ گیا۔

"واہ۔ تم نے تو بہت اہتمام کیا ہے۔ اس کا مطلب ہار گئے تو مانو گے نہیں میں نہیں کھیلتی تم بے ایمان ہو۔"

"اس کا مطلب یہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کھیلنا نہیں آتا۔"

"بے بے کو بلاؤ۔ فیصلہ کون کرے گا۔"

"بے بے کے فیصلے کو مانتا ہی کون ہے۔ جانب داری کے فیصلے۔ ان کو اچھی طرح دکھائی بھی نہیں دیتا۔"

"اس کا مطلب سوچ آئے ہو کہ ایمان داری سے نہیں جیتنا۔" وہ وہیں بھی ڈھٹائی سے جھگڑتی رہی۔

"ایمان داری سے کون کسی کو جیت سکا ہے بی بی۔" اس نے فلسفے کا گہرا موڈ طاری کر کے ٹھنڈی آہ بھری۔

"چلو بلاؤ اپنی بے بے کو آج دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے۔"

بے بے بہت دیر سے آئیں۔ ناہموار زمین پر ان سے آسانی سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ یوسف خان ان کی کرسی اٹھائے اٹھائے پول کے ساتھ زمین پر ان کی کرسی جما دی۔ وہ بمشکل گھٹنوں کو سہارا دیے کرسی کے پاس آ کر رک گئیں۔ انہوں نے ایک نظر عمارت کی طرف دیکھا۔ ذرا جھجک کر بیٹھ رہیں۔ گیم مکمل ہونے سے پہلے کھانا سرد ہو گیا۔ بے بے نے تمام ضابطے اور قوانین طاق پر رکھ کر گیم ختم کر ڈالی۔

"چلو چلو چھوڑو باقی آ کر کھیلنا۔" وہ اس وقت بارہ آٹھ پر تھے اور ان کی نظر میں ان کی سارا دن کی محنت کی یہ اہمیت تھی۔

"کھانا لگ گیا ہے ٹھنڈا ہو جائے گا۔" بیلا نے تابعداری سے ریکٹ اچھال دیا۔ اس نے کبھی بھی بے بے کی حکم عدولی کی ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی ان کا دھیان گیم کی طرف تھا ہی نہیں۔ گھٹنوں پر پڑے کمبل کو، زمین کی گھاس کو آسمان میں اڑنے والے پرندوں کو، انہوں نے ہر طرف دیکھا تھا۔ صرف شٹل کاک کی طرف ہی نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ دونوں جھگڑ پڑتے تو چونک کر گیم کی طرف دیکھتیں۔

"اب بس بھی کرو۔"

وہ سست روی سے قدم اٹھاتیں عمارت کی طرف چل پڑیں۔

وہ ریکٹ شٹل کاک اٹھاتے لڑتے جھگڑتے ان کے پیچھے پیچھے۔

☼ ☼ ☼

"شیریں کا خط آیا تھا۔"

بے بے نے کھانے کے کمرے میں ایک غیر معمولی وقفہ دے کر گویا کوئی اہم انکشاف کیا۔ خان گل کا چمچہ اور کانٹا ایک تیزی رفتار میں چلتا چلتا رک گیا۔

"اور اس میں لکھا ہے مجھے ان کو لینے کے لیے فوری طور پر پشاور آ جانا چاہیے۔"

"یہ میں نے کب کہا ہے" بے بے نے تیزی سے اس کی طرف دیکھا۔

"خان گل تمہاری طبیعت میں بہت زیادہ اشتعال آتا جا رہا ہے۔"

اچانک موضوع اور حالات سنجیدہ ہو گئے تھے۔ وہ خاموش ہو گئی۔ یہ ان کا گھریلو مسئلہ تھا۔ اور یوں بھی ان دونوں نے پشتو میں جھگڑنا شروع کر دیا تھا وہ خاموشی سے موٹی موٹی روٹیوں کے نوالے توڑتی رہی خان گل تیزی میں جھگڑ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بیلا نے دیکھا۔ اس نے بے بے کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے دوبدو لڑنا پسند کیا تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں بار بار دانیال خان کا نام لے رہا تھا۔ پھر وہ کھانا ادھورا چھوڑ کر اٹھ گیا۔

بے بے غصے میں بھری بیٹھی رہیں پھر انہیں ملال ہونے لگا۔ "پتا نہیں اس نے روٹی پوری کی یا نہیں۔ کھانے کے وقت مجھے یہ قصہ نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔"

انہوں نے ایک دو نوالے کھا کر پلیٹ آگے کھسکا دی۔ "دانیال خان۔ دانیال خان۔ ہر بات میں دانیال خان۔ اس کا قصور؟"

وہ چپکی رہ گئی۔

یہ دو دن بہت اچھے گزرے تھے اور اچھے دنوں کا اتنی جلدی گزرنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

اسے یقین تھا وہ دوپہر میں ہی کہیں غائب ہو جائے گا۔ اور وہ کہاں غائب ہوتا ہے آئندہ اب جب وہ آئے گا تو وہ اس سے معلوم کرنا نہیں بھولے گی۔

اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔

وہ دوپہر کے بعد بیڈمنٹن کورٹ گئی۔ تو وہ وہاں نہیں تھا۔ مالی کے بچے چونے کی سیدھی قطاروں کے ساتھ ریل بنا کر دوڑ رہے تھے۔ وہ ان کا انجن بن گئی۔ یہ کھیل بڑے مزے کا تھا۔ مالی کے بچوں نے ریل دیکھی آس پاس اچانک بچوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ وہ ملازموں کے بچے تھے اور غالباً "آس پاس ہی کہیں موجود تھے۔ اس نے بیڈمنٹن کھیلتے بھی ان بچوں کو دیکھا تھا" وہ بہت تمیزدار تھے یا بہت ڈرے ہوئے تھے وہ نہایت خاموشی سے چونے کی لائن کے اس طرف ٹھوڑیوں کے نیچے ہاتھ رکھ کر پھسکڑا مارے بیٹھے رہے۔

انہوں نے ایک بی بی کو ریل کا انجن بنتے دیکھا تو ٹرین لمبی کر لی۔

وہ دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی۔

اردگرد بچوں کا جمگھٹا جمع کر کے۔

"اچھا یہ تو بتاؤ تم میں سے کسی نے ٹرین دیکھی ہے۔"

ایک لڑکے نے اپنا ہاتھ اونچا کیا۔ "ہم نے دیکھا ہے۔ ہم لنڈی کوتل گیا تھا۔"

باقی لوگوں کے نزدیک وہ کولمبس تھا۔ دنیا گھوم آیا تھا۔ وہ اس کی ہر بات پر ایمان لاتے تھے۔ اس نے بتایا گھوڑے کے پیچھے کیسے گاڑی چلتی ہے۔ وہ کراچی گیا تھا اس نے سمندر بھی دیکھا تھا۔ وہاں دیگیں تھیں اور آسمان پر اپنی آنکھوں سے جہاز اڑتے دیکھے۔ لیکن وہاں اتنی گرمی تھی کہ اس کے جسم پر لال دانے نکل آئے۔ اس لیے افسوس وہ زیادہ دیر یہ دنیا نہیں دیکھ سکا۔

ان کا تلفظ برا تھا۔ وہ بمشکل اردو بولتے تھے یا سمجھتے تھے۔

"اچھا میں تمہیں سمندر کی کہانی سناتی ہوں۔" وہ کہانی کا ذکر سن کر اس کے اردگرد آ بیٹھے۔ اس نے گھیر کر لمبی سی کہانی سنائی اور چوہے بلی کی نظم۔ وہ نظم سے زیادہ اس کی حرکات و سکنات پر قہقہے لگاتے رہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک دفعہ ختم کرنے کے بعد انھوں نے فرمائش کرکے بار بار سنی۔ باجماعت خود بھی پڑھی۔

اور اس وعدہ پر ان سے جدائی قبول کی گئی کہ وہ ہر روز ان کو یہاں پر ایک نئی کہانی اور نئی نظم سکھائے گی۔ اس کام کے لیے ہیڈ منٹن کورٹ کے نیچے پتھروں کی قطار کو جماعت کا درجہ دیا گیا۔ اور وقت بعد از ناشتا مقرر ہوا تھا۔ وہ کھانے کے بعد مقررہ جگہ پر پہنچی تو جماعت خان گل کی قیادت میں پانی میں پتھر مار رہی تھی۔

"تم گئے نہیں؟ میں تو سمجھی تم کہیں چلے گئے۔"

"کہاں؟"

"مجھے کیا پتا جہاں بھی جاتے ہو۔"

وہ ہنس پڑا۔ "ہاں اچانک جانا پڑا بے بے نے بھیج دیا۔ لیکن زیادہ دور نہیں صرف شیر کی کچھار تک۔"

وہ چپ ہو گئی۔

"اب میں کل کی گیم مکمل کرنے آیا تو پتا چلا۔ ساتھی بھی بدل گئے اور ہمراہی بھی۔"

"یہ کون لوگ ہیں خان گل؟" اسے اس کی باتوں کی ایسی عادت سی پڑ گئی تھی کہ اس نے ہنسنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

"کون لوگ ہیں۔ ہمارے لوگ ہیں۔ ہماری بستی کے لوگ۔"

"آپ کا مطلب آپ کے ملازموں سے؟"

"ملازم بھی ہوں گے ان میں اور آزاد بھی۔ گڑھی عیسیٰ خان کے اصلی باشندے تو یہی ہیں جو گڑھی پر جان دیتے ہیں۔ اس کی خاطر لڑتے ہیں۔ کٹتے ہیں۔ قتل ہوتے ہیں۔ نیچے ان کی بستی ہے۔"

"میں نے یہاں کے عوام کی بستی تو دیکھی نہیں۔" وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ "میں نے سوچا یہاں صرف"

"آپ نے سوچا یہاں دانیال خان، گل خان اور بے بے رہتی ہیں۔ الا الآخر صلا۔"

"اور شیر بھی۔" اس نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر گستاخی نہ ہو تو آپ کی اس ادا کا مفہوم پوچھ سکتا ہوں۔"

بیلا نے دیکھا وہ جما کھڑا ہوا۔ غصہ میں اکڑا اور پھیلا ہوا۔ تکرار فضول تھی اور ناحق بحث کا اسے شوق نہیں تھا۔

"میرا دل چاہتا ہے خان گل میں تمھاری بستی کے اندر جاؤں۔"

خان گل ہچکچا کر خاموش ہو گیا۔ معلوم نہیں وہ معاملات کی کس نوعیت پر غور کر رہا تھا۔

"تمھارے لوگ میرا آنا پسند نہیں کریں گے۔" اس نے خود ہی اس کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی۔

"ناپسندیدہ بات اگر کوئی ہے تو صرف اتنی کہ۔ اگر تم ان کے لباس میں ان کے درمیان جاؤ۔ جیسے ان بچوں نے لباس پہن رکھے ہیں۔ گھیر دار شلواریں خوب پھولی ہوئی فراکیں اور اس میں ہر رنگ ہونا چاہیے۔"

"اس کا مطلب تم لوگ باہر کے لوگوں کو ہضم نہیں کرتے۔ شاید یہی وجہ ہے جب بھی میں باہر نکلتی ہوں قیمت خان — مجھے اندر دھکیل دیتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے تم اتنے متعصب ہو۔"

"ہم بہر کیف۔ جو کچھ بھی ہیں تم ہمیں منٹوں کی تقریروں سے بدل نہیں سکتیں۔ بہتر ہو گا تم بھی اپنا لباس

بدل لو۔

اندر سے تمھیں کوئی بھی ایسا لباس لا دے گا۔ جو نسبتاً "ڈھلا ہوا ہو گا۔"

وہ بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اسے بے بے سے اجازت بھی لینی تھی۔ اور پری گل سے لباس۔

اور اتفاق سے ان دونوں کے حصول میں اسے چنداں دشواری نہیں ہوئی "عادتاً" اس نے وہ سرخ اور میرون جوڑا استری کیا اور نہا کر پہن لیا۔ پری کے اصرار پر بھی وہ اپنی بالوں کی گت بنوانے پر تیار نہ ہوئی۔ وہ جیسے بھی تھی کی۔ ایسی ہی ٹھیک ہے۔ بالوں کو برش کرکے اور جوکر زچڑھا کر وہ بستی کی سیر کے لیے تیار تھی۔ پری ہاتھ میں کنگھی پکڑے اس کی مینڈھیاں بنانے کی حسرت دل میں لیے رہ گئی۔ مریم اور پری دوپٹہ منہ دبا کر ہنسنے لگیں۔ پری کا مزاج البتہ تعلیم یافتہ گھرانوں کی طرح برداشت کا مادہ لیے ہوئے تھا۔ وہ یونہی ہنستی تھی۔ مذاق اڑاتی تھی۔ اس کے نزدیک وہ کسی اہم سیاسی مہم پر جا رہی تھی۔

علاقائی لباس میں سنبھل سنبھل کر پہاڑی پتھروں سے راستہ بناتی وہ اس قدر مسخری لگ رہی تھی کہ خان گل اس کو دیکھ کر بے تحاشا ہنس پڑا۔

"یہاں سے اگر کوئی لڑکی ساڑھی باندھ کر تمھارے شہر چلی جائے۔ تو ایسی ہی لگے گی۔"

وہ خاموشی سے اس کے ساتھ نیچے اترنے لگی۔

"پتا نہیں۔ تم نے سچ بولا تھا یا جھوٹ۔ مجھے شک پڑتا ہے۔ آخر شیریں وغیرہ بھی تو عام کپڑوں میں گھومتی ہیں۔"

"انھوں نے بستی دیکھی ہی کب ہے۔" اس نے بات کاٹی۔

"اور معاف کرنا ہمیں نیچے پیدل جانا پڑے گا۔ میں تمھیں موٹر سائیکل پر بٹھانے کا رسک نہیں لے سکتا۔ اس گھیر دار کپڑوں کے ساتھ۔"

"ایک بات بتاؤں خان گل۔" اس نے بستی کے بہت قریب آکر کہا۔

"میں نے یہ کپڑے پہلی دفعہ نہیں پہنے۔ بہت پہلے بھی ایک مرتبہ ہمارے کالج میں کلچرل شو ہوا تھا۔ میں نے سواتی لباس پہنا تھا۔ اس میں اسی طرح شیشے لگے ہوئے تھے۔ گھیر دار کرتا اور شلوار جب میں کالج کے اسٹیج سے گزری تو میری پرنسپل نے مجھ سے کہا کہ اگر تم سوات چلی جاؤ تو وہاں شاید لوگ تم کو پہچان نہ سکیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے ہم دور بیٹھ کر کیا کچھ سوچ لیتے ہیں۔ حالانکہ اس کا سچائی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ حالانکہ مجھ میں اور تم لوگوں میں اتنا فرق ہے... کہ تمھاری بستی کے بچے بھی انگلی اٹھا سکتے ہیں۔"

وہ اداس سی لگنے لگی تھی۔ معلوم نہیں اس کلچرل شو پر۔ ماضی پر یا ناصلوں پر۔

بستی بالکل نیچے پہاڑوں کے دامن میں کھری کچی نیچی کچی آبادیوں پر مشتمل سامنے نظر آنے لگی تھی۔ اور ان بستیوں سے بہت اوپر خان گل کے گھر کی قلعہ نما برجیاں اور بلند اور اوپر نظر آ رہی تھیں۔ جیسے ان کی اونچائی آسمان میں سوراخ کرتی اوپر نکل گئی ہو۔

"اس کے باوجود ہم ساتھ ہیں۔ اگر فرق ہوتا تو ایک حد دمالیہ پہاڑ ہمارے درمیان بھی حائل ہوتا۔"

بستی کے گھروں کی چھتیں سیدھی اور سپاٹ تھیں۔ انھوں نے پہاڑوں کی اوٹ میں بھاری پتھروں سے اپنے تنگ تنگ اور سیدھے مکان بنا رکھے تھے۔ جو انھیں پہاڑوں، جانوروں اور سرد ہوا سے محفوظ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رکھتے تھے۔ عام پہاڑی مکانوں کی طرح ان کی چھتیں ڈھلوانی نہیں تھی۔ اور گھر کے سامنے پہاڑوں کی ڈھلوانوں میں بے شمار درخت اور پودے اگے ہوئے تھے۔

وہ جس جس گھر میں داخل ہوا۔ اس کا فقید المثال استقبال ہوا۔ وہ لوگوں کی زبان کا انگریزی میں ترجمہ کرتا۔ ان کے جذبات کی ترجمانی کرتا رہا۔

وہ محل کے واقعات سے بے خبر تھے۔ وہاں کون دشمن ہے کون دوست ہے۔ کون سی سازش کس کے خلاف ہو رہی ہے۔ وہاں کی دنیا میں ان کے لیے کیا سوچا جا رہا ہے۔ ان کو صرف اسی بات سے دلچسپی تھی کہ کس وقت اور کس حکم پر ان کو مالکوں کے لیے جان لٹانی ہے۔ ان کے گھروں میں عجیب عجیب ہتھیار تھے۔ ہر سائز اور ہر قسم کی پستول اور گن ان کی دیواروں پر لٹکی ہوئی تھی۔ ان کے گھروں کے دروازے پر گھوڑے کی نعل لٹکی ہوئی تھی۔ وہ حیرت سے آنکھیں کھولے ہر چیز کو حیرانی سے دیکھتی اور مسرت سے خوش ہوتی رہی۔ یہ سب چیزیں اس کے لیے بالکل نئی تھیں۔ جیسے وہ خواب میں کوہ قاف آ گئی ہو۔ نیلی پیلی پریوں کے دیس۔

ایک چھوٹی سی ڈسپنسری تھی۔ ایک منا سا اسکول تھا۔ دو چار دکانیں تھیں اور بس۔

بستی کے لوگوں کو پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ دو سال پہلے کسی ماسٹر کا یہاں تقرر ہوا تھا۔ لیکن وہ آیا نہیں۔ کوئی استانی آئی چند مہینے پڑھا کر وہ بھی چلی گئی۔ بچوں کو پڑھنے کا بے تحاشا شوق تھا۔ لیکن یہاں پڑھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اور تو اور وہاں بچوں کو قرآن پڑھانے کے لیے کوئی عالم دستیاب نہیں تھا۔ جس کسی کو دور دراز کے علاقوں سے بلا کر رکھا جاتا۔ وہ موسم کی سختیاں اور راستے کی دشواری اور بچے کی کند ذہنی سے اکتا کر چلا جاتا۔

اسے خان گل رواں تبصرے کی طرح بستی کی رپورٹ دے رہا تھا۔

اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک متحرک فلم چل رہی تھی۔ جیتی جاگتی زندہ فلم۔ اوپر سے بہہ کر آنے والے دریا کا یہاں نشیب تھا اور کتنی دور تک بستی میں پانی سیدھا اور صاف بہتا چلا جاتا تھا۔ وہ استعمال کا پانی بھی یہیں سے بھرتے اور کپڑے بھی یہیں آکر دھوتے تھے۔ وہ لوگوں سے ان کی خیریت پوچھتا۔ ان کے حالات معلوم کرتا گویا رعایا پرور بنا ہوا تھا۔

پہاڑی نالے کے اس طرف بہت سی عورتیں اس کے لیے دست کاری کی چیزیں لائیں۔ چھوٹے موٹے تحائف آئے۔ لاتعداد افراد پر مشتمل ایک مجمع اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔ مجمع کا کوئی شریف النفس کہنی مار کر منع کرتا اور سمجھاتا۔ ایک وقت میں ایک سوال کرو۔ یا ان کو پٹھانی نہیں آتی اردو بولو۔

یہ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا اس میں خوب اس کا دل لگا ہوا تھا۔ اچانک مجمع میں کھسر پھسر کا شور اٹھا اور اس کے دیکھتے دیکھتے مجمع نے اپنی گردنوں اور وفاداریوں کا رخ موڑ دیا۔ مجمع کی اٹھی ہوئی گردنوں کے ساتھ اس نے بھی اپنی گردن گھمائی اور رک گئی۔

پتا نہیں وہ اتنی بے خبر کیسے تھی کہ اس نے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نہ سنی۔

نہ سر پر آکر گھوڑا رکنے کی آواز۔

نہ دانیال خان کا پکارنا اسے سنائی دیا۔

طلسم حیرت کدہ نے اس کو مسحور سا کر رکھا تھا۔ وہ لوگ گھوڑے سے اترتے دانیال خان کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ اس نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا تھا اور ساکت و ساکن اپنی جگہ اسی طرح جمی رہی۔ وہ کسی بہت ضروری کام سے آئے تھے۔ ان کی تیوری پر ناراضگی کی ہلکی سی شکن تھی اور ہاتھوں میں گھوڑے کی باگ۔

وہ بہت جلدی میں تھے۔ انہوں نے مصروفیت سے مجمع میں تلاش کر کے کسی کو آواز دی اور کام کاج کی ہدایات دے کر اس کو نامعلوم سمت رخصت کر دیا۔

اس کا خیال تھا وہ جس کام سے بھی اس طرف آئے ہیں۔ جلدی اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن انہوں نے لگامیں الٹ کر گھوڑے کی طرف ڈال دیں اور آہستہ روی سے چلتے ان دونوں کی طرف آنے لگے۔

ان کے چہرے کی بکھری ناراضگی پوشیدہ بھی نہیں تھی۔

لیکن وہ اس ناراضگی کا سبب معلوم کرنے میں بالکل نااہل تھی۔

وہ خان گل کی طرف پلٹے اور دھیمے سے مسکرائے۔

"میں ٹال کی طرف جا رہا تھا۔ سنا ہے رات۔ جنگل سے پھر لکڑی کاٹی گئی ہے۔"

"مجھے بھی یہیں کسی نے بتایا ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ افواہ ہے۔ اگر واقعی انہوں نے سارے درخت کی شاخ کاٹی ہے۔ تو ہم چھوڑیں گے نہیں۔"

"اس قدر تند مزاجی سے حاصل؟" انہوں نے ٹھہر کر سکون سے کہا۔

"میں حالات معلوم کر کے بتاؤں گا۔ لوگوں سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا تم نیچے آئے ہو۔"

"یہ بستی دیکھنا چاہتی تھیں۔"

انہوں نے گفتگو میں سے اس کو بے کار شے کی طرح نکال کر پھینک دیا تھا۔ خان گل کے مخاطب کرنے پر بھی انہوں نے ایک غلط نگاہ اس پر نہیں ڈالی۔

"تم ان کو چھوڑ آؤ تو ہم ساتھ ہی چلتے ہیں۔ گھوڑا لے جاؤ۔"

"میں خود چلی جاؤں گی۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

انہوں نے ایک قہر کی نظر اس پر پھینکی جیسے اس ساری مشکل اور مصیبت کی ذمہ دار وہی تو تھی۔ اس کی وجہ سے ہی تو یہ جھگڑا شروع ہونے والا ہے۔ ایک توہین آمیز نظر اس پر ڈال کر وہ اپنے احکامات کی تکمیل کے لیے خان گل سے مصروف کار ہو گئے۔

"چلیے" خان گل نے معذرت سے کہا۔ "آپ کو بستی اچھی طرح گھماتے لیکن افسوس کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں، آپ لوگ جائیے۔ میں خود چلی جاؤں گی، راستہ سامنے نظر آ رہا ہے۔"

"راستہ بہت لمبا ہے شاید آپ کو اندازہ نہیں ہوا۔ اگر گھوڑے پر۔۔۔"

"میں گھوڑے پر ہرگز نہیں جاؤں گی۔" اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

دانیال خان نے اس کو گھورا۔ "ہمیں اور کوئی کام بھی ہے یا صرف آپ کی ہٹ دھرمی کا احترام کیے جاتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ جاؤ خان گل۔ ان کو اوپر چھوڑ کر آؤ' جلدی آنا۔" وہ پلٹ کر اپنے پیچھے خاموش کھڑے شخص سے مخاطب ہو گئے تھے۔

بے تحاشا توہین کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ مرے مرے قدموں سے خان گل کے تعاقب میں چلنے لگی۔ گویا کسی کی عزت اتارنے میں اس شخص کو لمحے لگتے ہیں۔ اس کو ان کا یہ رویہ' انداز تحکم اور شک کرتا سراسر اتا لہجہ سبھی کچھ برا لگا۔

ہمیشہ دانیال خان کی غیر موجودگی میں جھلاتے 'بڑبڑاتے خان گل نے بھی تابعداری سے ان کے ہر حکم کو سنا تھا۔ اور جلدی آنا جیسے مشکوک لفظ پر احتجاج کیے بغیر اور کسی ناراضگی کا اظہار کیے بغیر وہ اس کے حکم کے سبب اس کو واپس چھوڑنے جا رہا تھا۔

"میں چلی جاؤں گی خان گل۔ تم جاؤ۔"

پہاڑی کے موڑ پر جہاں بستی پہاڑی اوٹ میں چلی گئی تھی۔ وہ رک گئی۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے خوش خلقی سے مہمان نوازی نبھائی۔

"تم میری وجہ سے اپنا نقصان مت کرو۔" وہ دونوں ہاتھ سے گھیر سنبھالتی اترتی اوپر نکل گئی۔

اس نے پہاڑی چوٹی سے بھاگتے بھاگتے رک کر دیکھا۔

اس کو خان گل کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ اونچی پہاڑیوں سے بہت نیچے وادی میں گھوڑے کے پاس کھڑے شخص کو اس نے اچھی طرح پہچان لیا۔ وہ دونوں ہاتھ پشت پہ رکھے گردن اٹھائے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گو وہ اس کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن اپنی ذات سے اس کی ناگواری کو یہاں تک محسوس کر سکتی تھی۔ پہاڑی کے اگلے موڑ سے گزرتی کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ بستی ختم ہو گئی۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کبھی کبھی ہم بلندی سے نیچے کی طرف دیکھتے ہیں تو پستی میں کھڑے لوگ ہمیں حقیر کیڑے مکوڑے لگتے ہیں۔ لیکن تقدیر یہ ہے کہ آپ بلندی پر کیڑے مکوڑوں سے اہم نہیں۔ اس کو اپنی ذات کی تحقیر گوارا نہیں تھی لیکن اس کے پاس اس کا کوئی حل بھی تو نہیں تھا۔ اس کو یہاں رہ کر یہیں کے ماحول کو برداشت کرنا بلکہ خود کو اس میں ضم کرنا تھا۔

اس نے کمرے میں گھس کر کپڑے بدلے۔ بیسن پر کھڑے ہو کر بہتے پانی سے آنکھوں کو چھپکانے کی بھرپور کوشش کی۔

یہ اولین دور کی اولین جھلک تھی۔

ایسی بہت سی پے در پے ہونے والی توہین کا اسے سامنا کرنا ہی ہو گا۔ آنے والے وقت کے لیے خود کو ہمیشہ بہادری سے تیار رکھنا چاہیے۔ وہ بزدل نہیں کہ نوکری چھوڑ کر بھاگ جائے۔

وہ کم ہمت نہیں کہ سخت سست سنتی رہے۔

اور وہ اتنی بدتمیز نہیں کہ جہاں ملازمت کرتی ہے وہاں تابڑتوڑ گستاخیوں سے مالکوں کے دانت کھٹے کر دے۔ اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اس چاردیواری میں اس کا جتنی مرتبہ بھی مالک سے سامنا ہوا وہ اپنی گفتگو قابو میں نہ رکھ سکی۔ اس نے منہ تولیے سے رگڑا۔ بالوں پر برش پھیرا اور خاموشی سے بے بے کے سٹنگ روم میں جا بیٹھی۔

آئندہ زندگی میں اس کو ہر حال میں خود کو صبر و برداشت کی سزا دینی پڑے گی۔

☼ ☼ ☼

"بڑی جلدی واپس آ گئیں۔ خیر ہے نا۔"

"جی۔" وہ وہیں پڑے موڑھے پر غرق ہوتے مختصراً بولی۔

"دیکھ لی بستی۔ اور سنا ہے تم یہاں کا لباس پہن کر گئی تھیں۔ مجھے مریم نے بتایا۔" وہ خوش خلقی سے مسکراتی اس کا جائزہ لینے لگیں۔

"تم نے مجھے دکھایا ہی نہیں۔ یقیناً تم کو اچھا لگا ہو گا۔ تمہاری رنگت بھی ہمارے لوگوں کی طرح سے اجلی اجلی' صاف شفاف' سیدھے سیدھے تیکھے نقوش۔ لوگوں نے کیا کہا۔"

وہ چپ سی رہ گئی۔ لوگوں نے جو کچھ کہا تھا وہ بے بے کو بتانے سے حاصل۔ وہ لمحہ بھر کو بھی دانیال خان کی اپنے اوپر پڑتی حقارت بھری نظروں کو بھول نہیں سکتی تھی۔

وہ شاید اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ کوا مور کے پر لگا کر مور نہیں بن سکتا حالانکہ وہ خواہش کے باوجود اس کو کچھ نہیں سمجھا سکی۔

کتنی دفعہ اس کا جی چاہا موضوع بھٹک کر بھی اس طرف آئے تو وہ اپنی صفائی پیش کرے۔

"ہاں بے بے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "جلدی دیکھ لی۔"

بے بے نے ایک نظر اس کے بدلے بدلے موڈ کی طرف دیکھا۔

"تھک گئی ہو۔"

"جی۔"

"آرام کرو۔" وہ جیسے اشارے کی منتظر تھی۔ خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس چلی آئی۔ پری دوائی کا پوچھنے بھیجی گئی تو اس نے اس کا لباس واپس کر دیا۔ یہ کپڑے جو اسے بلا مبالغہ بے حد پسند آئے تھے۔ اور جن کو پہننے کی تمنا اس کے دل نے کتنی مرتبہ کی تھی' زہریلے جانوروں کی طرح گھناؤنے اور خوفناک لگ رہے تھے۔

وہ کسی کے پیچھے کسی کومپلیکس میں مبتلا ہونے کو تیار نہ تھی۔ ہر شخص اپنی ذات کے حوالے سے خود اعتماد ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں آپ اپنے گھمنڈ میں دوسروں کا اعتماد ریزہ ریزہ کریں۔ رات کے کھانے پر اس نے معذرت پیش کی تو اسے پتا چلا گھر میں کوئی کرائسس آ گیا ہے۔

خان گل بغیر بتائے بڑی دیر سے کہیں غائب تھا۔ حتی کہ قیمت خان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ ان دونوں کرائسس کے لیے دانیال خان سے رجوع کیا تو پتا چلا وہ شام سے آفس میں نہیں ہیں۔

پری دودھ کے گلاس کے ساتھ لمبی کہانی لے کر آئی۔

وہ جانتی تھی وہ کہاں ہو گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا وہ جہاں بھی ہیں اتنے غیر محفوظ نہیں۔ لیکن بے بے کی دہائی نے اس کے بستر پر پڑ کر رونے کا سارا پروگرام کینسل کر دیا۔

وہ صبر سے اٹھی۔ پاؤں میں چپل ڈالے اور بے بے کی دوسراہٹ کو ان کے پاس جا بیٹھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا بے بے کو بتانا چاہیے کہ نہیں۔ ان تینوں کی گمشدگی کی واحد گواہ وہی تھی۔ وہ بے بے کو بتا دے یا خاموشی سے وقت کا انتظار کرے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنا غصہ بھول تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ جہاں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں محفوظ بھی ہیں۔ کتنی مرتبہ اس نے گیٹ کے قریب متعین بندوقیں اٹھائے گارڈ کو جھانک کر دیکھا۔ آسمان کی طرف تنی بندوقیں باہر نکلے ہوئے بہادر سینے اس کو کتنے اطمینان کا احساس دلاتے تھے۔

لیکن آج اس کو احساس ہوا کہ وہ کتنے بے سہارا نہتے نہتے ویران ویران ہیں۔

رات کے بارہ بجے اس کے اعصاب بے بے کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر ناکارہ ہو رہے تھے۔ قریب تھا کہ وہ جنگل والے واقعے کا سارا بھانڈا پھوڑ دیتی کہ اچانک برآمدے میں شور سنائی دیا۔

وہ تینوں شانے سے شانہ ملاتے ایک قدم اندر کی طرف آ رہے تھے۔

کسی نے غالباً ان کو بے بے کے ہراساں ہونے کی اطلاع پہنچا دی تھی۔ بے بے نے اٹھ کر راہداری کی طرف دوڑنے کی کوشش کی لیکن شدید اعصابی دباؤ کے نتیجے میں ان کے گھٹنوں نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ شیشوں کے ساتھ لگی ساکن سی نتیجے کی منتظر تھی۔

ان تینوں نے آپس میں رک کر کچھ بات کی۔ قیمت خان واپس مڑ گیا۔ خان گل سیدھا چلتا اپنے کمروں کی طرف چلا گیا تھا۔ ایک دو لمحوں کے وقفے کے بعد پردہ سرکا کر دانیال خان نے اندر قدم رکھا۔

ان کی پہلی نگاہ شیشے کی کھڑکیوں سے لگی بیلا پر پڑی۔ وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ غالباً ان کو اس سے احترام کی رتی برابر توقع نہیں تھی۔

توقع کے بالکل خلاف دانیال خان کو دیکھ کر بے بے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

وہ تیزی میں چلتے ان کے گھٹنوں کے نزدیک دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔

"کیا ہوا بے بے؟"

"بے بے کم بخت کی زندگی کا فائدہ ہی کیا ہے۔ بے بے ہی کو کچھ ہو جائے۔"

"ہائیں ہائیں۔" انہوں نے بے بے کے جھریوں بھرے کانپتے ہاتھوں کو سہولت سے اپنی مٹھی میں دبا لیا۔

"ہم نے آپ کو پریشان کر دیا ہے نا بے بے! دراصل میں اور خان گل گڑھی بختیار چلے گئے تھے۔ آپ کو پتا ہے عاطف کہ وہ بے موقع تاش لے بیٹھا۔ وقت گزرنے کا پتہ نہیں چلا۔ اب بھی اس نے خان گل کو بطور یرغمال رکھ لیا ہے۔" وہ ان کے قیمتی سلک کے نازک دوپٹے سے آنسو پونچھتے پونچھتے بولے۔

"واقعی غلطی ہماری ہے بے بے۔ لیکن پتا نہیں چلا اتنی رات ہو گئی۔ آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

بے بے اپنے بے ساختہ رونے پر شرمندہ سی ہو گئیں۔

"مجھے کیا پتا تھا خان گل تمہارے ساتھ ہے۔ میں نے سوچا دونوں پتا نہیں۔۔۔"

"آپ نے سوچا ہم دونوں ہی شاید لڑ بھڑ کر۔ میں یا وہ ایسا کر سکتے ہیں بے بے؟ وہ مجھ سے چھوٹا ہے آپ جانتی ہیں میں اس سے نفرت نہیں کرتا تو میں۔۔۔"

"اچھا چھوڑو۔" انہوں نے اس کے کندھے تھپتھپائے۔ "عاطف کی بیوی تو بہت خاطر کرتی ہے۔ کھانا وانا کھایا؟"

"ہاں۔" وہ چونکے۔ "کھانا تو کھا لیا۔ ظاہر ہے۔"

"اور موٹریں تو گیراج میں تھیں۔ تم کس چیز پر گئے؟"

"گھوڑوں پر۔" انہوں نے بے ساختگی میں کہا۔

وہ زیادہ دیر تک رک کر شاید بے بے کا سامنا کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ گرم شال میں لپیٹ کر انہوں نے اپنا سہارا دے کر انہیں اٹھایا۔

"آئیے آپ کو کمرے میں چھوڑ آؤں۔"

وہ اسی طرح راہداری میں کھلنے والی طویل القامت شیشوں والی کھڑکی کے پاس دم بخود سی کھڑی تھی۔

"بیلا! تم بھی آرام کرو۔" بے بے نے رواداری سے کہا تھا۔

اس کے نزدیک سے گزرتے دانیال خان نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا ان کی نگاہوں میں مشکور لفظوں کا ایک سایہ سا لہرایا۔ پھر وہ آگے گزر گئے۔

☼ ☼ ☼

گھڑی کے حساب میں تو صبح ہونے والی تھی کیونکہ رات کا بیشتر حصہ گزر گیا تھا لیکن اس کے سونے کا وقت تو ابھی شروع ہوا تھا۔ وہ بستر پر لیٹ کر سوچتی رہی حالانکہ وہ فوراً سو جانا چاہتی تھی۔

دانیال خان نے یقینی طور پر کسی مصلحت کے تحت جھوٹ بولا ہے۔ وہ مصلحت کیا ہو سکتی ہے۔ وہ بھی بستی والوں کی طرح ان مصلحتوں کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو دن بہت روشن تھا۔ رات والے واقعے کی بدمزگی کسی حد تک ڈھل چکی تھی۔ رات دیر تک جاگتے رہنے کے سبب صبح اٹھنا بھی مشکل سا ہی لگا لیکن اس کو بہرکیف اٹھنا تھا۔ یہ اس کے باپ کا گھر تو نہیں تھا کہ جب تک جی چاہے پاؤں پسار کر سوئی رہے۔ اول اس کا بیڈمنٹن پارٹنر اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ دوم بستی کا ادھورا سدھورا تعارف مکمل کرنے کے لیے آج سے مناسب دن اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ روشن اور چمکدار دھلا منجھا۔

وہ نہا دھو کر تیار ہو کر باہر آئی تو چند لوگ چند پیغامات کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔

نمبر ون پری تھی۔ بے بے نے ناشتہ نہ کرنے کے سلسلے میں تشویش کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا آ کر ناشتہ کریں۔ دوسرے نمبر پر پدرشہ تھی۔ سردار کا پیغام تھا۔ آپ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر لائبریری میں آئیں۔ وہ سن سی ہو گئی۔

سارے منصوبے سارے پروگرام ساری خوشی سردار کے ایک پیغام نے ملیامیٹ کر دی۔

وہ دانیال خان کا سامنا کرنے سے بہت کتراتی تھی۔ وہ ہتک آمیز رویے میں بات کرتے اور مخاطب کی دھجیاں بکھیرتے رہتے۔ الٹے الجھے سوالوں میں الجھا کر دوسروں کو زیر کرنے کا ہنر انہیں خوب آتا تھا۔ لیکن اس کے پاس گنجائش ہی نہیں تھی۔ اسے بہرکیف جانا تھا۔ بے بے کو قطعی فراموش کر کے وہ آہستہ قدموں سے ان کے حصے کی طرف روانہ ہونے لگی۔ خاموش اور طویل راہداری دائیں طرف ان کے کمروں کو مڑتی تھی۔ ان کے استعمال کے تین حصوں میں سے باری باری وہ ہر حصے میں ان کے ہاتھوں زک اٹھا چکی تھی۔ یہ آخری حصہ تھا۔

لائبریری کی گردش کھاتی سیڑھیوں پر تیز تیز قدم اٹھاتے اس کا دل زور زور سے دھڑکتا رہا۔

وہ اتنی کم حوصلہ اور بزدل تو کبھی رہی نہیں تھی لیکن دانیال خان کا سامنا کرتے ہی ان کی صورت کی تندی اور سختی اس کو خوفزدہ کر دیتی۔ کتنی مرتبہ وہ سوچتی دانیال خان کے جملوں کا ایک ہی علاج ہے کہ ان کو منہ توڑ جواب دیئے جائیں لیکن ہمیشہ کی چلتی رہنے والی زبان ان کے سامنے گنگ ہو جاتی لفظوں کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ذخیرے عین حلق میں آکر رک جاتے۔ پھر وہ جھنجھلا جھنجھلا کر جو کچھ کہتی رہتی۔ وہ ان کی دلچسپی کا سبب بنتی تھی۔ وہ جوش میں اٹھ کر وہاں سے چلی آتی تھی۔ کیا کریں گے جان سے تو نہیں مار دیں گے اگر سختی کریں گے تو وہ موم کی نہیں بنی۔ لیکن لائبریری کے نیم وا عظیم الشان دروازے کے سامنے وہ اس طرح ساکت کھڑی تھی جیسے سجاوٹ کے لیے بطور مجسمہ لگائی گئی ہو۔ لائبریری فلائیز کے ذریعے مختلف حصوں میں تقسیم یہاں سے دکھائی دے رہی تھی۔ عین مرکز میں لکڑی کے آتش دان کے سامنے آرام کرسی میں نیم دراز وہ کسی کتاب میں محو تھے۔ آگ کی طرف رخ کیے اس سے بالکل بے نیاز۔

وہ بے آواز قدموں سے بھاری قالین پر پاؤں دھرتی خاموشی سے ان سے ذرا فاصلے پر آکر رک گئی۔

وہ اپنی کتاب میں اتنے محو تھے کہ انہوں نے اس کے سہمے سہمے قدموں کی رکی رکی سی آواز بھی نہیں سنی۔

وہ کتنی دیر کشمکش میں خود سے جھگڑتی رہی۔ اس کو آواز دے کر اپنی مصیبت بلوا لے یا اس کے چونک جانے یا اچانک اس کے اپنی لائبریری میں ہونے کا احساس کرے۔

اچانک انہوں نے کتاب سے سر اٹھایا اور گردن گھمائے بغیر اپنی مخصوص بھاری اور گمبھیر آواز میں جھنجھلا کر کہا تھا۔

"آخر آپ بیٹھتی کیوں نہیں۔" لمحہ بھر کے لیے گردن گھما کر انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"یا کوئی جگہ یہاں آپ کے شایان شان نہیں۔" ان کی آنکھوں میں لپکتے طنزیہ سے کوندے اس کے لیے اب اجنبی نہیں رہے تھے۔ ضرور کوئی بات ان کی خلاف مرضی ہو گئی ہے۔ اور اب جب تک وہ اپنی ضد کے سامنے اس کے بخیے نہ ادھیڑ دیں، ان کو سکون نہیں آئے گا۔ اس کا جی تو چاہا وہ ان کے طنزیہ فقروں کا جواب سخت سست فقروں سے دے لیکن یہ بہت مشکل برگ تھا۔ وہ ان کی چھت کے نیچے ان سے احسان فراموشی کے موڈ میں نہیں تھی۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ موٹے سے فوم والے کشن کے اسٹول پر بیٹھی وہ اپنا موڈ سنبھالنے لگی۔

وہ اپنی کتاب کے کسی اہم حصے میں مصروف تھے۔ ان کے چہرے پر بکھری۔ ان کی مخصوص درشتی جو غالباً "ان کی طبیعت کا خاصہ بن چکی تھی" اس طرح ماحول کو سائے دے رہی تھی۔

وہ کتنی دیر منتظر رہی۔ کوئی سوال ہو۔ کوئی جواب طلبی ہو۔ آخر اس بھیانک سناٹے میں وہ کب تک اور کہاں تک انتظار کرے۔

"آپ نے مجھے بلایا تھا؟" اس نے آہستگی سے پوچھا "مجھے کچھ اور بھی کام ہیں۔"

کتنی دیر کے بعد انہوں نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ بہت دیر تک انہوں نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔

"واقعی آپ کی مصروفیت کا تو میں بھی قائل ہوں۔"

ان کا ٹھنڈا تلخ لہجہ اس کو کپکپائے دے رہا تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور جو کہنا چاہتے ہیں کہہ کیوں نہیں چکتے اس نے مباحثہ پسند کرنے کے بجائے خاموشی پسند کر لی۔

"لیکن جس موضوع کے لیے میں نے آپ کو بلایا ہے۔ وہ آپ کی مصروفیات سے جدا نہیں۔ میں اس گھر کو مثالی گھر بنانا چاہتا ہوں لیکن اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نظر نہیں آ رہی۔ میرا مطلب قابل ذکر۔ قابل تعریف یہ کتاب" انہوں نے دستک دینے والے انداز میں کتاب کو بجا کر بتایا۔

"یہ کتاب اندرونی آرائش کے سلسلے میں ایک بہترین کتاب ہے۔ علاوہ ازیں اس موضوع پر میرے پاس پورا ایک شیلف موجود ہے اگر آپ کو کتابوں سے دلچسپی ہو۔"

ایک ڈرامائی وقفہ دے کر انہوں نے نظریں آگ پر گاڑے گاڑے سنجیدگی سے کہا۔

"بجیم سے ایک پارٹی ہمارے اخروٹ کے درختوں کی خریداری کے لیے ادھر آ رہی ہے۔ ہمارے منصوبوں میں ڈریسنگ ٹیبل اور سائیڈ ٹیبل شامل ہیں۔ لیکن اس پارٹی کو دیر سے دیر کروانے کی میری واحد مجبوری یہ تھی کہ آپ کو انٹرنیشنل ٹریڈ کرتے وقت دوسری کمپنی کو بے تحاشا متاثر کرنا پڑتا ہے۔ وہ اخروٹ کی لکڑی سے زیادہ گھر۔ اس گھر میں اس کی عزت افزائی اس کی ڈیلنگ کو زیادہ مد نظر رکھتا ہے کیونکہ وادی سوات میں ایک سے ایک اعلیٰ اخروٹ موجود ہے۔ میں بجیم سے اس کو لے کر گڑھی عیسیٰ خان تک پہنچوں تو پتہ چلے چند نازک نکات پر ساتھ والا ہمسایہ بزنس پارٹنر کو لے اڑا ہے اور میرے اپنے گھر میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہو سکی اس کے کہ مہمانوں کا ایک کمرہ ری ڈیکوریٹ ہو گیا ہے۔ اور سامنے والی زمین پر بیڈمنٹن کورٹ بن چکا ہے۔"

وہ سرخ پڑ گئی۔ اس کے پاس کہنے کو الفاظ کے ذخیرے ختم ہو نے ہی تھے وہ غلط نہیں کہہ رہے تھے وہ واقعی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ مناظر کی فراوانی اور بے پیے کی 'بے تحاشا محبت نے اس کو کام سے دور کر کے کچھ تن آسان سا بنا دیا تھا حالانکہ وہ بہت سخت جان تھی اور اس ارادے سے آئی بھی نہیں تھی۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے دبی دبی سی آواز میں کہا۔

"نہیں! میرا مطلب یہ نہیں۔ آپ کی زندگی پر آپ کا اپنا پورا حق ہے لیکن ہم اپنی زندگی سے اپنے کام کاج کے حصے علیحدہ کر لیتے ہیں آپ بھی آفس ٹائم مقرر کر لیجیے۔ نو بجے سے تین بجے تک۔ دس سے چار۔ جو وقت اور جب بھی آپ کو مناسب لگے لیکن اس وقت آپ کو کام پر ہونا چاہیے۔ لائبریری سے۔ مجھ سے بلکہ جہاں سے بھی آپ کو مدد ملے۔ مدد حاصل کریں۔ اور اس کے بعد آپ کی اپنی مکمل زندگی ہے۔ آپ کیرم کھیلیے 'تاش کھیلیے' بستی میں گھومیے پھریے۔"

وہ اسی سنگین اور ٹھوس آواز میں تیوری پر ہلکی سی شکن ڈالے کچھ دیر خاموش رہے۔

"اور غالباً" آپ کو فینسی ڈریس شو سے بھی دلچسپی ہے بہر کیف یہ کسی بڑے شہر کی ماڈلنگ اسٹیج نہیں۔ یہاں لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش بھی ہوتے ہیں اور باتیں بھی بناتے ہیں۔"

"مجھے لوگوں کی پروا نہیں۔ اور اوقات کار جو بھی آپ مقرر کر دیں۔ مجھے سوٹ کریں گے میں ابھی سے کام شروع کراؤں گی۔" وہ اسٹول پر دھنسی بے پروائی سے ہاتھوں کو دیکھتی بولی۔

"آپ یہ کہہ سکتی ہیں آپ کو پروا نہیں۔ واقعی آپ بہت لاپروا ہیں۔" انہوں نے اٹھ کر کھڑکی کے دونوں طرف کے پردوں کی ڈوریاں کھینچ کر کمرہ روشن کر دیا۔ "خدا کرے آپ کی یہ لاپروائی لوگوں کی جان بچاتی رہے کسی کی جان نہ لے لے۔ تو آپ آج سے کام شروع کر رہی ہیں۔" وہ اب سادگی سے مسکرا رہے تھے اور مسکرانے سے ان کے لہجے کا زہر کہیں جا چھپا تھا۔ "اور جب آپ کا کام تکمیل کے قریب ہو جائے تو ازراہ کرم مجھے آگاہ کر دیجیے گا۔ تاکہ میں اپنے مہمانوں کو مدعو کر لوں۔" وہ حکم کی تعمیل میں خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اتنی جلدی نہیں ہے۔ بے شک آپ چائے پی لیجیے۔" انہوں نے ٹرالی کو ہلکا سا دھکیلتے کہا۔ ٹرالی لے کر آنے والا شخص ابھی تک اسی طرح مودب کھڑا تھا۔ اس نے پشتو میں آہستگی سے دانیال خان سے کچھ کہا تھا۔

"کیوں؟" دانیال خان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ نے ناشتا کیوں نہیں کیا؟"

اس کے جواب میں طویل خاموشی کو ملازم نے اپنی پشتو کے سہارے سنبھالا دیا۔

"ہاں لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ناشتا کیے بغیر بھاگتی دوڑتی آجائیں۔"

وہ پھر کچھ بولا تھا۔

"ہاں ہاں کہہ دینا بے بے سے وہ ناشتا کر لیں گی۔ تم لے آؤ ناشتا۔" وہ تیزی میں مڑ کر چلا گیا۔

"میں ناشتا نہیں کرتی۔ اور ویسے بھی میں اپنے کمرے میں کروں گی۔"

"ناشتا نہ کرنا اور بات۔ میرے ساتھ نہ کرنا اور بات ہے۔ ویسے آپ کی مرضی ہے۔" وہ مسکرائے۔

"بہرکیف آپ ناشتا کر لیجیے گا۔ کیونکہ میں بے بے کے سامنے طویل وضاحتوں سے بہت خوف کھاتا ہوں اور ہاں بات سنیے۔" انہوں نے دروازے کی چوکھٹ پر اس کو جاتے جاتے پکارا۔

"یہ کتاب لیتی جائیے۔"

وہ خاموشی سے پلٹ کر آئی اور ان کی کتاب اٹھالی۔ "تھینک یو!" وہ تیزی میں مڑی۔

"ایک اور بات!" انہوں نے اس کے اٹھتے قدم روک لیے۔

"آپ نے جو کمرہ ڈیکوریٹ کر لیا ہے وہ بہت خوبصورت ہے۔ لگتا ہے اس موضوع پر آپ کی معلومات بہت اچھی ہیں۔ باقی کمروں میں بھی بنیاد یہی رکھیے۔" "شکریہ۔"

"تھینک یو!" وہ تیزی میں سیڑھیاں نیچے اتر گئی۔ ان جیسے خشک دماغ آدمی سے تعریف کے دو بول بھی ایک معجزہ ہیں۔

بے بے کے ہزار منع کرنے اور خان گل کے بڑبڑاتے رہنے کے باوجود وہ بہت سنجیدگی سے کام پر جت گئی۔

کبھی دانیال خان گزرتے تو ایک دو توصیفی فقرے بول کر اس کا حوصلہ بڑھا دیتے۔ یا مسلسل کام نہ کرتے رہنے کی ایک سنجیدہ سی تلقین کر کے اپنی پچھلی تقریر کو بھلا دیتے۔ وہ لمحوں کے لیے ٹھہرتے اور چل دیتے۔

وہ دن رات مصروف رہتی۔ وہ دانیال خان کے لیے مزید باتوں کی گنجائش نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

اس دن جب وہ بہت سنجیدگی سے فرنیچر کی ترتیب کے سلسلے میں یوسف خان سے جھگڑا مول لے رہی تھی کہ اس نے آتش دان کے پاس کھڑی بے بے سے اڑتا سا فقرہ سنا۔

وہ خان گل کو حسب عادت تہدیدی انداز میں جھڑک رہی تھی۔

دانیال خان گڑھی سے واپس جا رہے تھے اور چونکہ وہ ایک طویل مدت کے لیے گڑھی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں لہٰذا خان گل کو اپنی ذمہ داریوں کا اچھی طرح احساس کرنا چاہیے۔

فولڈنگ چیئر کی پشت ہاتھ میں تھامے بیلا ساکن سی رہ گئی معلوم نہیں اندر کسی گوشے میں اس

لگتا ہے کچھ خالی خالی ہو گیا ہے۔ آخر تو ان کو جانا تھا۔

بے بے نے کبھی بتایا تھا وہ اپنی ایک گمشدہ لڑکی کی تلاش میں ہیں۔ اور اب جبکہ ان کا پاؤں ٹھیک ہے اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہیں تو ظاہر ہے ان پاؤں سے چلتے وہ اپنی لڑکی کو ضرور ڈھونڈیں گے۔

اور اس مسئلے سے اس کا کوئی تعلق ہونا بھی نہیں چاہیے۔ وہ یہاں صرف نوکری کی تلاش میں آئی ہے۔ زندگی کی بھول بھلیوں میں اپنا راستہ کھونے نہیں۔ اس نے کرسی سنبھال کر اپنا راستہ ناپنے کی کوشش کی لیکن لمحہ بھر کو لگا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آگیا ہے۔ بے بے باہر سے آنے والے کی خوش دلی سے پذیرائی کر رہی تھیں۔

بے بے، خان گل، دانیال خان۔

ہر چیز آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی اور...

دروازے میں ایستادہ دانیال خان حیرت سے ایک ٹک اس کو دیکھ رہے تھے۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ آنکھیں یوں بے موقع چھلک کر اتنی رسوائی کا سبب بنیں گی۔ اور وہ شخص اس کے سامنے ہی تو کھڑا تھا۔ دروازے کی چوکھٹ میں کسی ساکت تصویر کی طرح جما ہوا۔ اپنی ذہین اور گھیر لینے والی کشادہ آنکھیں اس کی نم آلود سی اٹھتی گرتی پلکوں پر مرکوز کیے۔ جیسے ان نگاہوں کے سامنے یقین، بے یقینی کی کیفیت کا کوئی منظر ترتیب سے گزر رہا ہو۔ بے بے نے آنے والے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ اسی طرح آتش دان کے قریب گھٹنے سکوڑے خان گل پر برس رہی تھیں۔

"دانیال خان چلے جائیں گے تو یہاں کے جھگڑے کون نمٹائے گا؟ اور کون جانے وہ کب واپس آئیں۔ دو مہینے، چار مہینے، ان کا کیا پتا۔ یہ تو شاید پاؤں کی مجبوری تھی ان کی۔ یا اور کوئی بات۔ ورنہ وہ اتنا عرصہ گڑھی میں رکتے ہی کہاں ہیں خان گل۔"

انہوں نے خان گل کی طرف سے جواب نہ پا کر گردن گھما کر اس کو کھوجا۔ لیکن وہ جواب دیتا بھی کیسے۔ وہ ہوتا تو جواب کی گرفت میں بھی آتا۔ وہ غالباً دانیال خان کے کمرے میں قدم رکھتے ہی غسل خانے سے باہر کھسک گیا تھا۔

بے بے کی گھومتی نظریں دانیال خان پر ٹکیں تو وہ شرمندہ ہوئے بغیر ہنس دیں۔

"تمہیں دیکھ کر بھاگ گیا۔ بہت شرارتی لڑکا ہے۔ تم اس کی اصلاح کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے۔"

"آپ کے بقول تو میں گڑھی کی طرف بھی دھیان نہیں دیتا۔" وہ مسکراتے ہوئے بے بے کے پیار گھٹنوں کے نزدیک سٹی پر بیٹھ گئے۔ "اور آپ پر بھی دھیان نہیں دیتا۔ بلکہ کہیں بھی دھیان نہیں دیتا۔ حالانکہ سب طرف میری توجہ ہے۔ ہر جگہ میرا دھیان ہے۔ اور آپ سے یہ کس نے کہہ دیا میں کہیں جا رہا ہوں۔"

ان کی طبیعت کی یہ چونچالی اس نے پہلی دفعہ ہی دیکھی تھی۔ وہ بے بے کو دیکھ کر ہمیشہ چھوٹے بچے کی طرح اپنے لاڈ اٹھوانے لگتے تھے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے بے بے ان کا کتنا ہی احترام کیوں نہ کرتی ہوں۔ ان کے لیے وہ لاڈلے سے بگڑے بچے ہی تھے۔ انہوں نے ایک دم پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ خاموشی سے دیوار کے نزدیک لیمپ شیڈ کے پاس خاموشی اور سنجیدگی سے ان دونوں کے التفات کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان کو اپنی طرف پلٹتا دیکھ کر اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ یہ ایک ذاتی سا منظر تھا۔ اور غالباً

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس میں اس کو دلچسپی لینے کا حق بھی نہیں تھا لیکن وہ فطرت کی سچائی سے بہت کم آنکھیں پھیر سکتی تھی۔

"آپ تشریف رکھیے نا۔" وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

اس نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ جب وہ اس پر عادتاً برس نہیں پڑے تھے۔ طنز کے کاری تیر چلا کر اس کو چھلنی نہیں کر رہے تھے۔ وہ بیٹھنے کے لیے ادھر ادھر جگہ کی تلاش میں نظریں گھمانے لگی۔

"ادھر آجاؤ بیلا۔" بے بے نے خوشی خوشی اس کے لیے جگہ تلاش کی۔ "آگ کے پاس۔"

بیلا اپنی سنجیدگی برقرار رکھے بے بے کے نزدیک بیٹھ گئی۔ وہ اس کے بیٹھتے ہی اپنی سیٹ پر دوبارہ بیٹھ گئے۔

"میں آپ کے لیے خوشخبری لایا ہوں۔ بندے علی خان رات آیا تھا۔ شیریں آرہی ہیں۔"

"ہائیں اکیلی۔" بے بے نے بے چینی سے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اکیلی کیوں۔ ان کی دوست راست ان کے ساتھ ہیں۔"

"میں تو چاہتی تھی خان گل ان کو لینے چلے جاتے۔ لیکن ان کی تو ذرا ذرا بات پر توہین ہو جاتی ہے۔"

"اگر وہ خود آبھی جائیں گی تو کوئی ہرج نہیں۔ راستے بالکل محفوظ ہیں۔ اور ویسے بھی وہ پیدل تو نہیں آرہیں۔" بے بے کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن بیلا کی طرف دیکھ کر چپکی ہو رہیں۔

وہ ویسی ہی بیٹھی تھی ساری باتوں سے بے نیاز اور لاتعلق۔ شکر ہوا وہ غیر اختیاری لمحہ بغیر احساس کے گزر گیا اور اسے اپنی نظروں میں سرخرو کر گیا۔ ورنہ وہ چھلک پڑنے کو بے تاب برستی آنکھوں کو جتنا مرضی سزا دے لیتی کوئی کفارہ نہ ہوتا۔

"ان کے لیے کمروں کا بندوبست کرنا ہوگا۔" بے بے نے موضوع بدلتے پوچھا۔ "وہ باغ کی طرف والے ٹھیک رہیں گے؟"

"کوئی سے بھی کروالیں۔ وہ گھر کے اپنے لوگ ہیں کون سا مہمان آرہے ہیں" ان کے لہجے کی اپنائیت اور آنے والوں کے لیے ان کی جذباتی سی بے تابی بیلا سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے لمحہ بھر کو دانیال خان کی طرف دیکھا۔ ان کی طبیعت کی چونچالی اور شدت کی وجہ جیسے اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

"میں جا کر کمرے دیکھوں۔" وہ حتی الامکان احترام کے دائرے میں رہتی کھڑی ہو گئی۔

"کیوں؟" دانیال خان نے حیرت سے بھنویں چڑھائیں۔ "اس میں دیکھنے والی کون سی بات ہے۔ مریم سے کہیں گا وہ دیکھ لے گی۔ آپ تشریف رکھیے۔"

دانیال خان ایک الجھا ہوا پزل تھے۔ جو اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آسکتے تھے۔ وہ بے بسی سے بیٹھ گئی۔ وہ جب بھی کام کی طرف سے معمولی سی غفلت برتتی تھی تو وہ اس کو یاد دلانا بھولتے نہیں تھے۔ اور جب وہ فرض کی تکمیل کے لیے اٹھتی تو ان کو برا لگتا۔

"دانیال۔ آپ اس مرتبہ ٹھیکے کا فیصلہ کر کے جائیں۔ یہ مسائل خان گل سے سلجھنے والے نہیں۔"

"کیوں۔ وہ بچہ تو نہیں۔ آپ نے اس کو ننھا سا سمجھ رکھا ہے۔ میرے خیال میں تو وہ کافی بالغ ہو چکے ہیں۔ اور میں کہاں جا رہا ہوں۔ آپ لوگ مجھے بھیجنے پر کیوں تلے ہیں؟"

بے بے ایک نظر ان کی طرف اٹھا کر خاموشی سے آگ کی طرف دیکھنے لگیں۔ دانیال خان کسی سوچ

میں الجھے بے بے کی نظروں کے تعاقب میں نہایت سنجیدگی سے آگ کو گھورتے رہے۔

"میں چائے لاتی ہوں۔" بیلا خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔

"اوہو" وہ اس کی پیروی میں اٹھ کر اس کے پیچھے آئے

"اس کا مطلب ہے آپ لوگ واقعی مجھے بھیجنا چاہتے ہیں۔ لیجیے میں چلا جاتا ہوں۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ بیلا شرمندہ سی رہ گئی۔ مجرم سی بنی۔ وہ تاسف سے ان کی خالی جگہ پر بے بے کے سامنے آ بیٹھی۔ "میرا تو یہ مطلب ہرگز نہیں تھا بے بے۔"

"میں جانتی ہوں۔" انہوں نے لاپروائی سے موڑھے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ "اس طرح کی باتیں کرنا ان کی عادت ہے۔ ان کا مطلب نہیں ہوتا۔ میں تمہیں کئی دفعہ سمجھا چکی ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوٹھی عیسیٰ خان کے مالک سردار دانیال خان کی باتوں کا کوئی مطلب نہ ہوتا ہو۔" وہ بے بے کے سامنے جھنجلانا تو نہیں چاہتی تھی لیکن یہ بھی پہلا موقع تھا کہ دانیال خان نے اس کی ذات پر لفظوں کے تیر نہیں چلائے تھے۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔ میرا مطلب ہے کہ ان کی باتوں کا وہ مطلب نہیں ہوتا جو ہمیں نظر آتا ہے۔ وہ جو کہنا چاہتا ہے وہ کہتا نہیں۔ اور جو کہہ رہا ہوتا ہے۔ وہ اس کا مطلب ہی نہیں ہوتا۔"

بیلا بے بے کی دانش مندی پر ششدر رہ گئی۔ وہ دنیا سے منہ پھیرے آتش دان کی طرف رخ کیے کتنی باخبر تھیں۔

"یہ بچپن سے عجیب و غریب ہے۔ شاید ماں کی محرومی نے ایسا بنا دیا۔ یہ جس سے پیار کرتا ہے اسے بہت تنگ کرتا ہے اور جس سے اس کو کوئی دلچسپی نہ ہو اس سے اس کو کوئی شکایت بھی نہیں ہوتی۔ تم اس کی کسی بات کی پروا نہ کرو۔ نہ اپنا دل میلا کرو۔ نہ پریشان ہو۔ بس اپنے کام سے کام رکھے جاؤ۔"

لیکن یہ تو کسی بھی انسان کے لیے بہت مشکل کام تھا۔ انسان اور ڈیکوریشن پیس میں یہی تو فرق ہے انسان تو ضرور سوچتا ہے۔ وہ کسی سے اس کی سوچنے کی صلاحیت تو نہیں چھین سکتے۔ بے جان چیزوں کے درمیان رہتے رہتے انہوں نے انسانوں کو بھی جاندار سمجھنا چھوڑ دیا ہے شاید۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی اس کے پاس ایک پروجیکٹ تھا۔ جس کی تکمیل کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں تھی۔ لیکن اس کو بہر کیف ایمانداری سے کام مکمل کرنا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ گویا اس کا تصور اس کو خوفزدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ لیکن وہ بددیانت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کام میں مزید دس پندرہ دن درکار تھے۔ پھر بلجیم سے پارٹی آجاتی اور اخروٹوں کے درخت کے ٹھیکے کے بعد اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کی ضرورت مہمانوں کی موجودگی میں رہے گی۔ اس کے بعد سال بھر تک اس کی اس گھر کو کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اتنی حقیقت پسند تو وہ تھی۔

☆ ☆ ☆

پھر اگلے ہی روز جب وہ بے بے کے ساتھ سرخ پڑتی شام میں لمبے لمبے شیشوں کے پٹ کھولے پہاڑوں کے پیچھے غروب ہوتے سورج سے مسحور ہو رہی تھی تو کسی کی آمد کا طوفان اٹھا۔ اس گھر میں ہر شخص کی آمد ایک طوفان ہوتی ہے۔ معلوم نہیں یہ گھر ہر وقت مکینوں کو کیوں ترستا ہے۔ بے بے نے اپنے آرام دہ موڑھے میں دھنسے دھنسے کان آواز کی سمت لگائے اور پورے وثوق سے کہا۔ "شیریں ہے۔" پھر تھوڑی سی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

توجہ صرف کر کے انہوں نے جیسے خود کو یقین دلایا۔ "ہاں شیریں ہی ہے۔ ساتھ میں سارا بھی آئی ہے۔"
بیلا کی طبیعت پر عجیب۔ پژمردگی سی چھانے لگی۔ سامنے سورج ڈوب رہا تھا۔ اور آہستگی کے ساتھ اس کا دل۔ خود پر قابو رکھنے کو اس کا بہت دل چاہتا تھا۔ لیکن دنیا سامنے سے دھندلاتی جاتی۔ بہت خاموشی سے وہ بھی اپنی کھڑکی کے سامنے آنے والوں کا انتظار کرنے لگی۔ اس فرق کے ساتھ کہ بے بے کے انتظار میں بے تابی تھی اور اس کے انتظار میں بے چینی۔

باہر برآمدے میں کوئی زور زور سے بول رہا تھا۔ لفظ بے بے کی بار بار تکرار نے اسے اتنا مفہوم تو سمجھا دیا تھا۔ آنے والے غالباً" پہلے بے بے کے کمرے کی طرف گئے تھے۔ ان کو وہاں نہ پا کر وہ ادھر ادھر ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

"ادھر۔ جان بے بے ادھر۔" ان کی کمزور منحنی آواز ان لوگوں کی چیخنی چلاتی۔ آوازوں کے سامنے دب گئی تھی۔ دھڑ سے دروازہ کھلا اور بھاگتی ہوئی شیریں سیدھی بے بے کے بازوؤں میں۔

اس نے اس لڑکی کو بہت تھوڑا دیکھا تھا۔ پہلے کمرے میں ذرا دیر کو۔ پھر کھانے والے کمرے میں۔ لیکن وہ نئی نئی آئی تھی اور اتنی حواس باختہ ہو رہی تھی کہ کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے وہ ہچکچاتی تھی۔

"بے بے میری بے بے" وہ بے بے کے گلے میں جھولتی بچوں کی طرح ٹھنک رہی تھی۔ بیلا چپکی رہ گئی۔ اس میں کوئی برائی بھی نہیں تھی۔ اس کے کوئی اتنے ناز اٹھانے والا ہوتا تو وہ بھی جی بھر کر ٹھنکتی۔ کو اس کو اب یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا تو یہ اس کا احساس محرومی ہی تو تھا۔

"اس مرتبہ تو بہت دنوں بعد بے بے کی یاد آئی۔" محبت میں بھیگی بھیگی ڈولتی سی آواز۔

"السلام علیکم۔" سارہ نے پردوں کے پاس خاموش کھڑی ایک اجنبی لڑکی سے راہ و رسم بڑھائی۔ بیلا جواباً" مسکرا دی۔ "السلام علیکم۔"

"اف خدایا۔" شیریں اپنی خوبصورت سی آواز میں چلائی۔ "یاد نہیں آئی۔ بے بے کی بات سنو سارہ۔" "سارہ کو تم ملنے بھی دو نہیں۔" سانولی سلونی سادہ سی سارہ خوش خلقی سے ہنس رہی تھی۔ "آپ کیسی ہیں بے بے۔ سچ ہم بہت یاد کرتے تھے آپ کو۔ اور یہ شیریں تو بار بار پروگرام بناتی تھی۔ میں نے ہی اس کو روکے رکھا۔ ہمارے سمسٹر تھے نا۔"

"اور میں سوچ رہی تھی کہ بے بے مجھے پوچھنے ضرور آئیں گی۔ وہ میرے بغیر اتنے عرصے رہ ہی نہیں سکتیں۔"

"کیسے سفر کرتی اتنی دور کا۔ اور ساتھ میں کسے لاتی۔ خیر ساتھ تو کوئی بات نہیں۔ بیلا میرے ساتھ ضرور آتی۔ ارے بیلا سے تم ملیں؟"

"ہیلو۔" شیریں نے اسے خشک لہجے میں پکارا۔

"ہیلو۔" وہ باوجود کوشش کے اپنے لہجے کی افسردگی چھپا نہ سکی۔

"یہی بات۔ یہ بیلا ہی تھی جس کی وجہ سے مجھے تمہاری کمی کا احساس نہیں ہوا۔"

شیریں سامنے والی کرسی میں دھنس کر بیٹھ رہی۔ اس کو بے بے کے اعزازات سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہ تھی۔ وہ بہت دن بعد گھر آئی تھی۔ اس لیے جی بھر کر ہنس رہی تھی۔ ہنستے ہنستے ہی سارہ دوسرے

صوفے میں لڑھک گئی۔ "آہ۔ ہوم سویٹ ہوم۔ سارہ۔"

"واقعی ہم تو کھائیں گے جناب۔ راستے کے کھانے نہیں پلاؤ کباب، قورمہ روغن جوش۔ یقین کریں بے بے آلو گوشت کا پتلا شوربہ کھاتے کھاتے منہ سوکھ گیا ہے۔"

"رات کے کھانے میں تو دیر ہے ابھی سارہ، جب ہم گوشی آ گئے ہیں تو کڑھی کو ہمارے حساب سے چلنا ہو گا۔ فی الحال ہمیں چائے پلوائیں بلکہ چائے کھلوائیں۔ اف بے بے میں شدید بھوکی ہوں۔"

"میں کہتی ہوں کسی سے۔" بیلا کتنی دیر سے جیسے جگہ چھوڑنے کی منتظر ہی تھی۔

"کتنی سردی ہے۔ پشاور میں رہ کر یاد ہی نہیں رہتا کہیں سردی بھی پڑ رہی ہے۔ ذرا پلیز کسی کو کہیں اور لکڑیاں لا کر ڈالے۔" سارہ بیلا کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ "چلیں میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔"

"آپ ریسٹ کریں۔ اتنا لمبا سفر کیا ہے آپ نے۔ میں پری گل سے کہتی ہوں۔ وہ ابھی چائے اور لکڑیاں بجھواتی ہے۔" کتنی شدید کوشش اس نے کی کہ اس کا انداز گھر کے مالکوں والا نہ ہونے پائے۔ اس گھر پر اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ ہاں کچھ فرائض تھے جن کی بجا آوری وہ ہمیشہ یاد رکھتی تھی۔

"میں تو تھک کر چور ہو گئی۔" شیریں بڑے صوفے پر اوندھے پڑ کر بولی۔ "تم آرام کرو سارہ۔"

واقعی اس کو کرنا بھی کیا تھا۔ اس نے پری کے ذریعے خستہ خان کو کہلوا دیا تھا کہ باجیاں پہنچ گئی ہیں اور انہیں چائے کے ساتھ لوازمات بھی درکار ہیں۔

☼ ☼ ☼

اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ کمرے میں آئی تو اسے محسوس ہوا۔ وہ کافی دنوں سے بہت زیادہ بے آرام ہو رہی ہے۔ آسمان سے اندھیرا اس کی کھڑکی کے شیشوں پر بھی گرنے لگا تھا۔

اور خاموشی سے برستی اداسی کی پھوار اس کے دل کو گھیرے تھی۔ ایک اداس سی، بے نام سی تاریکی آہستہ آہستہ اس کے چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ کاش اس اندھیرے میں خود کو چھپا کر وہ کہیں گم ہو جائے۔ لیکن یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اس بستی میں چھپ جانے اور گم ہو جانے کے لیے بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اس کو اپنے کمرے میں آ کر اپنی بے نام الجھنوں سے الجھتے آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ بے بے کا بلاوا آ گیا۔ اس کا خیال تھا "آج اس کو مکمل فرصت رہے گی۔ بے بے کو ایک نیا شغل مل گیا ہے۔ ایک ایسا انسان جس سے ان کے ماضی کی کڑیاں جگہ جگہ سے ملتی ہیں۔ اس کی یاد آنے بھی نہیں دے گا۔ لیکن وفا شعاری بے بے کی طبیعت کا لازمی جزو تھی۔ وہ کہیں بھی کسی کو بھی نہیں بھول سکتی تھیں۔

"ڈائننگ روم میں چائے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔" پری نے نستعلیق اردو کا حتی المقدور استعمال کر دیا تھا اس کو اصولاً "تو اس وقت نہا دھو کر تیار ہونا تھا لیکن وہ جب سے آئی تھی آلکسی سے آرام کرسی پر دراز اپنے گرد چھائی اداسی کو نصیحتیں کرنے کے موڈ میں تھی۔ وہ نہا کر کپڑے بدل کر نکلی تو وقت خاموشی سے کچھ اور آگے سرک چکا تھا۔ شاید وقت پر اس کا اختیار اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہی ہو رہا تھا۔

گھر میں صرف دو نئے مہمان آئے تھے۔ لیکن ڈائننگ ہال کے کوریڈور کے خاتمے سے سارے گوٹھی عیسیٰ خان کو معلوم ہو چکا تھا کہ آج یہاں ایک نیا طوفان اترا ہے۔ زندگی میں ہلچل در آئی ہے۔ وہ سادہ سے لباس میں تھی۔ اس کے بالوں کی تراش بھی سادہ تھی۔ اب تو ایک مدت سے نہ ترشوانے کی وجہ سے کندھوں سے نیچے تک جھولنے لگے تھے۔ بال باندھنے کی عمر بھر کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے اب بھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کو یہی کام سب سے مشکل لگتا۔ وہ برش کر کے بالوں کو یونہی ڈولتے پھرنے کے لیے چھوڑ دیتی۔

اس نے گھر میں آنے والوں کا لباس بھی ایک نظر میں دیکھ لیا تھا۔ اور حلیہ بھی۔ وہ قیمتی کپڑوں' جدید تراش کی سلائی اور بالوں کی بہترین بناوٹ کے ساتھ انگلیوں میں زمرد کے نگینے سجائے بہت دھیمے دھیمے' بہت احتیاط سے بولتی تھیں۔ جیسے ان کے بول ہیروں اور زمرد کی طرح قیمتی اور نایاب ہوں۔ اس نے ایک نظر اپنے حلیے پر ڈالی اور شیشوں کے بند دروازے کے اس پار جہاں آتش دان کی گرمی اور باتوں کی مہک تھی۔ اس نے اندر جانے کا ارادہ کینسل کر دیا۔ کتنی دیر سے دروازے کا ہینڈل ہاتھ میں تھامے گومگوں کی کش مکش سے نکل کر فیصلے کی حد میں داخل ہو گئی۔

میں کسی سے معذرت کہلوا دیتی ہوں۔ وہ ہینڈل سے ہاتھ ہٹا کر گھومی ہی تھی کہ ٹھٹک کر رک گئی۔

دانیال خان کسی پر لطف منظر سے محظوظ ہوتی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک دم پلٹنے سے وہ ان کے عین سامنے اس طرح آ کر رک گئی تھی۔ کہ اگر ذرا بھی زور سے گھومتی تو ان سے ٹکرائے بنا رک نہیں سکتی تھی۔

وہ اس سے بالشتوں کے فاصلے پر تھے۔ صرف ایک اچٹتی سی نگاہ اور اس نگاہ میں بھی اس نے بھانپ لیا تھا۔ دانیال خان شام کی اس چائے کے لیے بطور خاص اہتمام سے تیار ہو کر آئے ہیں۔ مخصوص قیمتی مردانہ پرفیوم کے جھونکے اس کے دائیں بائیں لہراتے گزر رہے تھے۔ گویا آج کے مہمان دانیال خان کے خاص مہمان تھے۔ ورنہ اتنے عرصے میں اس نے ایک مرتبہ بھی ان کو ڈائننگ ہال میں آتے نہیں دیکھا تھا۔

اس نے جھکی ہوئی نظروں کو ایک مرتبہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اگر وہ ذرا سا اِدھر اُدھر ہوں تو اس کو واپسی کا راستہ مل سکتا ہے۔ لیکن وہ معلوم نہیں کس ارادے سے اس کے راستے میں تھے مدتوں کی روکی مسکراہٹیں لٹا رہے تھے۔

وہ بہت خوش تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا۔

اور اسی یقین نے اس کو اداس کر دیا۔

"تو آخری فیصلہ یہی ہوا کہ آپ جا رہی ہیں۔"

وہ خاموش رہی۔ اس گھر کے لوگ لوگوں کے راز پا لینے میں کمال رکھتے ہیں۔

"میری طبیعت...." وہ کچھ ہچکچا کر چپ سی ہو گئی۔ جھوٹ بولنا معمولی بات نہیں ہوتی۔ "میری طبیعت شاید ٹھیک نہیں ہے۔"

"آخری منٹ تک خود سے الجھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا آپ نے۔" وہ بھنویں اچکا کر اس کو پھر کسی آزمائش میں گرفتار کر رہے تھے۔ دھیمے دھیمے لہجے میں اس کے بالوں کے نزدیک کان کے پاس جھکے۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کو بوکھلانے میں کامیاب ہو رہے تھے۔

"اور اگر کوئی اس اچانک بیماری کی وجہ دریافت کرنا چاہے تو؟"

"وجہ تو کوئی نہیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔" اس نے مری مری سی آواز میں کہا۔

"اور دل کیوں نہیں چاہ رہا تھا؟" وہ جانتی تھی لفظوں کی بخیہ گری ان کا پیشہ رہا ہے وہ جب تک اس کو ادھیڑ نہیں ڈالیں گے' یہاں سے نہیں ٹلیں گے۔

"دراصل آپ سب لوگ ایک ہیں اور میں۔" وہ روانی میں اپنی بات کہتے کہتے جھجک کر چپ ہو گئی۔ اس کو اپنے اس فقرے سے خود ترسی کی بو آئی تھی۔ اور وہ خود کو مجبور' بے کس ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"میں جانتا تھا۔ میں جانتا تھا۔" ایک گہرا طویل سانس ان کے پھیپھڑوں نے آزاد کیا۔ "اور یہ کوئی قابل فخر بات نہیں۔ آپ کو آپ کے اس کامپلکس کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔" انہوں نے بایاں ہاتھ آگے بڑھا کر دروازے کا ہینڈل جھکا دیا۔ دروازہ بے آواز کھلا۔

ان کے دائیں ہاتھ دروازے کی چوکھٹ تھی۔ اور بائیں ہاتھ میں ہینڈل۔ اور دروازے کو تھامے دونوں بازوؤں کے ڈھیلے دائرے میں اس کا پیلا پڑتا وجود۔

"تشریف لے چلیے۔" ان کی آواز صاف کھلی اور نمایاں تھی۔ بغیر کسی لرزش کے۔

اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ سامنے دانیال خان یقینی ارادوں سے اس کا راستہ اپنے وجود سے روکے کھڑے تھے۔ وہ ان سے ٹکرائے بغیر صرف ہال ہی میں داخل ہو سکتی تھی۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے ایڑیوں پر گھومی اور ہال میں داخل ہو گئی۔

وہ ایک قدم بڑھا کر اس کے ساتھ ایسے شامل ہو گئے۔ جیسے وہ اپنے اپنے کمروں سے ایک ساتھ آئے تھے۔ ہال خوب چمکدار روشن تھا اور گرم۔ ساری وال لائٹس اور شیڈ لیمپز آن تھے۔ میز کے گرد چند ہی کرسیوں پر لوگ ہونے کے باوجود ہال بھرا بھرا اور پرجوش لگ رہا تھا۔

شیریں نے بے آواز کھلنے والے دروازے کی آواز غالباً اپنے دل پر سنی۔

خان گل سے کانٹا ہلا ہلا کر لڑتے والی شیریں کا پیلا رنگ تبدیل ہو کر سرخ سا ہو گا۔

وہ بے کلی میں اٹھ کر آنے والوں کی طرف لپکی۔

لیکن منہ زور خواہشوں کو لگام دیتی تھم کر رک گئی۔ بیلا کی چند سنہری بے قابو لٹیں نامعلوم ہوا سے ان کے ڈنر کوٹ سے ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں۔ حدت سے تپتا اس کا لال بھبھوکا چہرہ جیسے حالات سے سینہ سپر ہو رہا تھا۔ واپس لوٹ جانے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ دانیال خان نے دروازے سے شیریں تک' ایک لمحے کے لیے بھی اسے بھاگنے کا کوئی راستہ فراہم نہیں کیا تھا۔ اس کے کندھے سے بالکل نزدیک اپنا کندھا ملائے وہ شیریں کے لیے مسکرا دیے۔

"بیٹھو بیلا۔" بے بے نے جیسے اسے تنبیہ کی۔ خان گل اور سرجن نثار اس کی آمد کے احترام میں کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے سرجن نثار کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ خفیف سی ہو گئی۔

"السلام و علیکم۔" وہ اپنی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"کیسی ہیں آپ۔" سرجن نثار اپنی خوش اخلاقی بھگا رہے تھے۔ اپنی کرسی کی پشت سے وہ دانیال خان اور شیریں خان کی بے تابانہ سی ملاقات کو بغیر دیکھے محسوس کر رہی تھی۔

شیریں کے انگ انگ سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ اس کی آواز میں شوخی اور چونچالی اس بات کا پتا دے رہی تھی کہ اب جو شخص اس سے ملا ہے اس نے پچھلے سارے ملنے والوں کی خوشی کو کم کر دیا ہے۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تھینک یو۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔ غیر شعوری طور پر اس کا دھیان بار بار پیچھے کھڑے ہوؤں کی طرف بھٹک جاتا تھا۔ بیلا کا تعارف' شیریں خان کی بہترین دوست اور ان کی رست

www.iqbalkalmati.blogspot.com

راستے سے کروایا جا رہا تھا۔ سارہ رب نواز۔

سارہ رب نواز نے اس سے کوئی خاص رسمی فقرے بول کر اسے مشکل میں نہیں ڈالا یا شاید وہ لیے بھی ہوں اس کا دھیان اپنی کرسی کے سامنے سے زیادہ پیچھے تھا۔

وہ دونوں کسی ایسے موضوع پر بات کر رہے تھے جو انہوں نے پہلے بھی کہیں ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"وہ بڑی عجیب سی SHOP تھی۔ اور وہاں والا آدمی بہت ہی STUPID تھا میں نے اس کو بہت یاد دلایا۔ آپ کا حوالہ دیا کہ میں آپ کے ساتھ آپ کی دکان پر آئی تھی۔ کمبخت لگا انہی کو دوں گا۔ کل کا سارا دن اسی منت سماجت میں گزرا۔ پوچھیں بے شک سارہ سے۔"

"کیوں پوچھوں؟ آپ نے جو کہہ دیا۔ اور اتنی مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے تو اس وقت بھی بتایا تھا آپ کو وہ کچھ خبطی سا ہے۔"

"لیکن آپ سے تو بہت پیار کرتا ہے۔" اس کی ہنسی کی کھنک نے اس کو ہلکا سا چونکا دیا۔ یہ اس کے پرانے لوگ ہیں' اس کے اپنے شاید اسی لیے اس شخص کی گفتگو کا انداز سب ہی کچھ بدلا ہوا تھا۔ وہ گفتگو میں طنز کے تیر پھینکتا' جملوں کے کچوکے لگاتا شخص بڑا نرم خو' مہربان' محبت کی شمعیں روشن کرتا شیریں کے چلے آنے سے جیسے خوشی سے سیراب ہو گیا تھا۔

لمبی میز کے ایک کونے میں جہاں باقی سب دیر سے کسی بحث میں الجھے تھے۔ وہ ایک حصے میں شیریں کے ساتھ جا بیٹھے۔ سارہ رب نواز کی طرف انہوں نے ایک طویل خوبصورت اور گہری مسکراہٹ نذر کی۔ جیسے عزیز ترین ہستی کے عزیز ترین دوست کو کسی بھی التفات کے لائق سمجھا ہی جا سکتا ہے۔

"یہ سرجن نثار آپ کو دھیان سے تو لائے۔"

"شکر ہے۔" سارہ رب نواز شائستگی سے ہنس پڑی۔ "آپ کا دھیان کہیں اور بھی گیا۔"

"آپ اپنے دھیان کی بات کریں۔ کتنی فلمیں دیکھیں۔ کتنے ناول پڑھے۔ کتنی شاعری کی۔ پاس بھی ہوں گی اس سال؟" بیلا کا پلیٹ سیدھا کرتا ہاتھ لرز گیا۔

آج وہ ایک بالکل ہی نیا دانیال دیکھ رہی تھی۔ سستی سے اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے اس نے ایک نظر عوام کی طرف دیکھا۔ خان گل کے سوا سب ایک دوسرے میں مگن تھے۔ خان گل اس کو بڑی دلچسپی اور انہماک سے دیکھ رہا تھا۔

"سارہ رب نواز۔" اس نے دوستانہ سے لہجے میں اس کو پکارا۔ "تمہارا ان سے تعارف ہے؟"

"جی ہاں۔ ہو چکا ہے' آپ زیادہ قائل نہ بنیں۔"

"اچھا تو ان کا نام بتا ئیں۔"

"جی بیلا ہے ان کا نام۔ ابھی بتایا ہے بے بے نے۔ میرا حافظہ اتنا خراب نہیں۔"

"غلط بتایا ہے۔" اس نے شرارت سے کہا۔ "بیلا نہیں ان کا نام۔"

وہ سن سی ہو گئی۔ بھری محفل میں کیسا غلط مذاق کرنے جا رہا تھا۔ جتنا وہ لیے دیئے بیٹھی تھی' اتنا ہی تمسخر کا نشانہ بنتی۔ اس نے چوری چوری دانیال خان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا رخ تھوڑا سا شیریں کی طرف گھمائے بڑے انہماک سے اس کی کوئی بات سن رہے تھے۔ خدا کا شکر' وہ متوجہ نہیں تھے۔

"ہائیں۔" وہ خان گل کی شرارت اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس نے چمکتی آنکھوں سے باری باری

دونوں کی طرف دیکھا۔

"پھر کیا ہے ان کا نام؟"

"بڑا قصور نام ہے۔ تاریخی۔"

"خان گل۔" اس نے دانت پیس کر دبی دبی سی آواز میں پکارا۔

"پلیز بتا دیں نا۔ اب تو تجسس بھی ہو گیا ہے۔" سارہ نے منت کی۔

دانیال خان نے یک لخت چمچ واپس پلیٹ میں رکھ کر ایک گہری تہدیدی نظر خان گل پر پھینکی۔ وہ اتنی نمایاں اور احساس دلانے والی نظر تھی کہ میز کے گرد موجود سب ہی لوگوں نے محسوس کر لی۔ خان گل پھیکا سا پڑ گیا۔

"ان کا نام ہے ورکنگ بیبی۔"

بیلا نے ایک گہرا ہموار سا سانس لیا۔ ایک بلا آتے آتے ٹل گئی۔ اور اس کے لیے پتا نہیں اس کو دانیال خان کا ممنون ہونا چاہیے یا محض ایک اتفاق سمجھ لینا چاہیے۔ کیونکہ انہوں نے خان گل پر وہ سرزنش کرتی نگاہ ڈال کر وائٹ سوپ مانگا تھا۔ اور مسکرا کر ٹھیک یوں ہی کہا۔

اس کے بعد خان گل بجھ سا گیا۔ وہ میز پر موجود تینوں لڑکیوں کے ساتھ باری باری مذاق کے موڈ میں تھا۔ سارہ کے زندہ دل قہقہے کے باوجود خان گل نے ایک لفظ بھی منہ سے فالتو نہیں نکالا۔ ایسے میں سرجن نثار ہی کام آئے۔

وہ خان گل کی نیت سے بھی آگاہ تھے۔ وہ بیلا کو محفل میں بے تکلف ہونے کا موقع دے رہے تھے۔ انہیں بیلا کی بے بسی کا احساس بھی تھا۔ اسے نشانہ مشق بننا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ خاص طور پر ایسے دو لوگوں کے بیچ جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھے۔

اور اس کو دانیال خان کے معتبر ہونے پر اعتراض ہونے کے باوجود اعتراض کا حق نہ تھا۔ یہ سب خانوں کی روایات کا حصہ تھا۔

"چلو لڑکیو۔ کل کا پروگرام ترتیب دو۔ کیا کیا کرنا ہے؟ خان گل نے مجھے آتے ہی ہیڈ منٹن کورٹ کے بارے میں تو بتایا تھا۔ اس کے علاوہ؟"

"ارے ہاں۔" بے بے نے جیسے اتنی دیر بعد چونک کر محفل میں حاضری دی۔ "وہ کورٹ تو خود ان دونوں نے پھاوڑے سے کھود کھود کر بنایا ہے۔ اور مجھے درمیان میں خوامخواہ گھسیٹ لاتے ہیں۔ انصاف کروانے کے لیے۔ اور تم نے مجھے بتایا نہیں دانیال خان کہ لڑکیاں نثار کے ساتھ آ رہی ہیں۔ تمہیں اندازہ نہیں میں کتنی پریشان تھی۔ ان کے اکیلے آنے کے تصور سے۔"

"یہ اکیلی آ رہی تھیں ڈرائیور کے ساتھ۔ سرجن نثار تو قسمت سے ہی مل گئے۔"

"خوش قسمتی سے۔" سرجن نثار نے ٹوکا۔

"ہمیں تو کوئی قسمت نہ ملی۔ سارا راستہ ڈانٹ ڈانٹ کر لائے ہیں۔ بغیر دھوئے پھل نہ کھاؤ' ان پر اسپرے ہوا ہے' بازار کا کھانا نہ کھاؤ۔ ان ہائی جینک ہے۔ فلاں چیز نہ چکھو' گندے مندے ہاتھ لگے ہیں۔ ہم تو سارا راستہ کیابوں کو ترستے آئے ہیں۔" سارہ بڑبڑائی۔

"دانیال خان۔" سرجن نثار نے چھری سے اشارہ کیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مجھے اگر احساس نہ ہوتا کہ لڑکی سے نادانی میں غلطی ہوئی ہے تو ایک عدد لاش سوری۔" انہوں نے بے بے کی طرف دیکھ کر چھری روسٹ میں بھونک دی۔

بے بے بیزاری سے کرسی سے اٹھ کر آتش دان کے پاس چلی گئیں۔ "جب بھی تم لوگ اکٹھے ہوتے ہو۔ پاگلوں ایسی باتیں کرتے ہو۔ نثار۔" انہوں نے تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔ "اس سال میرے گھٹنے بالکل ہی جواب دے گئے ہیں۔"

"میں تو اب ہر روز چلتی ہوں۔ پوچھ لو بیلا سے۔ ہیں نا بیلا؟"

"ہاں واقعی۔ بے بے روزانہ تھوڑی سی واک دن میں کرتی ہیں اور آدھ گھنٹہ شام کے وقت ضرور۔" اس نے پلیٹ سے بہت دیر کا جھکا سر اٹھایا۔

"ہوں۔" سرجن نثار نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔ "وہ تو میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔ ان کی صحت دیکھ کر بھی اور آپ کی بھی۔"

"کبھی صحت کے علاوہ کچھ اور بھی دیکھا کریں۔" سارہ رب نواز کی بیزاری سی آواز نے سب کو ہنسا دیا۔

"وہ اتنی اچھی' اتنی پیاری سی لڑکی۔ آپ کا مطلب ہے موٹی ہو جائے' تبھی صحت مند ہو سکتی ہے۔"

"کیا بات ہے؟" دانیال خان نے بہت دیر بعد اپنی بھاری سی آواز میں پوچھا تھا۔ "یہ سارہ' سرجن نثار سے بہت ناراض ہیں؟" وہ شیریں سے مخاطب تھے اور کسی بہت اہم انسان جیسے سارے تاثرات اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔

کتنے عجیب سے خیالات نے اس کو گھیر لیا۔ ابھی بہت زیادہ وقت نہیں گزرا۔ جب دانیال خان دروازے سے اس کو مرغیوں کی طرح گھیر کر اندر لے آئے تھے۔ جیسے اس کے بغیر یہ محفل ادھوری سی رہ جائے گی۔ لیکن اس کے اندر آنے سے وہ اتنے انجان سے ہو گئے جیسے اس کو اندر لانے میں ان کا کوئی ہاتھ نہ رہا ہو۔

بے بے آتش دان کے پاس چلی گئی تھیں۔ خان گل نے ہونٹوں پر چپ لگا لی تھی۔

دانیال خان کی ساری توجہ شیریں کی طرف تھی۔ وہ کسی اور سے مخاطب بھی ہوتے تو شیریں کے حوالے سے۔ ایک اکیلے سرجن نثار تھے۔ جو محفل کی رونق سنبھالنے کی کوشش میں ہار رہے تھے۔

قہوہ کی سروس شروع ہوئی تو اس کو اندازہ ہوا وہ بہت تھکی ہوئی ہے۔

اتفاق ہی تھا کہ اس کو قہوہ کا مزا ایک دن بھی پسند نہ آیا۔ اور دن میں کتنی ہی مرتبہ اس کو پینا پڑتا تھا۔ اس کے ہر گھونٹ میں اس کو بارہ مسالوں کی بو آتی تھی۔ ادرک' دار چینی' چھوٹی الائچی' معلوم نہیں قہوہ کس کس چیز کا مرکب ہوتا تھا۔

کھانے کے خاتمے پر محفل بے بے کے کمرے میں شفٹ ہونے چلی۔ خان گل نے رکھائی سے معذرت کر لی۔ وہ دن بھر جنگلی خرگوشوں کے تعاقب میں دوڑا تھا۔ اور تھک گیا تھا۔

سرجن نثار اور دانیال خان ذرا سست قدم رکھتے کسی سنجیدہ بات میں مگن ہو گئے۔ شیریں دنیا سے بے نیاز اپنے خوبصورت شانے جھٹکتی بھاگتی بے بے کے سٹنگ روم کی طرف چلی۔ یہی موقع تھا۔ اس نے سوچا۔ دانیال خان پیچھے رہ گئے تھے۔ بے بے آگے نکل گئی تھیں۔ اور دائیں طرف کی راہداری اس کے کمرے کی طرف نکلتی تھی۔ وہ ابھی مکمل طور پر گھوم بھی نہ پائی تھی کہ اسے لگا سست قدم افراد اپنے

قدم تیز کر کے اس سے آ ملے ہیں۔ وہ مڑتے ہی رک گئی۔

سرجن نثار اور دانیال خان اس کے راستے میں حائل' ایک دوسرے سے بالکل مختلف تاثر دے رہے تھے۔ پہلا شخص حلاوت سے مسکراتا اور دوسرا قطعی سنجیدگی سے سامنے دیکھتا۔

دونوں کے چہرے پر اپنے اپنے پیشے کی شدت رچی تھی۔

"تو معلوم یہ ہوا۔" سرجن نثار نے دانیال خان کو مخاطب کیا۔ "کہ آپ علاوہ اچھا پکانے کے اچھی ڈیکوریٹر بھی ہیں۔ پچھلی بار سے اب تک میں نمایاں انقلابی تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں۔ کچھ رنگ بکھر گئے ہیں۔ کچھ زندگی اور تازگی آ گئی ہے۔ وہ مردہ دلی اور بے رونقی اب در و دیوار پر نہیں چپکتی۔"

"تھینک یو۔" وہ شگفتگی سے ہنس دی۔ "آپ نے زیادہ تعریف کر دی ہے۔"

"نہیں زیادہ نہیں کی۔ اتنی کی آپ مستحق ہیں۔ اور آپ کہاں تشریف لے جا رہی ہیں۔ ابھی تو قہوہ کا ایک دور اور چلے گا۔ بھئی شیریں' سارہ۔ ان کو ساتھ لے کر چلو نا۔"

شیریں ایک چھپاکے سے اندر داخل ہو چکی تھی۔ سارہ رک گئی۔ وہ شرمسار سی واپس ہوئی۔ واقعی اس کو بیلا کے ساتھ چلنا چاہیے تھا۔

"سوری۔ مجھے قہوہ زیادہ پسند نہیں۔"

"قہوہ ناپسند ہے۔ مت پیجئے گا۔ ہم تو ناپسند نہیں نا۔" سرجن نثار کے بہت اصرار سے اس کو الجھن ہونے لگی تھی۔ سارہ اس کا بازو پکڑ کر بے تکلفی سے مسکراتی اندر چلی۔

کمرہ خوب گرم اور روشن تھا۔ لوگ اپنی پسند کی جگہیں سنبھال کر گپ لگا رہے تھے۔

سارہ نے بیلا کو پکڑ ہی لیا تھا۔ اور وہ بیلا کو اچھی بھی بہت لگی۔ وہ سادہ اور بے تکلف تھی۔ شاعری کرتی تھی اور چھوٹے موٹے افسانے لکھا کرتی تھی۔ لیکن زیادہ خود گمان نہ تھی۔

دانیال خان اور شیریں بے بے کے نزدیک تھے۔ سارہ کی باتوں میں بہت زیادہ دلچسپی کے باوجود وہ جب بھی نگاہ اٹھا کر دیکھتی دانیال خان آرام کرسی میں ریلیکس کرنے کے انداز میں دراز بڑے انہماک سے اس کی کوئی کتھا سنتے ملے۔

جلد ہی خان گل محفل میں آ شامل ہوا۔ سرجن نثار دوست تو دانیال کے تھے لیکن غالباً" پسندیدہ شخصیت خان گل کی تھے۔

جلدی سونے والوں کو نیند آ رہی تھی۔ اسے تو ویسے بھی جلد سونے کی عادت نہیں تھی۔

لیکن جب وہ سونے کے لیے بستر پر آئی تو اس کا ذہن تھکا ہوا اور سر بہت بوجھل تھا۔ آنکھیں شدت نیند سے جلنے کے باوجود بند نہیں ہو پا رہی تھیں۔ وہ جب بھی پلکیں موندتی ایک خوبصورت سر کے ساتھ جھکا ہوا دوسرا باوقار سر اس کی نیند اڑا دیتا۔ وہ ان کے جیسی نہیں ہے۔ اور نہ ان میں سے ہے۔ اور یوں بھی اس کو عنقریب اپنا کام مکمل کر کے چلے جانا ہے۔ آرام دہ تکیہ اینٹ کی طرح سخت اور پتھر کی طرح ٹھنڈا ہوا تھا۔

ایک مدت بعد اس کو کتنے ہی لوگوں کی یاد نے ایک ترتیب سے بے چین کر دیا۔ گوتی' انکل جمشید منیجر صاحب' وکیل صاحب' رحیم چاچا۔ اور ان سب سے اوپر اس کے اپنے بابا۔ ایک وقت تھا جس پر سے اس کی گرفت آہستگی سے سرک گئی لیکن ماضی کا سرمایہ اس کی یاد میں انتہائی دلچسپ اور انتہائی محفوظ تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور سب سے بڑی بات کہ وہ اس کا اپنا تھا۔ اس میں کسی کا حصہ نہیں تھا۔ اسے کوئی چھین نہیں سکتا تھا۔ اس میں نہ کوئی حسد تھا نہ رشک۔ بہت دنوں کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں کانوں کو بھگوتے رہے۔ یہ کیسی عجیب رات تھی۔ وہ تو اپنی تکلیف کا سبب معلوم کرنے سے بھی بالکل عاجز تھی۔ رات کی تاریکی میں خاموشی سے روتی رہی اور اس رونے سے اس کو عجیب طرح کا آرام آ رہا تھا۔

کتنے بہت سے بے نام دکھ آہستہ آہستہ بہتے پانی میں دُھل رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

گڑھی میں آنے والے اگلے تمام دن خوشی مسرت کے دن تھے۔ ہنگاموں اور رونقوں کے دن تھے اس کو گڑھی میں آئے کتنا ہی وقت گزر چکا تھا لیکن ان ایام نے ان در و دیوار میں اتنے قہقہے اتنی خوشیاں اور ایک دم اتنے بہت سے ہنگامے ایکدم محسوس نہیں کیے تھے۔

سیمابی طبیعت سرجن نثار ہر وقت پروگرام بناتے رہتے۔ "جہاں پہاڑی دریاؤں کا برساتی پانی اوپر سے نیچے آبشار کی صورت میں گرتا ہے آج وہاں باربی کیو ہو گا۔"

"وِن۔" ایک نعرہ لگتا۔

"میں ڈیوٹی تقسیم کرتا ہوں۔" وہ ہاتھ میں کاغذ پنسل لے کر انچارج بن جاتے۔ "خان گل چیزوں کے لیے ٹرانسپورٹ کی فراہمی کا بندوبست کرے گا۔ کیا کیا چیزیں ہوں گی اور کتنی تعداد میں سارہ رب نواز اس کی ذمہ دار ہیں۔ شیریں خان انٹرٹینمنٹ کا بندوبست کریں گی۔ اور وہاں پکانے والوں کی دیکھ بھال خانم بیلا کے ذمے رہ گئے وہ بور قسم کے افسرِ اعلیٰ دانیال خان ان کے ذمے۔"

"معاف کیجیے شاید میں شرکت نہ کر سکوں۔" بیلا نے دبی دبی سی آواز میں معذرت کی۔ ہنگامہ خیز پارٹی کی ہنگامہ اپنے عروج پر تھا کسی نے اس کی اتنی دبی دبی معافی سنی بھی نہیں تھی۔ میوزک اونچی آواز میں بج رہا تھا۔

بے بے بار بار کانوں پر ہاتھ لگانے کے باوجود اس شور شرابے میں سرشار سی بیٹھی تھیں۔

"معاف تو آپ کو تب کیا جائے گا جب اس معافی کا سبب معلوم ہو۔" سرجن نثار اس کے سامنے آ گئے۔ "مجھے تھوڑا سا کام ہے۔"

"میرا خیال ہے آپ کے افسرِ اعلیٰ ایسے ظالم نہیں۔ اور اتنے بور بھی نہیں۔ اے لو وہ بھی آ گئے۔ ساتھ کنگن کو آرسی کیا۔"

کھلے دروازے سے دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے اور بے تحاشا شور سے ہلکی سی ناگواری کے اظہار پر پیشانی چڑھائے دانیال خان گروپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جو فلور کشن پر بے ترتیب پڑے اچیبوں کی طرح میوزک پر چٹکیاں بجانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شیریں خوشدلی سے مسکراتی اٹھی۔

اور اب تو بیلا سے کیا شاید کسی سے بھی یہ چھپا نہ رہا ہو کہ شیریں اپنی تمام تر تنک مزاجی اور چڑچڑا پن چھوڑ کر دانیال خان کو دیکھتے ہی کھل اٹھتی ہے۔

اور ہمیشہ سنجیدہ سنجیدہ اور لیے دیے رہنے والے دانیال خان اس کو دیکھ کر مسکرانا نہیں بھولتے۔

لیکن شیریں کی قسمت کہ ان تک پہنچنے سے پہلے انہیں سرجن نثار نے اچک لیا۔

"اخاہ دانیال خان۔! اس محفل میں اس وقت آپ کا ذکر ہو رہا تھا۔ خدارا جواب میں وہ گھسا پٹا شعر نہ

پڑھیے گا جو موقع محل کے مطابق بھی ہے۔ دراصل ہم ایک پکنک ترتیب دے رہے ہیں اور خانم بیلا کو آف ڈیوٹی کی اجازت درکار ہے۔"

بیلا کا منہ رنگ گیا۔ بات کو اس انداز میں تو اس نے لیا بھی نہیں تھا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔" انہوں نے ناگواری سے کہہ کر اپنے راستوں کو پھر اسی طرف موڑ لیا جہاں خوش باش ہنستی مسکراتی ایک ہستی ان کی منتظر تھی۔

"ہم بڑے مزے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

"اچھا۔" وہ خوش مزاجی سے آرام دہ صوفے پر دراز ہو گئے۔ "کیا پروگرام ہے اور پروگرام سنانے سے پہلے براہ کرم یہ غل غپاڑہ بند کرو۔"

سارہ رب نواز نے بٹن پش کر کے کیسٹ باہر نکال دیا۔

"افسوس لالہ دانیال۔ تان سین کی روح کو کتنا افسوس ہوا ہو گا۔"

"شکر ہوا کہ تان سین تمہارے ڈسکو کی دریافت سے پہلے مر گیا۔ ہاں کیا ہے پروگرام؟"

"لالہ نثار ہم لوگوں کو آبشار کے نیچے باربی کیو پر لے جا رہے ہیں۔"

"لالہ نثار۔" انہوں نے شوخ سی آواز میں سرجن کی طرف دیکھا تھا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا یہ تکے کباب تلنے کے بھی ماہر ہیں۔"

"ماہر ہمارے پاس موجود ہے لیکن معلوم نہیں کیوں جب سے میرے پاس بیٹھا ہے ایک سے ایک اعلیٰ برمحل با موقع لنگڑا بہانہ گھڑے جا رہا ہے۔" سرجن نثار نے اپنے لہجے کی سنجیدگی کو ہاتھ سے چھوڑا نہیں۔

"کون ہے وہ ماہر؟" بے ساختگی میں کیے سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر دانیال خان نے ایک لمبی سی اوہ" کی تھی۔ جیسے وہ سوال کرتے ہی بات کی گہرائی تک چلے گئے تھے۔

انہوں نے ایک مرتبہ بھی بیلا سے رسماً "نہیں کہا کہ آپ ضرور چلیے کیا حرج ہے ؟

نہ انہوں نے سرجن نثار کی بات کا جواب دیا تھا کہ آیا اس کو ڈیوٹی آف مل سکتا ہے یا نہیں۔

گویا وہ بالکل بے کار بے حقیقت اور فضول سی چیز تھی۔

اسی لیے اس نے سرجن نثار اور سارہ رب نواز کے بہت اصرار کے باوجود بڑے احترام اور بڑی محبت سے معذرت کر لی تھی۔

"بے بے اکیلی ہیں۔ کافی کام باقی ہے۔ کنٹریکٹرز کی پارٹی عنقریب وزٹ کرے گی۔ مجھے اصل میں بے بے کے بغیر کہیں آنے جانے کا مزا نہیں آتا۔"

نہ جانا چاہے انسان تو بہانے بے حساب دلیلیں بے شمار۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ خود کو بے وقعت نہیں کرے گی۔ نثار اور سارہ کی محبت کا احترام اپنی جگہ۔ بے بے کے اصرار کو بھی وہ سمجھ رہی تھی۔ لیکن وہ اس پارٹی سے بچنے کے لیے صبح سے چھپتی پھری۔ حتیٰ کہ وہ شور مچانے والا اور ہنگامہ کرنے والا قافلہ گھر کو ویران کر کے چلا ہی گیا۔ وہ معمول کے مطابق بے بے کے پاس آ بیٹھی۔

پھر سرجن نثار کے احترام میں اس نے رات کے کھانے کے لیے اپنے بابا کی پسند کے وہ کھانے بنائے یہ عجیب اتفاق تھا۔ سرجن نثار ہر اس کھانے پر مرتے تھے جو ان کے گھر میں اکثر پکتا تھا۔ کالی توریاں اور سبز

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسالے کا گوشت وہ کچن میں تھوڑی دیر مصروف رہ کر واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

رات کے کھانے سے پہلے وہ لوگ واپس آ گئے۔ بے بے باہر کے خطروں سے گھبرا کر آسمان کی طرف پھونک پھونک کر ورد کر رہی تھیں۔ وہ آئے تو بے پروا تھے۔ ان کے پیٹ بھرے ہوئے اور جسم تھکے ہوئے تھے۔ اس کے بعد بھی سرجن نثار نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اور جی بھر کر تعریف کی۔ وہ عجیب سادہ سادہ کھلے دل کے آدمی تھے۔ گوشی کے بعد اگر کوئی شخص اس کو واقعی دوستی کے لائق لگا تو وہ سرجن نثار تھے۔ وہ جتنی دیر اس کے آس پاس رہتے اُس کی کسی نہ کسی بات کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر اس کا خون بڑھاتے رہتے۔ باقی لوگ برائے نام ہی کھانا کھا رہے تھے۔ کیونکہ دن بھر انھوں نے خوب چگا تھا۔ لیکن وہ بے تحاشا خوش اور آزاد تھے۔ عام طور پر جب ان کی محفل میں دانیال خان نہ ہوتے 'وہ اتنے ہی خوش ہوتے۔ قہقہے جیسے ابل ابل کر گرتے۔ دانیال خان کی زندگی بہت مصروف تھی۔ سارا دن ان کے پاس گزار کر ان کا بہت ہرج ہوا تھا۔ وہ اپنے آفس میں جا بیٹھے تھے۔ وہ ان کی محفل میں جتنا بھی ریزرو رہتے دانیال خان کے بغیر ان کا گزارا بھی نہیں تھا۔

صبح ناشتا کرنے سے پہلے سرجن نثار واپس چلے گئے۔ وہ لوگ ناشتا کرنے میز پر آئے تو معلوم ہوا کہ دانیال خان نے ان کو صبح کی نماز کے ساتھ ہی پشاور روانہ کر دیا ہے۔ کیونکہ سرجن نثار کا آج کلینک میں کوئی اہم دن تھا۔ شاید باقی سب لوگ ان کے ارادوں سے آگاہ تھے سوائے بے بے اور بیلا کے۔ کیونکہ وہی دونوں اس خبر پر حیران ہوئے تھے۔ بے بے الفاظ کی صورت میں اور بیلا لفظوں کے بغیر۔

"بے بے ہم لوگ ان کو گڑھی کے گیٹ تک رخصت کرنے گئے۔ پھر پیدل واپس آئے اور ہاں آپ کے لیے انھوں نے ایک تحفہ بھی دیا ہے۔"

"تحفہ۔" بیلا نے حیرت سے سر اٹھایا۔ سارہ اسی سے مخاطب تھی۔

"ہاں تحفہ۔ ٹوکن آف فرینڈشپ کے طور پر انھوں نے یہی کہا تھا۔"

"وہ کیا چیز ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بوجھو۔ پہلے سائز' پھر موٹائی' پھر دیگر سوال "آیا وہ نرم ہے کہ سخت۔"

"اگر واقعی انھوں نے کوئی تحفہ دیا ہے تو وہ کتاب ہو گی۔"

"ہائیں۔" سارہ نے حیرت سے شیریں کی طرف دیکھا۔

"کمال ہو گیا ہے۔ تحفے کو تو کمال بوجھا۔ اور اس قدر یقین سے۔ لیکن دینے کے معاملے میں شک؟" وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی۔ ایک کم موٹا لیکن خوب چوڑا سا پیکٹ اٹھا لائی۔ بیلا نے سب کی موجودگی میں پیکٹ کھولا اور سب کے جھکے ہوئے سروں کے درمیان سے پتلی پتلی کتابیں نکال کر میز پر رکھ دیں۔

یہ چار کتابیں تھیں۔ کلام بلھے شاہ' کلام بابا فرید' رحمن بابا اور دیوان غالب۔

پیکٹ پر اسکاچ ٹیپ سے اٹکے وِش کارڈ پر لکھا تھا۔ "ہم کسی سے نفرت نہیں کرتے۔ ہیں نا۔"

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ یہ سب لوگ خان تھے۔ قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے اپنی اپنی ذات اور زبان کے قیدی۔ ان میں صرف۔ وہ دونوں ہی باہر کے تھے۔ ان سے اجنبی تھے اور غیر۔

گویا یہاں جو عام طور پر غیر پٹھانوں سے نفرت کی جاتی ہے اس کا شکار صرف وہی نہیں' سرجن نثار بھی تھے' سرجن نثار کے اس سادہ سے چھوٹے فقرے میں اس کو شکایتیں نظر آ رہی تھیں۔ تاسف تھا۔

ملامت تھی۔ بیلا کو لگا۔ اس کا سہارا لے کر یہ کسی اور کو سنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ کوئی اور اس چھت کے نیچے کون ہو سکتا ہے۔

اس کے حلق میں نمکین پانی اٹکنے لگا۔ واقعی وہ یہاں عمر بھر کی خدمت میں زندگی بھی تیاگ دے تو اس علاقے کے لوگ اس کو نہیں قبولیں گے۔ سوائے بے بے کے۔ اور بے بے بھی ڈر کے خوف سے۔ آہستہ آہستہ....

خان گل بھی شاید اس کو اس علاقے میں مان لیں۔ اگر وہ ان کی شرائط پر پوری اترے۔ وہ ان جیسا لباس پہنے' ان کی زبان بولے۔ لیکن اس میں بھی گارنٹی کوئی نہیں۔

شیریں تمکنت اور غرور سے گردن اٹھائے تحفے سے بالکل بے نیاز سارہ سے پشتو میں کچھ کہہ رہی تھی۔ سرجن نثار کی موجودگی میں جو عام اردو بولی جاتی تھی اب اس کا لحاظ نہیں رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کو ہر کام سے فارغ ہو کر اس نے فرصت سے ان کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان کتابوں کی پرنٹنگ بہت اچھی تھی۔ بہت قیمتی کاغذ استعمال ہوا تھا۔ بائینڈنگ بھی لاجواب تھی۔ تیل سے چھپے تھیں جیسا ٹائٹل' دریوں قالینوں اور فرشی دوتہیوں کے ڈیزائن۔

اسے افسوس سا ہوا۔ یہ لوگ گورنمنٹ کے سب ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ حکومت پاکستان کے وفادار ہیں لیکن پھر بھی سرداری اور جاگیرداری کے نشے میں چور چور۔ اسے سرجن نثار کے دکھ کا بہت دکھ ہوا۔ وہ پنجاب سے تھے۔ قسمت نے ان کو بچپن میں سرحد میں لا بسایا اور جانے سرحد ان کو کب اپنائے گی۔

وہ ان کی دی ہوئی کتابوں کو ورق ورق کر کے بہت دھیان اور بہت احتیاط سے پڑھتی رہی۔ گو وہ خود آسانی سے پشتو یا پنجابی شاعری سمجھ نہیں سکتی تھی۔ آخر میں کچھ معنی تھے اور یہ غالب تھا اس کا اپنا۔

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

اس نے نرم تکیہ عادتاً پیٹ پر رکھا۔ لیمپ آف کیا۔ نائٹ بلب بستر کے ساتھ ٹھیک کیا۔ ایک تواتر سے آہستہ آہستہ وہ غالب کا مصرعہ دہرانے لگی۔ وہ تو خود ایک سیلاب بلا تھی۔ اور پتا نہیں کس کے گھر جائے گی۔

رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ اس کو لگا اس کے دروازے کے باہر کوئی ہے۔

اسے شدید نیند آ رہی تھی اور غالباً وہ سو بھی گئی تھی۔ کتنی رات گزر گئی تھی پہلے پہل اسے شک گزرا سارہ شیریں وغیرہ کسی پروگرام کی تیاری میں مشغول ہیں یا۔۔۔ لیکن اتنی رات گئے۔ ایک سائیڈ ٹیبل سے گھڑی اٹھا کر دیکھی چمکتے سنہری ڈائل رات کے سوا دو بجے کا پتا دے رہے تھے۔ وہ بیدار ہو گئی۔ اتنی رات گئے اس کے دروازے پر کون ہو سکتا ہے۔ اس کا کمرہ تو راستے میں بھی نہیں پڑتا۔ کہ کوئی اتفاق سے جاگنے والا یہاں سے گزرا ہو۔ وہ مکمل طور پر بیدار ہو گئی تھی۔ اور ہلکی ہلکی خوفزدہ۔

اسے لگا۔ اس کے دروازے پر جو کوئی ہے شدید تکلیف میں مبتلا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس کو پکار رہا ہے۔ وہ بے ساختگی میں دروازے کی طرف بڑھی کہ بولٹ کھول دے۔

لیکن ٹھٹک کر رک گئی۔ لیکن تکلیف میں مبتلا کوئی شخص اس کے پاس کیا کرنے آیا ہے۔ وہ ڈاکٹر تو نہیں ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہیلا۔" دروازے پر جیسے کسی نے انگلی سے دستک دی۔ دھیمی آواز۔ دبا ہوا لہجہ۔ اور ایک لمبی کراہ۔ وہ دروازے کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ اور یہ آواز تو وہ لاکھوں آوازوں کے شور میں بخوبی پہچان سکتی تھی۔ اس کی نیند بالکل بھاگ گئی۔ اس نے بے ساختگی میں کی ہول گھما کر دروازہ پورا کھول دیا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔

"کیا آپ جاگ رہی ہیں۔" دانیال خان نے ایک ہاتھ سے سہارے کے لیے اس کے دروازے کی چوکھٹ پکڑ رکھی تھی۔ وہ ایسے لباس میں تھے جیسے ابھی باہر سے آئے ہوں۔ فل بوٹ گرم جیکٹ میں ان کے چہرے کی تکلیف چھپی نہیں تھی۔

"جی"

"کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ آئیں گی۔ میرے کمرے میں؟" وہ اپنی بات کہہ کر اس یقین سے مڑ گئے جیسے وہ ان کی ہر بات کبھی ٹال ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ میکانکی انداز میں دو قدم اٹھا کر رک گئے۔

"گرم کپڑے لے لیں۔ باہر بہت سردی ہے۔ کوئی اوور کوٹ یا گرم شال۔"

وہ واپس اپنے کمرے میں مڑی۔ گرم کالی چادر کندھوں پر ڈال کر وہ انہی قدموں سے ان کے پیچھے آ گئی۔ وہ اس سے دو قدم آگے ہو گئے تھے لیکن اسے محسوس ہوا وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے ہوں۔ اور ہر قدم پر ان کے منہ سے ایک اذیت بھری آواز نکلتی جیسے وہ ہونٹوں میں دبا کر روک رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کے قدم ہموار ترتیب سے اور تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ اس کو ان کا ساتھ دینے کے لیے دوڑنا پڑا۔ اس کے کمرے سے ان کے کمرے تک بہت فاصلہ تھا۔ وہ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد بل کھاتے زینے کی ریلنگ کے پاس رک گئے۔ چھت میں نصب دھیمی روشنی کے بلب میں اس نے دیکھا ان کا چہرہ سرسوں کی طرح زرد تھا۔ آنکھوں کی ذہانت کسی اذیت کا شکار ہو کر مدھم سی ہو گئی تھی۔ وہ جیسے مزید چلنے کے قابل نہیں رہے تھے لیکن وہ بہت جلد یہ فاصلہ طے کرنا چاہ رہے تھے۔

"آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس نے ان کے ٹھہر جانے کے بعد تشویش سے پوچھا تھا۔

"شش۔" انہوں نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کرا دیا۔ لمحہ بھر کے لیے انہوں نے اپنی کمر سے ٹیک لگا کر ریلنگ کا سہارا لیا۔ پھر وہ چلے اور بری طرح لڑکھڑا گئے۔

"آپ میرا سہارا لے لیں۔" وہ کشادہ دلی سے کہہ کر ٹھٹک گئی۔ "میرا مطلب ہے اگر آپ۔۔"

انہوں نے بازو بڑھا کر اس کے شانے کا سہارا لے لیا۔ "اوف" ایک بھنچی سی آواز ان کے منہ سے نکلی۔ جیسے اس طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ وہ وزنی بھاری سا ٹھنڈا یخ ہاتھ اس کی پشت سے گزر کر اس کے دائیں کندھے پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔ شاید اس طرح ان کے لیے چلنا آسان ہو گیا تھا۔

کتنے زمانے اور کتنی صدیاں گزریں۔ ایک دفعہ پہلے بھی انہوں نے اسی طرح چند قدم اٹھائے تھے۔ کون کہتا ہے تاریخ اور وقت اپنے آپ کو نہیں دہراتے۔ صرف اسی فرق کے ساتھ کہ دور کہیں گیدڑ رات کے بھیانک سناٹے میں رو رہے تھے۔ کتوں کے ایک تواتر سے بھونکنے والی آوازیں اسے خوفزدہ کر رہی تھیں۔ انہوں نے اس کا سہارا لینے کے باوجود اپنا بوجھ خود اٹھا رکھا تھا۔ چند قدم چل کر انہوں نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

"آپ ڈر رہی ہیں؟"

"تھوڑا سا۔" اس نے دیانتداری سے کہا۔

"یہ جنگل ہے اور آس پاس ہر طرح کے جانور ہیں ہر طرح کے۔" انہوں نے معنی خیز لہجے کو اپنی زخمی چال کے ساتھ برقرار رکھا۔ "اور معلوم نہیں ہوتا خود کسی جنگلی جانور کا شکار ہو کر آ گئے ہوں۔ اور کون جانے وہ چیتے ہوں۔"

"اور آپ کو ڈرنا نہیں ہے۔ کیونکہ میں آپ سے بہت مشکل کام لینے والا ہوں۔"

انہوں نے تکلیف کی ایک اور لہر ہونٹوں میں دبا لی۔ وہ دل ہی دل میں مضبوط اور بہادر ہو گئی۔ پتا نہیں وہ جس مدد کے لیے بلائی گئی تھی۔ اس قابل بھی ہو کہ نہیں۔ لیکن اس کو کسی نہ کسی قابل بن کر ہی دکھانا ہے۔ اور سامنے ہی دانیال خان کے کمرے تھے۔ بل کھاتے زینے کے اوپر لائبریری۔ نیچے تہ خانہ اور ساتھ ساتھ ان کے آفس۔ وہ سیڑھیاں اترنے اور چڑھنے کے بجائے اپنے سونے والے کمرے میں داخل ہو گئے۔

"آیئے۔" انہوں نے دروازہ کھول کر اندر آنے کے لیے راستہ بنایا جیسے وہ ان کے گھر مہمان آئی تھی۔

"ہاں۔" وہ کرسی پر بیٹھے تو ایک لمبی طویل آہ جسے ایک مدت اور وقت سے انہوں نے سینے میں دبا رکھا تھا' پھسلتی چلی گئی۔

"آپ کو زحمت تو ہو گی ذرا یہ چادر تو دیجئے۔"

اوڑھنے والی خوبصورت سی سفید چادر انہوں نے بوٹ کے نیچے رکھی اور آہستہ آہستہ فل بوٹ کے تسمے کھولنے شروع کر دیے۔

"یہ پردے اچھی طرح گرا دیں۔ اندر کی روشنی باہر بالکل نہیں جانی چاہیے۔" رسمی فقروں کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے احکامات جاری کرنے شروع کر دیئے۔ شاید لفظوں میں ضائع کرنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں بچا تھا۔

اس نے مشینی انداز میں کھینچ کر چاروں طرف کے پردے برابر کر دیئے۔ تیز مسٹرڈ رنگ کے ویلوٹ کے پردوں نے یقینی طور پر روشنی کے انعکاس کو ناممکن بنا دیا ہو گا۔ احتیاطاً اس نے شیشے کے لاک چیک کیے۔ یہ تو اسے پتا چل گیا تھا' اندر جو کچھ ہونے والا ہے' نہایت رازداری کا معاملہ ہے۔ لیکن کیا ہونے والا ہے۔ شاید اس کے فرشتے بھی یہاں تک نہیں سوچ سکتے تھے۔ دائیں پاؤں کے فل بوٹ کے تسمے کھول کر ایک اذیت ناک آواز سے انہوں نے جوتا اتارا تو ایک ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔

"سوری" اس نے اپنا منہ اپنی ہی ہتھیلی کے زور سے بھینچ لیا۔

ان کا فل بوٹ خون سے تر بتر سفید چادر پر گر پڑا تھا۔ ابھی تک ان کی زخمی ٹانگ سے سرخ خون کے لوتھڑے چپکے ہوئے تھے۔

"ڈر رہی ہو ہیلا؟" انہوں نے بلاشبہ تکلیف کی شدت میں اسے شدید اپنائیت سے پکارا تھا۔

"میں واقعی بُرا آدمی ہوں۔ آپ ٹھیک سمجھی ہیں۔ میں ایک سے زائد مرتبہ آپ کو اس آزمائش میں ڈال چکا ہوں۔"

وہ خاموشی سے ان کے زخمی پاؤں کے نزدیک دو زانو بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ ان سے بحث کی پوزیشن میں نہیں تھی ورنہ وہ اس سے ایک ان کہا بیان منسوب کرنے کی وجہ ضرور دریافت کرتی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اپنے ہاتھ دکھائیے۔ اوں" انہوں نے اس کے پھیلائے ہوئے ہاتھ دونوں ہاتھوں میں دبا کر چھوڑ دیئے۔

"اتنے یخ نہیں ہیں۔ اور کانپ بھی نہیں رہے۔ اسی لیے میں نے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ اور آپ کے سوا کسی کا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ بیلا! میری پنڈلی میں گولی لگی ہے۔" انہوں نے ہانپتے ہوئے سانس کے ساتھ خود کو کرسی سے جیسے نیچے قالین پر گرا لیا۔ "اور یہ گولی آپ کو نکالنی ہوگی۔"

"اوہ۔" وہ دہشت زدہ ہو گئی۔ "کیوں نا گڑھی کے ڈاکٹر کو بلا لیں؟"

"کوئی ڈاکٹر نہیں۔" انہوں نے قطعیت سے کہا۔

کسی اور کو اٹھا دیتے ہیں۔ قیمت خان کو۔"

"کوئی کسی کو نہیں۔" انہوں نے برہمی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "قیمت خان کو تو کسی قیمت پر نہیں اور آپ کو مباحثے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اگر کچھ دیر اور گزری تو جسم میں بڑا خوفناک انفیکشن شروع ہو جائے گا۔ یعنی زہر پھیل جائے گا۔" وہ اپنے اسی غیر رواداری والے لہجے پر پلٹ آئے تھے۔

"بیسمنٹ میں جائیے۔ نچلی الماریوں میں سے انتہائی لیفٹ والی الماری میں میرا ٹول بکس پڑا ہے وہ اٹھا لائیے۔ اور اتنی خاموشی سے، اتنے دبے پاؤں جیسے بلی جاتی ہے۔"

اس نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور احکامات کی تعمیل میں چپ چاپ باہر نکل آئی۔ ان کی حس مزاح کسی بھی ناموزوں جگہ بیدار ہو سکتی ہے۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے چلی گئی۔ معلوم نہیں اس کو بیسمنٹ کی بجلی جلانے کا اختیار ہے بھی یا نہیں۔ لیکن بجلی جلائے بغیر وہ نہ الماری تلاش کر سکتی تھی نہ کھول سکتی تھی۔

بہت جلد ہی وہ ٹول بکس لے کر بغیر کوئی آواز پیدا کیے واپس آ گئی۔

"گڈ۔" وہ فرش پر بیٹھے بیٹھے بولے۔ "آپ نے محسوس کیا۔ باہر کسی قسم کی کوئی آواز تو نہیں تھی؟"

"میرے خیال میں تو سب سو رہے ہیں۔"

"ہوں۔ اب یہ بکس میرے پاس رکھ دیجیے۔ اور ڈریسنگ روم سے میرا میڈیکل بکس اٹھا لائیے۔"

وہ نہایت تابعداری سے کمرے اور غسل خانے کے درمیان والے ڈریسنگ روم کی وارڈ روب سے ان کا میڈیکل بکس اٹھا لائی۔

"یہ لیمپ بالکل نزدیک لے آئیے۔ یہاں، اس طرح لیے۔ شاباش۔"

انہوں نے ٹول بکس کھول کر ایک تیز دھار چاقو نکالا۔ اس کی دھار کو انگلی پر چیک کیا۔

"ذرا اس کو آگ پر سرخ کر لیجیے۔" اس کے سناٹے نکل گئے۔ اس ایک لمحے سے پہلے اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ اس سے کیا کام لینے والے ہیں۔

"بیلا" وہ بہت نرم روی سے کہہ رہے تھے۔

"میں نے آزمایا بھی ہے۔ دیکھا بھی ہے" آپ بہت بہادر ہیں۔ بہت باہمت لڑکی ہیں۔ یہ کوشش آپ ہی کر سکیں گی۔" یہ اچھا مذاق ہے۔ بار بار اس کو ایک مصیبت دکھا کر یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ بہادر ہے بہت بہادر۔

حالانکہ میں بہت بزدل ہوں۔ اس نے سوچا۔ میرا بھی ایسے واقعات پر جی چاہتا ہے میں بیہوش ہو

جاؤں، چیخیں ماروں اور زور زور سے رو پڑوں۔ لیکن بس میں صرف برداشت کر لیتی ہوں۔

وہ بھی اپنی تکلیف برداشت کر رہے تھے۔ حالانکہ وہ دیکھ رہی تھی کہ دم بدم ان کی تکلیف میں کتنا اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر تیز دھار چھری آگ پر تپانے لگی۔ چھری کی دھات تپ کر سنہری ہو گئی تھی۔

"بس اب اس کو ایک طرف رکھ دیجیے۔ اور بڑے دھیان سے میری بات سنیے۔"

وہ اتنا دھیان کہاں سے لاتی۔ اس نے چھری اٹھا کر پیتل کی ڈیکوریشن والی پلیٹ پر رکھ دی۔ اور حکم کے بموجب ان کے قریب آ گئی۔

"ہاں" انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑتے کہا۔ "اب یہ تھوڑے سے ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ اور کانپ بھی رہے ہیں۔ لیکن اتنے نہیں۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک بے ہوش ہو چکا ہوتا۔"

وہ اتنی اذیت میں مسکرا رہے تھے۔ تکلیف اٹھا کر اس کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے گلے میں پڑے اس بہادری کے ڈھول کو تو بجانا ہی تھا۔

"میں ڈری ہوئی نہیں ہوں۔ شاید تھوڑی سی سردی ہے۔ آپ بتائیے اب کیا کرنا ہے۔"

"یہ دیکھیے۔" انہوں نے میڈیکل بکس کھولا۔ "یہ گاز ہے۔ یہ کاٹن اور سفید رنگ کا سفوف اسکا رین پاؤڈر ہے۔ آپ اس جگہ کٹ لگائیں گی۔ اس چمٹی سے گولی کھینچ لیں گی۔ یہ سرخ والی دوائی لگا کر یہ ڈھیر سارا پاؤڈر الٹ دیں گی اس کے فوراً بعد آپ کو ڈریسنگ کرنی ہے۔ اور اگر میں بے ہوش ہو گیا تو یہ سالٹ میری ناک سے لگانا ہے۔"

اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول کر ایک جگہ رکا ہوا تھا۔ سانس ٹھہر گئی تھی۔

وہ کسی ماہر سرجن کی طرح سینئر طالب علموں کو بڑی بے نیازی سے جیسے کسی اور مریض کی سرجری کی تفصیل بتا رہے تھے۔

"اور اگر میں شور مچاؤں۔ گھبرا جاؤں۔ یا میری چیخ نکل جائے تو آپ نہیں گھبرائیں گی۔ نہ افراتفری میں کسی کو بلانے نکل جائیں گی۔ آپ تیار ہیں۔"

"جی" اس نے ثابت اور صاف آواز میں کہا۔

"تو بسم اللہ پڑھیے۔"

وہ اٹھی تو اس کے قدم لڑکھڑائے تھے۔ لیکن غنیمت ہوا کہ وہ اپنا زخموں سے بھیگی روئی سے خون پونچھ رہے تھے۔ ان کا چہرہ تکلیف کی شدت سے نیلا نیلا تھا۔ لیکن وہ ہر مرتبہ اس سے آنکھیں ملتے ہی مسکرا دیتے۔ وہ صبر و ضبط کے اعلیٰ ترین میدان جیت کر سرخروئی اور بہادری سے جیتے بیلا کے اندر کہیں رقم ہوئے جا رہے تھے۔

وہ چپ چاپ چھری اٹھا لائی چھری اب ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

اس نے ان کے کہنے کے مطابق پہلے ڈیٹول والی روئی سے ڈس انفیکٹ کیا۔

دائیں ٹانگ کے روئیں میں وہ ابھری ہوئی چھوٹی سی بلٹ تقریباً باہر ہی پڑی تھی۔ لیمپ کا شیڈ نیچے جھکا کر اس نے تمام تر محویت سے چھری۔ ان کے زخم پر رکھ کر دبائی۔

"اللہ" نچلا ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر انہوں نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بے۔ لا۔ بے لا۔ بیلا۔" ہلکی ہلکی سسکیوں کی صورت میں اپنا نام ایک تواتر سے خون کی بوندوں کی طرح اس کے کان میں ٹپک رہا تھا۔ وہ چھری آہستہ آہستہ گھماتی ٹانگ میں گھاؤ گہرا کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ پنسل جیسی وہ چھوٹی گولی باہر کو لڑھک گئی۔ اس نے ڈس انفیکٹڈ شدہ چمٹی سے کھینچی گولی ٹن سے پنسل کی پلیٹ پر گرائی۔

آدھا مرحلہ بخیر و خوبی گزر گیا۔

لیکن دانیال خان کو زخموں کی شدت سے چور چور بے ہوش سا کر گیا۔ ان کا سر ایک طرف لڑھکا ہوا تھا۔ آنکھیں غنودگی کی حالت میں نیم کھلی تھیں۔ اور ٹانگ سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے ٹانگ سے دھیان ہٹا کر تیزی سے سالٹ والی شیشی ان کی ناک کی طرف بڑھائی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" انہوں نے نقاہت سے اس کا ہاتھ پرے ہٹا دیا۔ "آپ ڈریسنگ کیجیے۔"

وہ تیزی میں نیچے جھک کر پاؤڈر اور بدبو دار رنگ کو رہ داؤں کے چھڑکاؤ کے بعد آہستہ آہستہ پٹی کسنے لگی۔ موٹی روئی اور ٹھنڈے پانی کے بار بار چھینٹوں سے خون بہنے کی رفتار میں کمی آگئی تھی۔ کسی بھلے وقت میں کیا فرسٹ ایڈ کا کورس ہی کام آیا۔ ورنہ کوئی زخم کے ایسے حصے پر آسانی سے پٹی باندھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی چابکدست ڈسپنسر کی طرح بڑی محویت سے ڈریسنگ کے بل تقسیم کر رہی تھی۔

اذیت ناک مراحل رات کے اس ڈھلتے پہر میں آہستہ آہستہ گزر ہی گئے۔

اس نے وہیں بہت سے فلور کشن ادھر اُدھر بچھا کر ان کے لیے قالین پر ہی آرام دہ بستر تیار کر دیا۔ خون آلود چادر سمیٹ لی۔ ٹول بکس اور میڈیکل بکس ایک طرف دھر دیے۔

"آپ کے لیے دودھ لا دوں۔ گرم دودھ اچھا رہے گا۔"

"نہیں۔ شکریہ۔" انہوں نے وہیں تکیوں پر دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ "چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر واپس رکھ کر میرے پاس آیئے اور دھیان سے میری بات سنیے۔"

ان کی بند آنکھوں سے اوپر پیشانی پر لکیروں میں تکلیف لکھی تھی۔ ان کا رنگ ایک دم ہی سفید پڑ گیا تھا اس وقت ان کو دودھ کے ایک گرم گلاس کی شدید ضرورت تھی۔ لیکن وہ شاید اس کا باورچی خانے میں جانا پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ اس طرح جاگے جانے کا ڈر تھا۔ اسٹڈی میں رکھے فریج میں دودھ ندارد تھا۔

"آپ کو بلیک کافی دے دوں؟"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گی۔" انہوں نے آنکھیں کھولیں تو وہ سرخ بھی تھیں اور تھکی ہوئی بھی۔

وہ ہیٹر پہ پانی ابال کر کافی پوڈر حل کر کے ان کے پاس لائی تو وہ نیم وا آنکھوں سے منتظر ہی تھے۔

بیلا۔" زخموں سے چور آواز میں جیسے انہوں نے اسے خواب سے پکارا تھا۔

"میں نے تمہیں کس قدر تھکا ڈالا ہے۔ رات کے ایسے وقت میں جب ساری دنیا چین کی نیند سو رہی ہے۔ تمہیں میں نے تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ تم بھی مجھ پر لعنت بھیجتی ہو گی۔"

"بالکل نہیں۔" وہ آلتی پالتی مار کر ان کے پاس ہی آبیٹھی۔ بے ہوشی کے بالکل نزدیک جا کر بھی انہوں نے خود پر سے اختیار نہیں کھویا تھا۔ وہ افسوس کرنا، معذرت کرنا، مسکرانا کچھ بھی تو نہیں بھولے تھے۔

"تم نے کتنی بری رات گزاری ہے بیلا کیا تم یہ رات بھول جاؤ گی۔"

وہ چپکی رہ گئی۔ پتا نہیں وہ اس سے بھول جانے کا مطالبہ کر رہے تھے یا نہ بھولنے کا۔

"یہاں اس گھر میں بہت سے لوگ موجود ہیں۔ خان گل ہیں شیریں ہیں سارہ ہے۔ لیکن میں اس کام کے لیے تمہارے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔"

شاید اس لیے کہ میں بہادر ہوں آپ کے بقول۔ اس نے دل میں سوچا۔

انہوں نے آنکھیں موند کر سر دوبارہ تکیے پر ٹکا لیا۔

"اور میں کسی پر غلط بھروسہ نہیں کرتا۔ دیکھو، تم نے عام لڑکیوں کی طرح مجھ سے فضول سوال نہیں کیے۔ کہ یہ گولی کہاں سے لگی ہے؟ کس نے چلائی؛ رات کے وقت میں کہاں تھا؟ میرے گارڈز کدھر تھے؟ حالانکہ یہ سب سوال تمہارے دل میں بھی موجود ہوں گے۔"

اس نے ان کا خالی کیا مگ ایک طرف رکھ دیا۔

"دیکھو بیلا۔ گھر بھر میں اس واقعہ کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ گڑھی کی سیاست میں ایک بلٹ کا مطلب ایک بلٹ نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب ہے دس خون۔ خان گل، قیمت خان کسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہونے پائے ورنہ وہ خون خرابہ مچا دیں گے۔ وہ ان کے دس آدمی کھڑے کھڑے بھون دیں گے۔ اور ان کے آدمی ہمارے سو آدمی۔ یہ یہاں کی روایت ہے کہ ایک خون کا انتقام ہزاروں خون بہا کر نسلوں تک چلتا ہے۔"

"لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ کی زندگی محفوظ ہے۔"

گھٹنے پر دھرا اس کا برف سا ہاتھ انہوں نے بے ساختگی میں اپنی گرفت میں لے لیا۔

"چھوٹی سی بہادر لڑکی۔ تم فکر نہیں کرو۔ زندگی تو صرف خدا ہی لے سکتا ہے اور وقت سے پہلے کچھ ممکن نہیں۔ اوہ۔ تم تو ٹھنڈی برف ہو رہی ہو۔ اپنے اوپر کمبل ڈال لو۔"

"میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے۔"

"ہاں، تمہیں اب جانا چاہیے۔" بے خیالی میں اپنا فقرہ ادا کر کے انہوں نے اپنی گرفت میں لیے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ بھی جما دیا۔ وہ بخ ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں اس کا ٹھنڈا برف سا ہاتھ کہیں چھپا ہوا تھا۔

"تمہیں جانا چاہیے۔ صبح ہونے والی ہے۔"

انہوں نے اس کے ہاتھ کو آزاد کیے بغیر اپنی بات دہرائی تھی۔

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" اسی دھیمی آواز میں جواب دے کر وہ اسی طرح لیٹے تھے۔

"مجھے جانا ہے پلیز۔"

"ہوں"

"صبح ہونے ہی والی ہے۔"

"ہاں بیلا۔ تم جاؤ۔ اچھا ہے تھوڑا سا سو لینا۔" انہوں نے بند مٹھیاں کھول دیں۔

وہ خون آلود چادر اٹھا کر دروازے تک گئی تھی پھر رک گئی۔

"کیا رات بھر یہ دروازہ کھلا رہے گا۔ آپ کی زندگی محفوظ تو ہے نا؟"

وہ گردن ذرا سی اٹھا کر مسکرا دیے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جب تک تم ہو بیلا۔ مجھے نقصان پہنچانے والوں کو شکست دیتی رہو گی۔ تمہارے ہوتے میری زندگی ہر طرح محفوظ ہے۔ یہ چادر آبشار میں بہا دینا۔ راستے میں قالین پر خون کے دھبے کہیں ٹپکے ہوں تو ان پر پاؤڈر چھڑک دینا۔ اور کمبل اوڑھ کر اچھی طرح سونا۔ تمہیں کافی سردی لگ چکی ہے۔ کہیں بخار وخار نہ چڑھا لینا۔ اور اب جاؤ۔ خدا حافظ میری ..."

انہوں نے نچلا ہونٹ کاٹ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ دروازہ بند کر کے باہر آئی تو ذہن سے ایک بوجھ آہستگی سے سرک گیا۔ سامنے ٹیرس پر روشن چاند نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ صبح ہونے ہی والی تھی۔ اس نے گہرا سانس اپنے پھیپھڑوں میں بھر کر تازہ ہوا کا لطف لیا۔

"خدا حافظ" اس نے ہونٹوں میں بدبدا کر کہا۔

☼ ☼ ☼

راہداریوں کے شیشوں سے پرے زرد چاند کسی شکست خوردہ مایوس انسان کی طرح بجھا بجھا اور تھکا تھکا سا تھا۔

سردی کی شدت میں موت کو اپنے اتنے نزدیک دیکھ کر اس کے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے اس کے یہ برف ہاتھ اس کے ہاتھوں میں ہلکے ہلکے لرز رہے تھے جو اپنی ہر اذیت' ہر تکلیف دانتوں میں کچل کچل کر خاموش ہوا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ اجنبی' اجنبی مقدس' مقدس سے دکھائی دیئے۔ کپکپا دینے والی ٹھٹھرتی سردی میں وہ ایک عجیب و غریب رات گزار کر آئی تھی۔ کتنی دیر' ان ہاتھوں پر کسی اور کا تسائے رہا تھا۔ اور پتا نہیں کتنی دیر' ان ہاتھوں نے مسیحائی کے نام پر خون بہایا تھا جو ابھی تک پور پور کانپ رہے تھے۔ پتا نہیں سردی کی شدت سے یا جذبوں کی افراط سے۔

یہ تقدیر کی پہلی دوسری نہیں پتا نہیں کون سویں ستم ظریفی تھی۔

آنسہ بیلا چونکہ تم بہادر ہو۔ اس لیے تم پر یہ فرد جرم عائد کی جاتی ہے کہ اس بہادری کی سزا بھگتو۔ اب عمر بھر ان نہ سلجھنے والی الجھنوں سے ٹکرا ٹکرا کر سر پھوڑو کر تم دلیر ہو اور دلیر روتے نہیں' بہادر بسورتے نہیں۔

اور عمریں بھی بیت جائیں تو وہ لوگوں کو یہ نہیں سمجھا سکے گی کہ میرے گلے سے یہ طوق اتار دو۔ میں بہادر نہیں۔ میں تو ادنیٰ سی کمزور لڑکی ہوں۔ بالکل بزدل' نری احمق' کتنی شدت سے میرا بھی جی چاہتا ہے' نہ سہی کا کروچ اور چھپکلی کو دیکھ کر۔ لیکن ایسے نازک نازک وقتوں میں میں بھی دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ کسی کے کالر کے سہارے۔ کسی کا گریبان پکڑ کر کم ہمتی سے' بزدلی سے بین کروں جیسے اس نے رحیم چاچا کی بستی میں دیکھا تھا۔ عورتیں اس کو اجڑا لٹا دیکھ کر فراخدلی سے آواز اور آنسوؤں کے دریا بہاتی تھیں۔ اس لیے بھی شاید کہ ان کو ڈپٹ کر' چپ کروانے والے۔ اور چمکار کر خاموش کرانے والے موجود تھے۔ وہ جو ان کے اپنے تھے جن کے ساتھ مل کر وہ اس کے تنہا رہ جانے کا ماتم بخوشی کر سکتی تھیں۔

چمکتے صاف شیشوں کے پیچھے کالی رات کے آخری حصے کا چاند آج کا اپنا سفر ختم کرنے کے قریب تھا۔ درختوں کی چوٹیوں پر ٹھنڈی یخ روشنی کی کرنیں ہلکی ہلکی لہریں مار رہی تھیں۔ جنگل کے جانوروں نے اپنا الاپ بند کر دیا تھا۔ اور یہ سب اس بات کی علامات تھیں کہ ایک روشن صبح اس کی منتظر ہے۔

اس کے ذمے ایک دو کام تھے۔ اس ڈوبتی رات میں طویل راہداریوں میں ہلکی روشنی کے ہالوں میں قالینوں پر سرخ دھبے تلاش کر کے ان پر ٹالکم پاؤڈر کا چھڑکاؤ کرنا تھا۔ گو یہ معمولی تلاش نہیں تھی لیکن اس کی بصیرت افروز روشن آنکھوں نے اسے آسان بنا دیا۔ پورے راستے میں اس کو جابجا قطرے بکھرے ملے تھے۔ وہ فاصلوں سے ننھی ننھی بوندوں کی صورت ٹپکے ہوئے تھے۔ اس نے گھٹنوں کے بل جھک کر قالین کے روئیں میں ڈھیر سارا پاؤڈر چھڑک دیا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ رواں برابر کرتی۔ سفر طے کرتی گئی۔

وہ ایک جگہ ٹھٹک کر رک گئی۔ قالین پر ایک ساتھ بہت سی بوندیں گری تھیں۔ یہیں سے گول گھماؤ والا زینہ اوپر "ٹیرس" پر جاتا تھا۔ اور یہیں دانیال خان نے چند لمحوں کے لیے اس کے کندھوں پر اپنی سانس ہموار کی تھی۔

زندگی جیسے کچھ دیر کے لیے ٹھہر گئی۔

بہت سارا پاؤڈر انڈیل کر وہ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ شاید صبح کی اذان ہونے والی تھی۔ اذان سے پہلے ملازم بیدار ہو کر ادھر ادھر پھرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے دانیال خان کے ان کہے راز کی حفاظت کرنی ہے تو وقت سے پہلے اپنے کمرے میں گھس جانا چاہیے۔

اس نے کمبل میں گھستے ہی محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں جل رہی ہیں اور گرم گرم ابلتا پانی پلکوں جیسی کمزور دیواروں میں شگاف ڈال کر باہر نکلتا آ رہا ہے۔ اسے خود ترسی کی یہ کیفیت کبھی نہیں بھائی تھی لیکن آج کتنی شدت سے اس کا جی چاہا وہ چلا چلا کر احتجاج کرے۔ ہڑتال کر دے۔ اور تمام تر اعزازات اور تمغات' دینے والوں کو واپس لوٹا دے۔

پھر اس نے سردی کے زور اور آنسوؤں کے ریلوں کو روکنے کے لیے کمبل سر تک تان لیا۔

اتنے بڑے واقعے کے بعد نیند آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ بکھرے ہوئے پزل ہاتھ میں پکڑے کچھ گمشدہ لمحوں کی تلاش میں نامکمل سی تھی۔ ان لوگوں کی کس سے دشمنی ہے؟ اور کیا دشمنی ہے؟

دانیال خان اپنی باتوں کو اتنے راز میں کیوں رکھتے ہیں۔ وہ بار بار حادثوں کا شکار ہوتے ہیں اور ان حادثوں کی پردہ پوشی پر کیوں اس قدر اصرار کرتے ہیں؟

شاید ساری رات بھی ان سوالوں کے جواب کے لیے ناکافی تھی اور اس کے پاس تو یوں بھی رات کا معمولی حصہ باقی تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ جب بھاگم بھاگ ناشتے کے لیے کمرے میں پہنچی تو رتجگوں کی تھکن اور خوف نے اس کو زرد زرد سا کر دیا تھا۔

چمکنے والا کمرہ خاموشی سے اونگھ رہا تھا۔ ایک کونے میں بے بے کے ساتھ خان گل اپنی پلیٹ میں اکلوتا سلائس سجائے بے تابی سے کورم پورا ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

"السلام علیکم۔" اس نے ماضی کے سارے عذاب ناک لمحے فطری بشاشت سے دھونے کی کوشش کی۔

"وعلیکم اسلام" خان گل نے دانستہ منہ لمبا سا بنا کر رکھا تھا۔ وہ شاید بیلا کو یقین دلا رہا تھا میں بہت بیزار ہوں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سارہ اور شیریں کھانے والے کمرے سے غائب تھیں۔ بے بے ایک کونے میں جیسے ایک مسلسل انتظار کی سی کیفیت میں تھیں۔ اس نے غائب شدہ لوگوں کے بارے میں استفسار نامناسب سمجھ کر اپنا سلائس اٹھالیا۔

"خبردار۔ ابھی ناشتا شروع نہ کرنا۔" خان گل نے حسب عادت چھری لہرا کر اسے ڈرا دیا۔

"ابھی سب لوگوں کو ناشتے پر آنے دو۔ ورنہ بے بے بددعائیں دے دے کر پیٹ خراب کرا دیں گی۔"

"کچھ تو خدا خوفی کر خان گل۔"

"ایک گھنٹے سے تو سن رہا ہوں۔ میری شیریں کو آنے دو۔ میری سارہ کو آنے دو۔ اور وہ ہیں کہ سو سو کر گرمی کے مزے لوٹ رہی ہیں اور وہ لالا دانیال خان۔ کوئی پوچھے 'وہ کیوں نہیں آئے۔ کہ بھئی شیر جنگل کا بادشاہ ہے اس کی مرضی انڈے دے یا۔"

یہ کتنی عجیب سی چار دیواری ہے۔

جو اس کے اپنے گھر کے مقابلے میں ہزار گنا وسیع اور بڑی ہونے کے باوجود گھٹی گھٹی اور تنگ تنگ تھی۔ اس نے ایک دبا دبا سانس آزاد کیا۔ فضا میں ہر وقت نہ معلوم سا خوف چھایا رہتا ہے۔ لوگ 'لوگوں سے تعصب رکھتے ہیں۔ محبت کے فطری مظاہروں کو ترسا یہ گھر اسے اپنے گھر کے مقابلے میں بڑا کم مایہ بڑا حقیر سا لگا۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا اس میز پر پہنچ کر جہاں وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول ہیں وہ ایسے قالینوں سے گزر کر آئے ہیں جہاں ان ہی میں سے ایک کا لہو قطرہ قطرہ ٹپکا ہوا ہے۔ وہی لہو جو ان کی اپنی رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔ لیکن سونے والے بھی اور جاگنے والے بھی اس گھر پر گزرنے والی قیامت سے کتنے بے خبر ہیں۔

بے بے ناشتے سے نمٹ کر سارہ اور شیریں سے نمٹنے چلی گئیں۔

خان گل بڑے قرینے سے اپنے ناشتے سے کھیل رہے تھے۔ کبھی چھری اٹھا لیتے 'کبھی کانٹا' انہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔

وہ بھی چپ چاپ خاموشی سے پیالی کے کنڈے سے کھیلتی رہی۔

"خان گل۔ میں نے سنا ہے پٹھان لوگوں کے بہت دشمن ہوتے ہیں۔"

وہ توس میں کانٹا کھبو تا رک گیا۔

"دشمن تو کسی بھی ذی ہوش کے ہوسکتے ہیں۔ جس طرح دوست ہوسکتے ہیں۔"

"تم لوگوں کے کون زیادہ ہیں۔؟"

"دشمن بے شمار لیلیٰ عرلپ۔ اور دوست بے قطار۔ دشمن بنانا ہماری روایت ہے اور دوستی نبھانا ہماری شان۔"

"جو دشمن ہیں 'وہ کیوں ہیں؟ جو دوست ہیں وہ۔؟"

"دشمنی تو معمولی بات پر شروع ہوتی ہے اور بڑی پر بھی ختم نہیں ہوتی۔ مثلاً" چلغوزوں اور اخروٹوں کے باغات میں لکڑی چرانے پر۔ ساتھ کے شہر سے لڑکی اٹھانے پر۔"

"آپ لوگ یہ کام بھی کرتے ہیں؟" اس نے کریدا۔

"الحمد اللہ۔ ہماری سابقہ نسلیں یہ کام کرتی رہی ہیں۔ ہم اس کا پھل پا رہے ہیں۔"

"تم لوگوں نے بھی کبھی ساتھ کے جنگل سے چوری کی ہے۔ یا ساتھ کے علاقے کی لڑکی کو۔..؟"

"دیکھو لیلیٰ۔ میں خود کچھ کہوں گا تو خود ستائشی ہوگی۔ لیکن حقیقت ہے کہ میں یہاں اتنا کم رہا ہوں کہ مجھ پر یہاں کے ماحول کا ذرہ اثر نہیں ہوتا۔"

"اور وہ آپ کے دانیال خان۔"

"میرے دانیال خان۔" اس نے نظر بھر کر لیلا کی طرف دیکھا۔ پھر جیسے کوئی معنی نہ نکال سکنے پر محض ہنس دیا۔ "ان کو میں سرٹیفکیٹ دوں؟ وہ تو جہاں بھر کو سندیں دیتے ہیں۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں 'اچانک آپ کو دشمنوں اور دوستوں کی فہرست مرتب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟"

"میں سوچ رہی ہوں۔ اپنا نام کس میں شامل کروں۔ دوستوں میں یا دشمنوں میں؟" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے۔ ارادے خطرناک ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں نا آپ کی اردو میں۔ پتا نہیں کیا 'حسینوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی۔ لیکن جہاں بھی ہوگا آپ کا نام ابوبن ادھم کی طرح سرفہرست ہوگا۔" اس نے پرانی سی انگلش ورس دہرائی۔

"اور ہاں یہ لسٹ کون سا فرشتہ بنا رہا ہے؟"

"تم بہت بک بک کرتے ہو خان گل۔ اور عنقریب تمہاری بک بک بند ہونے والی ہے۔" وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہو گئی۔ "کیونکہ سنا ہے جنگلات میں ٹھیکے کی ذمہ داری تمہیں سونپی جا رہی ہے۔ ٹینڈر کا کام بھی تم ہی کو کرنا ہے۔"

اس کا چونچال سا موڈ ایک دم بجھ گیا۔ جیسے واٹر بال کا پانی ایک چھناکے سے نکل جائے۔

"میں وہاں نہیں جانے والا۔ بتا دینا دانیال خان کو بھی اور اپنی بے بے کو بھی۔" وہ خفا خفا سا بڑبڑایا۔ وہ اس کا بگڑتا موڈ دیکھ کر خواہ مخواہ ہنس دی۔ وہ اس کا زندہ سا کھلونا تھا۔ کھلاؤ بندر۔ برے موڈوں میں ہنستا تھا۔ اور ہنستے وقت خوش رکھتا۔ وہ کندھے اچکا کر ہنستی رہی۔

"میں کون بھئی؟"

لیکن اس کا بگڑا موڈ سنورا نہیں۔ بہت سارا وقت اچھا گزارنے کی نیت سے بیٹھا خان گل برہم ہو کر نکل گیا۔ کام کاج سے اس کی جان جاتی تھی۔ کتنی دیر تنہا کمرے میں بیٹھے بیٹھے وہ اکتا سی گئی۔ آج اس کا بھی کام میں دھیان نہیں جا رہا تھا لیکن وہ خاموشی سے آفس جا بیٹھی۔ کبھی کبھی انسان پر ایسی کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے۔ جیسے سردیوں میں دھوپ تاپنے کے بعد کی سستی اور کاہلی۔ ایک ہی کرسی پر اک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے جانے وہ کتنے زمانے گزار دیتی اگر پری بے بے کا بلاوا نہ لے آتی۔

اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ یوں ایزی چیئر پر پاؤں اوپر رکھ کر بیٹھ کر سوچنے میں آرام بھی آ رہا تھا اور ہلکا ہلکا نشہ بھی۔ وہ اس نشے کے سرور سے اتنی جلدی ہاتھ دھو کر پھر بے بے کی لمبی لمبی کہانیوں کے موڈ میں نہیں تھی۔ لیکن آخرکار اس کو جانا تھا۔

بے بے کے کمرے میں دس بجے والا قہوہ پیش کیا جا رہا تھا۔ اور اس وقت گیارہ بجے تھے کمرے میں قدم رکھتے ہی ماحول کی آلودگی کا ایک چھینٹا اس پر بھی پڑا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آنسوؤں کی نازک بیلوں کے پس منظر میں جھانکتے شیشوں سے ٹیک لگائے سارہ اور شیریں کسی الجھن میں مبتلا تھیں۔

بے بے کی تھکی تھکی افسردہ نگاہ بھی اس سے چھپی نہ رہ سکی۔

وہ خاموشی سے قہوے کی ٹرالی کے پاس اپنے پیالے میں قہوہ انڈیلنے لگی۔

"رات ایک افسوسناک واقعہ ہوا بیلا۔ تمہیں پتا چلا؟"

وہ دھک سے رہ گئی۔ چوری' اسے احترامِ راز کا بھرم بھی رکھنا تھا۔ اس نے تھکی ہوئی دکھتی نگاہیں آہستگی سے نیچے کرلیں۔

"میں دانیال خان کا ذکر کر رہی ہوں" بے بے نے دھیمے لہجے میں اپنی بات جاری رکھی۔

"وہ باتھ روم میں پھسل گئے اور ان کے شدید چوٹ آئی۔"

"اوہ۔" اتنی دیر سے دبی دبی رکی رکی سانس آہستگی سے باہر آئی۔

"اور انہوں نے رات میں کسی کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ خود ہی الٹی سیدھی پٹی کرلی۔"

شیریں جھپٹ کر ٹرالی کے پاس آئی۔

"حالانکہ روڈ ڈسپنسری کے ڈاکٹر کو تو بلا سکتے تھے۔ یہ تو اس کا فرض تھا۔ وہ اسی بات کی تنخواہ لیتا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دانیال خان ہر تکلیف اپنے کندھوں پر اٹھا کر کیوں خوش رہتے ہیں۔"

اس کا لہجہ چڑا ہوا تھا۔ اور آنکھیں اشکوں کو روکنے کی مسلسل کوشش کی چغلی کھا رہی تھیں۔

بیلا نے لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھا۔

کتنے خوش نصیب تھے یہ آنسو' جن کی حرمت کا احساس دونوں طرف ایک ہی جتنا شدید تھا۔ وہ بھی جوان کو بہانے سے باز رکھنے کے جتن کر رہا تھا۔ وہ بھی جوان کو ٹپکا کر رسوا نہیں کر رہی تھی۔

"یہ لالا کی عادت ہے شیریں۔ اور تمہیں پتا بھی ہے۔" سارہ رب نواز نے یقین دلانے کو شیریں کے کندھے کو چھوا۔ شیریں بہل سی گئی۔ یہ تسلی اس کی عزیز ترین دوست نے دی تھی اور دوستوں کی کہی ہر بات پر آدمی کو یقین آ ہی جاتا ہے۔

کتنی دیر بیلا نے اپنا دھیان سنہری چائے کی بھاپ پر مرکوز کیا۔ وہ اس معاملے میں پڑنا بھی نہیں چاہ رہی تھی۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی بے ساختگی سے اس کے منہ سے پھسل گیا۔

"کیا وہ اب بھی کسی ڈاکٹر کو دکھانے پر آمادہ نہیں؟"

"اونہہ۔ کیسے آمادہ نہیں۔" شیریں نے پہلی دفعہ بیلا کی آنکھوں میں دیکھ کر جواب دیا۔

"خان گل کو بھیجا ہے ہم نے سیدو شریف۔ وہاں سے سرجن نثار کو فون کر کے وہ بلوائیں گے۔"

وہ پہلی دفعہ اس سے یوں براہ راست مخاطب ہوئی تھی حالانکہ وہ اپنے اور اس کے درمیان کے تفاوت کو کبھی نہیں بھولتی تھی۔ لیکن یہ شاید بیلا غم تھا جس نے ان دونوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا تھا۔ حالانکہ اس پلیٹ فارم پر کسی کا بھی اشتراک ناقابلِ برداشت عمل ہے۔

بے بے نے شیریں کو بازو سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔

"حوصلہ جان۔ ہمت۔" انہوں نے سفید اون کے گولوں کو لپیٹتے ہوئے کہا۔

پتا نہیں شیریں کو حوصلہ ہوا یا نہیں لیکن بیلا مطمئن ہو گئی تھی۔ اگر سرجن نثار آ رہے ہیں تو بہت سے

بھٹکے ہوئے کام راہ پر آجائیں گے۔ باوجود سرجن نثار کے مصنوعی رعب کے' اگر دانیال خان کسی کے رعب تلے آجاتے تھے تو وہ سرجن نثار تھے۔

"تم ان کے کمرے میں کیوں نہیں چلی جاتیں شیریں۔" سارہ نے دھیمے لہجے میں نصیحت کی۔ "تم وہاں جا کر کم پریشان ہوگی۔"

"میں نے پوچھا تھا قیمت خان سے۔ وہ سو رہے ہیں ابھی۔"

بیلا چپکی رہ گئی۔ وہ اس گھر کے دستوروں سے پہلے ہی نالاں رہی تھی۔ اس تکلف اور تصنع کی زندگی سے کروڑ درجے بہتر تو ہم درمیانے طبقے کے لوگ ہیں۔ کوئی ہمارے ہاں غلطی سے بیمار پڑ کر تو دکھائے۔ تیمار دار اول تو اس کی چارپائی کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور کہیں چھوڑ بھی دیں تو دروازے سے جھانک جھانک کر باخبر رہنا نہیں بھولتے۔

پتا نہیں۔ لوگوں اور لوگوں کی سوچوں میں اتنا فرق کیوں ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ ایک آسمان کے نیچے رہتے ہیں۔ اور خوش رہتے ہیں۔

اس کے پاس ان لوگوں کو کہنے' ان کو تسلی دینے کے لیے نہ الفاظ تھے اور نہ ہی ان میں کوئی معنی۔

کمرے میں گمبھیر سی چپ تھی۔ اور اپنے اپنے میں الجھے اہل خانہ۔ چائے کے خاتمے پر اس کو ضرور اپنے کام پر نکل لینا چاہیے۔ اس نے خلوصِ نیت سے اپنے آپ کو مشورہ دیا۔ پتا نہیں کیوں وہ خود کو مجرم سمجھ کر آنکھیں چرانا چاہتی تھی۔ کوئی اس کو دیکھ نہ لے۔ کہیں اس سے بازپرس نہ کرلی جائے۔

لیکن اس کے بھاگنے کے ارادے ادھورے رہ گئے۔ پری دروازہ کھول کر قیمت خان کے حوالے سے سردار دانیال خان کا پیغام لائی تھی۔

"بیلا بی بی کو سردار نے کسی کام سے بلوایا ہے۔"

تھوڑی دیر کے لیے جیسے سکتے نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے ٹھٹک کر بے بے کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں اس سلسلے میں ان کا کیا حکم تھا۔ بے بے کے احکامات سے پہلے شیریں کی جھلائی سی آواز اس کے کان میں پڑی۔

"بے بے اس وقت ان کو کرنا چاہیے کام۔"

"جان۔" بے بے نے اپنی مخصوص پرسکون سی آواز نکالی۔

"وہ بہتر سمجھتے ہیں کہ وہ کتنے بیمار ہیں۔ اور بیلا بھی سمجھدار ہے ان کو کسی لمبے چوڑے کام میں نہیں الجھائے گی۔ جاؤ بیلا۔ اور ہاں ان سے یہ بھی پوچھ لینا کہ ہم لوگ ان سے ملنے آسکتے ہیں؟"

"اچھی بات ہے۔" اس نے ٹھنڈے سے لہجے میں کہا۔

پری اس کے ساتھ اخلاقاً چند قدم چل کر اجازت لے کر مڑ گئی۔ لیکن وہ ان کے رہائشی کمروں کے پاس خود سے الجھتی اور سلجھتی یہ مسئلہ حل کرنے سے بالکل عاجز رہی تھی کہ انہوں نے اسے آخر کس کام کے لیے بلایا ہے۔ اب وہ زخم اور خون کا کھیل پھر سے نہیں کھیل سکتی۔ اب ان کو سرجن نثار کو اعتماد میں لینا ہی ہوگا۔ ان دنوں وہ کیش بک کے سلسلے میں بھی مصروف تھے۔ کیش بک کا کام الجھا دینے والا اور تھکا دینے والا تھا۔ وہ رات بھر بے چین رہی تھی۔ اور انہوں نے بھی کچھ کم تکلیف نہیں کاٹی تھی۔ لیکن وہ دیکھ رہی تھی کام کے سلسلے میں یہ شخص ذرا سی رعایت دینے کا قائل نہ تھا۔ کیش بک اور متعلقہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کاغذات ان کی آفس کی الماریوں میں رکھے رہتے تھے۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتی فائلیں اٹھا کر ان کے دروازے کے پاس آکر رک گئی۔

یہ دروازہ جس دن سے اس پر کھلا تھا ایک قیامت ہی بنا رہا۔

وہ مصیبت اور خوف کی ایک طویل رات کاٹ کر پھر سے کام کاج کے لیے تازہ دم ہو گئے تھے لیکن وہ تازہ دم نہیں تھی۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔

کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ لیکن بہر کیف انھوں نے اسے بلایا تو تھا۔

اس نے ناب گھمایا۔ دروازہ لاکڈ نہیں تھا۔ شاید رات کے بعد اس کو کوئی لاک کر بھی نہیں سکتا تھا۔

بے آواز سی چرچراہٹ کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی اور دھک سے رہ گئی۔

چیک کمبل کندھوں تک تانے 'وہ آنکھیں بند کیے برسوں کے بیمار لگ رہے تھے۔ وہ جاندار گھیر لینے والی ذہین آنکھیں پلکوں کے پیچھے ہر جذبے سے خالی اور بند تھیں۔ ہلدی ملا چہرہ برسوں کا بیمار اور تھکا تھکا تھا۔ کوئی بھی شخص لمحے بھر میں فیصلہ کر سکتا تھا کہ یہ شخص غسل خانے میں نہیں پھسلا۔ وہ بے دریغ بہنے والا خون ان کے چہرے سے اس کے اناڑی پن کی ساری کہانیاں سنا رہا تھا۔

وہ دم بخود کھڑی اس گھڑی میں بھی پرسکون انداز میں آنکھیں بند کیے دانیال خان کو دیکھتی رہی۔ وہ کبھی نروس ہوتا یا گھبرانا نہیں جانتے۔ وہ ہر کام کر لیتے ہیں۔

"بیٹھ جاؤ بیلا۔" ان کی آواز میں ہلکی سی نقاہت تھی۔ وہ لمحہ بھر کو چونک سی گئی۔ کیا وہ جناتی خوبیوں کے باعث بند آنکھوں سے بھی دیکھ لیتے ہیں۔

ان کے بستر کے نزدیک ہی آرام دہ سیٹی پڑی تھی۔ جس پر کچھ دیر پہلے ضرور قیمت خان بیٹھا تھا۔ کیونکہ وہی اسے برآمدے میں پیچ و تاب کھاتا 'بڑبڑاتا ملا تھا۔ اس نے سیٹی گھسیٹ لی اور کاغذات اور فائل کا پلندا گود میں رکھ کر وہ ان کے آرام میں مخل ہوئے بغیر بیٹھ گئی۔ ایسے وقت میں ان کی خیریت دریافت کرنا بالکل رسم دنیا تھی۔ حال تو ان کی بند پلکوں سے ظاہر تھا۔ جو انھوں نے بے ساختگی میں کھول دی تھیں۔

وہ ایک ٹک ان کی طرف دیکھتی 'کتنی دیر تک ان کے بارے میں سوچتی کڑیاں سلجھا رہی تھی۔ اچانک جیسے پکڑے جانے کے تصور سے وہ گھبرا گئی۔ اس نے بوکھلا کر کمرے میں چاروں طرف نگاہیں گھمائیں۔ کسی وقت انسان کتنا شرمندہ ہوتا ہے اور اس شرمندگی سے فرار کے لیے کوئی دلیل کوئی بہانہ موجود نہیں تھا وہ کچھ دیر ایک ٹک اس کے چہرے سے کچھ پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ کچھ اخذ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن شاید وہ کسی آخری نتیجے پر پہنچ نہیں سکے۔ وہ پھر سے یقین اور بے یقینی کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی اور شاید اسی لیے پلکیں جھپک جھپک کر۔ ان کی زخمی سی بے تابی کو دور گزر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انھوں نے ایک لمبا اور گہرا سانس لیا۔

"تو میں نے تمھیں تھکا ڈالا۔ ہیں نا؟"

نہیں تو۔"

"جھوٹ نہیں بولو۔" انھوں نے پست سی آواز میں کہا۔

"تم نے ایک عجیب رات گزاری ہے بیلا۔ تمھاری عمر کی لڑکیاں ایسی مصیبتوں سے دو چار نہیں

ہوتیں۔"

"میں نے اس سے بھی زیادہ مصیبت کی راتیں کاٹ لی ہیں سر۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس کی آواز میں اتنی نرمی اور اتنا ٹھہراؤ تھا جیسے اس نے اپنی زندگی کے کسی معمولی پہلو کا معمولی سا ذکر کیا ہو۔ جس کو وہ چنداں اہمیت نہ دیتی ہو۔

"دراصل مصیبت کے بعد ہی راحت کا احساس ہوتا ہے۔ گو پرانی کہاوت ہے۔ اور ہاں لوگ اس سلسلے میں کیا رائے زنی کر رہے ہیں؟" انھوں نے بات کو بدسلیقگی سے پلٹا تھا۔ وہ سمجھ بھی نہیں پا رہے تھے کہ اس سنجیدہ اور دکھی کر دینے والے موضوع سے کیونکر نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

"ناراض ہیں۔ کیونکہ آپ نے کسی کو بلایا نہیں۔"

"میں نے بلایا تو تھا۔" انھوں نے بے ساختگی میں کہا۔ ان کی آنکھیں ننھے بچے کی سی شرارت سے چمکنے لگیں۔

"ایک ایسے شخص کو جس پر میں مکمل بھروسہ کر سکتا تھا۔ جس پر مجھے اعتماد تھا۔ اور جس کی مسیحائی میں مجھے شفا مل سکتی تھی۔ تم نے انھیں بتایا نہیں؟"

"ان کا مطلب تھا کسی ڈاکٹر..." وہ ہچکچا کر چپ رہ گئی۔

"ڈاکٹر کے ہاتھوں میں اتنا آرام کہاں۔ تم نے مجھے کوئی ٹرینکولائزرز (مسکن دوا) دیے تھے؟"

"وہ میں کیسے دے سکتی تھی۔ میرے پاس تو۔" وہ اچانک چپ ہو گئی۔ دانیال خان اس وقت سنجیدہ نہیں تھے، وہ مذاق کر رہے تھے اور خود کلامی۔

"تمھارے ہاتھوں میں مسیحائی ہے بیلا۔ تم لب گور مریضوں کو چھوؤ گی تو وہ اچھے ہو جائیں گے۔"

(یہ آپ کے استحقاقی فقرے ہیں دانیال خان 'جن کی مستحق میں نہیں۔ میں نے کتنے لوگوں کو اپنے سامنے بچھڑتے دیکھا ہے۔)

"یہ تم بھی جانتی ہو بیلا اور میں بھی۔ کہ میں نے ٹھیک آدمی پر اعتبار کیا تھا۔ دیکھو 'کبھی بھولے سے بھی اس واقعے کا ذکر کسی کے سامنے نہ کرنا۔" وہ سامنے خلا میں گھورتے جیسے اس دردناک واقعے سے گزرنے لگے۔

"تمھیں معلوم ہے بیلا 'وہ کون تھا؟"

"معلوم نہیں سر۔ کون تھا وہ؟"

"وہ میرا اپنا ہی تھا کوئی۔ اور یہ بھی اچھا رہا کہ گولی اس کو نہیں لگی۔ اگر میں بچ جاتا اور وہ زخمی ہو جاتا تو قیامت آ جاتی بیلا۔ پتا نہیں کیوں بیلا 'یہ بندوقیں 'یہ ہتھیار ہمارے زیور ہیں۔ جو اسلحہ حکومت نے آنکھوں سے دیکھا نہیں ہوتا 'وہ ہم ہاتھوں سے استعمال کر چکے ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے انھیں چھوتے ہوئے خوف آتا ہے۔ میں پتا نہیں کیوں شرما جاتا ہوں۔ شاید خان گل اور قیمت خان ٹھیک سوچتے ہیں کہ میں بزدل ہی ہوں۔ یا شاید..." انھوں نے بہت دور دیکھا۔ بہت دیر سوچا۔ "میں بزدل ہی ہوں۔" انھوں نے حتمی فیصلہ بڑے فخر سے کیا تھا اور بے جھجک کئی مرتبہ دہرایا۔

"میں بزدل ہوں۔ میں بہت بزدل ہوں۔"

پھر جیسے اچانک ہوش میں آکر انھوں نے آواز نارمل کر لی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"لیکن آپ بہادر ہیں' یہ طے ہے۔"

"ہاں۔ لیکن یہ طے نہیں ہے کہ میں آپ کا بدلہ لینے جاؤں۔"

ایک بے ساختہ سا قہقہہ دانیال خان کے حلق سے پھسلا۔ ان کے چہرے پر چھائی گہری رنجیدگی پر لمحہ بھر کے لیے خوشگواری کی چھاپ لگ گئی۔

"تم میں زندگی ہے۔ تم زندگی سے بھرپور ہو' حالانکہ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تم نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ اور شاید تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں۔ کوئی لمحہ ہوتا ہے۔ جب کسی شخص کے سامنے انسان بے اختیار ہو جاتا ہے۔ شاید وہ شخص میں نہیں۔ یا وہ لمحہ یہ نہیں۔"

آہستگی سے ادا کیے گئے الفاظ کا اثر دانیال خان نے اس کے چہرے پر پرکھنا چاہا۔ لیکن اتفاق سے اسی وقت اس کی گود میں رکھی فائلوں میں سے ایک کاغذ سرک کر نیچے گرا۔ جسے اٹھانے کو وہ بے ساختگی میں جھک گئی۔ کتنی دیر دانیال خان نے اس کو جھکے دیکھا۔ وہ سیدھی ہوئی تو اس کا چہرہ ہلکے سے تمتما رہا تھا۔ لیکن شاید وہ ہر کیفیت گزار آئی تھی۔ زمانہ شناسی کے دعوے عموماً" بودے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ایک لمحے کے لیے یہ کاغذ نہ گرتا تو شاید۔ شاید وہ زمانہ شناسی کی بدولت ہی کسی بات کا کوئی مطلب نکال لیتے۔

"سنو بیلا۔" انہوں نے آنکھیں بند کر لیں جیسے زخم کے کسی حصے میں کوئی ٹیس سی اٹھی تھی۔ "اگر یہ ساری دنیا مل کر ایک طرف ہو جائے۔ وہ مجھ سے نفرت کرے۔ مجھ پر تھو تھو کرے۔ تو تم کیا کرو گی بیلا؟"

وہ خاموشی سے ان کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ یہ سوال ایسی افراتفری میں کرنے والا نہیں تھا۔ نہ اس کا کوئی جواب اس کے پاس تھا۔

"کیا تم بھی ان کے ساتھ مل جاؤگی؟" کسی ایسے شخص کی طرف سے یہ سوال' جس پر جان نچھاور کرنے والوں کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں ہو۔ عجیب سا تھا۔

"خوب سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔"

"میں کسی سے نفرت نہیں کر سکتی۔"

"میں کسی کی نہیں۔ اپنی بات کر رہا ہوں۔"

"آپ سے نفرت کرنے کی تو کوئی وجہ نہیں بنتی۔"

دانیال خان کے چہرے پر ہلکی سی بے بسی کے سائے لرزے تھے۔ پھر وہ بے ساختہ ہنس دیے۔

"یہ بالکل بیلا لائیک جواب ہے۔ اگر آپ سے براہ راست پوچھنے کے بجائے تصور میں پوچھا ہوتا تو بھی شاید مجھے یہی جواب موصول ہوتا۔ کیوں بھئی' مجھ سے نفرت کرنے کی وجہ کیوں نہیں بنتی؟ اس لیے کہ آپ میرے علاقے میں ملازمت کرتی ہیں۔ آپ کے عجیب و غریب نظریات سے' کسی بات سے کوئی بعید نہیں۔"

"شاید اس لیے بھی۔"

"بھئی۔۔؟"

"آپ کو اس وقت زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہیے۔"

"کیا پھر کسی وقت مجھے یہ باتیں کرنی چاہیں؟"

وہ اٹک گئی۔ بعض اوقات انسان یونہی اپنی پھینکی ہوئی چیز پر ہی پھسل جاتا ہے۔

"اچھا وعدہ کرو۔ پھر کسی وقت تم مجھ سے ضرور باتیں کرو گی۔"

"اچھا۔" اس نے دبی دبی سی آواز میں کہا۔

"اتنی بے کسی سے اچھا۔ نہیں وعدہ کرو' کہو میں وعدہ کرتی ہوں۔ کہو نا' میں وعدہ کرتی ہوں۔"

"میں طوطا نہیں ہوں۔ اور ہاں وہ بے بے وغیرہ کا پیغام ہے' وہ آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔" وہ خاموشی سے تکیوں کا سہارا لے کر نیم دراز سے ہو کر بیٹھ گئے۔

"اوکے۔ بلا لیں ان کو۔ میں بھی ان لوگوں سے ملنا چاہتا تھا۔ اور ہاں پلیز' یہ فائلیں وغیرہ آپ واپس رکھ دیں۔ مجھے کچھ دن کام نہیں کرنا۔"

اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ سردار دانیال خان کے اس مزاج کی تو وہ عادی ہو گئی تھی لیکن اس نئے مزاج نے تو اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ وہ بے ساختہ جسی خوشی اٹھ کھڑی ہوئی۔

دانیال خان اچانک بیزار سے ہو گئے تھے جیسے مخاطب کی گفتگو سے اکتا کر وہ اس کو کمرے سے دھکیل دینا چاہتے ہوں۔ یہ بڑے سرداروں والی تلون مزاجی ان کی کلاس کا تقاضا تھی۔ کبھی نرم' کبھی گرم۔

"اور ہاں پلیز۔ آپ کو ایک زحمت اور دینی تھی۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ذرا ان لوگوں کو یہاں بھیج دیں۔"

"اوکے سر۔" (ہاں اب ٹھیک ہے)

اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور روشنیوں کے ایک دوسرے جہاں میں پہنچ گئی۔ سارہ رب نواز وقت گزاری کے لیے ایک بوسیدہ سے ہارمونیم کے سروں سے کھیل رہی تھی۔ ہوا بھرے جانے کی ایک بھیانک سی آواز کے بعد کالے سفید سروں سے آواز بلند ہوتی۔

دیا جلا۔ جگ مگ۔ جاگ اگ۔"

اس کے پاس کہن سالہ پیلے اوراق والی ایک گائیڈ بھی تھی جس میں اپنے وقت کے مشہور گانوں کے سر درج تھے۔ وہ انگلی رکھ کر دیر تک کاغذوں میں سر جھکاتی تو سر لمبا ہو جاتا۔ "جلاع۔ دی ع۔ جلاع۔" اس نے بیلا کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر سہگل کو بخش کر اس کی روح کو کچھ سکون پہنچایا۔

"ہاں سناؤ۔ لالا کی سناؤ۔"

"وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔" وہ ہچکچا سی گئی۔ وہ مالک مختار تو نہیں تھی لیکن پیغام ایسے لائی جیسے وہ اس کی اجازت کے بغیر کمرے میں قدم رکھنے کے مجاز ہی نہ ہوں۔

شیریں سوالات کیے بغیر ایک جست میں باہر تھی۔ بے بے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے اٹھیں تو اس کو شرمندگی سی ہوئی۔ واقعی بعض اوقات بے تابی اچھی نہیں ہوتی۔ خاص طور پر بوڑھوں کے لیے۔ اس نے پیار سے بے بے کا بازو پکڑا اور ان کو سہارا دے کر باہر لے جانے لگی۔

"وہ اچھے ہو گئے ہوں گے۔ ہیں نا بے بے۔ تبھی تو انہوں نے ہمیں بلایا ہے۔"

"ہاں۔" بے بے وقت سے مسکرا دیں۔

وہ خاموشی سے جوانی اور بڑھاپے کو ایک سرحد پر اکٹھے ساتھ روانہ ہوتے دیکھ کر تسلی کا سانس لے رہی تھی کہ سارہ رب نواز نے اس کو بازو سے گھسیٹ لیا۔

"تم یہاں کیا کرو گی اکیلی۔ چلو نا' ہمارے ساتھ چلو۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کبھی کبھی اس لڑکی کی بے تکلفی انسان کو الجھن میں مبتلا کر دیتی۔ بلاشبہ اس لمحے وہ اپنائیت کے اس اظہار پر خوش نہیں ہو سکتی تھی۔

"میرا خیال ہے میں کوئی کام دیکھ لوں۔"

"کام، کام اور بس کام۔ ہاں کر لینا۔ تمہیں پتا ہے لالا نے تمہیں کام میں الجھا رکھا ہے۔ لالا برے نہیں ہیں بیلا، صرف ان کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔"

وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ سارہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

"اب دیکھو، لگتا ہے انہوں نے تمہیں خفا کر ڈالا ہے۔ انہوں نے کچھ تمہیں کہا ضرور ہے۔ اور یقین کرو جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ ان کا مطلب ہی نہیں ہوگا۔"

وہ چپ سی ہو گئی۔ کبھی کبھی انسان مصلحتوں کی دیواروں میں بھی کچھ بے نام سے قلعے تعمیر کرتا ہے۔ وہ سمجھ رہی تھی۔ اسے ان محلوں اور قلعوں سے پناہ مانگنی ہے۔ یہ راستے اس کی منزل کو کھوٹا کرتے ہیں لیکن پھر باہر سے ایک شخص آ کر اس میں دراڑیں ڈال دیتا ہے۔ وہ اس کے بازو کے ساتھ گھسٹتی مشینی انداز میں کھنچتی چلی گئی۔ اور اگر سارہ نے لالا کے اس عجیب و غریب رویے کی اتنی عجیب و غریب توضیح پیش نہ ہی کی ہوتی۔

وہ چونکی تو وہ غیر محسوس انداز میں اس کے ساتھ چلتی چوروں کے اس غار تک آ گئی تھی جس کے دروازے کا اسم اسے بھول گیا تھا۔ بے بے نے دستک دی۔

دانیال خان دو تکیوں کے سہارے آہستگی سے اوپر کو ہوئے جیسے ان ہی کے منتظر تھے۔

اور لمحے سے بھی پہلے بیلا نے اس شخص کا چہرہ دیکھ لیا تھا اور سمجھ لیا تھا۔ یہ کوئی اور ہی شخص تھا۔

شیریں بے ساختگی میں آگے بڑھی۔

ان کی طویل فراخدلانہ مسکراہٹ قطعی نظر انداز کیے وہ جھلملاتی آنکھوں سے ان کے اوپر جھک گئی۔

"آپ ٹھیک ہیں ؟ آپ ٹھیک ہیں؟" "آپ۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" انہوں نے اس کے ہر مرتبہ بے تابی میں کہے فقرے کو دہرا دہرا کر اس کا اطمینان کرنا چاہا لیکن وہ بے چین سی رہی۔

"آپ کیسے سلپ کر گئے تھے؟ آپ کا ٹائیلٹ تو بالکل خشک ہوتا ہے۔"

"اسی کو تو ہم ایکسیڈنٹ کہتے ہیں۔" انہوں نے مسکراتی آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "جو اچانک ہو جاتا ہے۔ بغیر کسی وجہ کے۔"

"اور آپ کو تو بخار بھی ہے۔" اس نے ان کے ماتھے پر بے تکلفی سے اپنے ٹھنڈے یخ ہاتھ جما دیے۔

"آپ بے شک برا مانیں۔ لیکن ہم نے خان گل کو بھیج کر سرجن نثار کو بلا لیا ہے۔ آپ سے پوچھے بغیر۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ "تو آپ نے سرجن نثار کو بلا لیا ہے۔ یہ اچھا کیا۔" وہ ان کی نظروں کی عجیب سی معنی خیزی سمجھتے ہوئے قطعی قاصر کونے میں بچھی میز کے پاس ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ رہی۔

"کیا بات ہے لالا۔ آج کل بہت لڑکھڑا رہے ہو؟" سارہ زندہ دلی سے مسکرائی۔

"ایک تو مجھے تم لوگوں کی باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔" بے بے نے اکتاہٹ سے کہا۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے بے بے۔"

"فی الحال کام کاج کو چھوڑو۔ تھوڑا سا آرام کرو۔" بے بے کی نگاہیں بیلا کی طرف اٹھیں۔ لیکن راستے ہی میں رک کر مڑ گئیں۔

"جیسا حکم بے بے۔ ویسے میں کام کے بغیر خود کو باقاعدہ بیمار محسوس کرنے لگوں گا۔ اور آپ وہاں کیوں بیٹھ گئیں؟ سامنے آئیں۔"

بیلا اپنا تاثر ہوئے معمول کی طرح اس کرسی سے اٹھ کر دوسری کرسی پر جا بیٹھی۔

"میرا خیال ہے اس خوشی میں ایک فنکشن ہو جائے۔ بہت اچھی چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔ ینگ لیڈیز آپ میں سے اچھی چائے کون بنا سکتا ہے ؟"

"سب سے اچھی چائے میں بنا سکتی ہوں۔" سارہ نے خوشدلی سے کہا۔

"لیکن انہوں نے کبھی بنائی نہیں۔" شیریں نے لقمہ دیا۔

"میں مریم کو آواز دیتی ہوں۔ میں بہت کچھ کھاؤں گی بھی۔ صبح سے آپ کے ایکسیڈنٹ کی خبر نے مجھ کو دہلا دیا تھا۔"

"دیکھا بے بے۔ یہ کتنی نالائق لڑکیاں ہیں۔" ان کی آواز میں گہری سنجیدگی تھی۔

"بے بے کی بات نہ کرو لالا۔" سارہ ہنستی چلی گئی۔

"بے بے کو سوائے بیلا کے کسی کے ہاتھ کا کچھ پسند نہیں۔"

"تو کیوں نہ ہم بھی آنسہ بیلا سے درخواست کریں۔"

بیلا نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ شدید سنجیدگی نے ان کی آنکھوں کی شوخی کو ہلکا سا ماند کرنے کی کوشش ضرور کی تھی۔ لیکن بالکل بجھایا نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے اتنے جتن کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف پری کو اطلاع دے دینا۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" سارہ نے جلد بازی میں اٹھنے کی کوشش کی۔

بیلا کا منصوبہ ادھورا سارہ گیا۔

"آپ بیٹھیں سارہ۔ گپ لگائیں۔ یہ ایسا مشکل کام نہیں ہے کہ اس میں کسی کمپنی کی ضرورت پڑے۔"

اور جب پری لوازمات کے ساتھ ٹرے لگا کر پہنچی تو سارہ کی توقعات کے عین مطابق بیلا اس کے ساتھ نہیں تھی۔ البتہ معذرت کے دو تین فقرے تھے جو پری کی زبان سے اس نے کہلوا کر اپنے کاندھوں سے سارا بوجھ اتار دیا تھا۔ اس کو ڈیکوریشن کے سلسلے میں کچھ کام تھا۔ الیکٹریشن آ گیا تھا۔ اور اسپاٹ لائٹس لگوانے کا مشکل کام ہنوز باقی تھا ورنہ معمولی سی غفلت سے مجسموں کی ساری خوبصورتی تباہ ہو جائے گی۔

غالباً وہاں موجود کسی شخص سے چھپا نہیں رہا کہ بیلا کس خوب صورتی سے بہانہ بنا کر محفل سے فرار ہو چکی تھی اور اس کے فرار کی وجہ بھی کسی سے چھپی نہیں تھی۔ دانیال خان کلی تند طبیعت کے آدمی ہیں۔ اور کبھی کبھی تو وہ بد لحاظی کی حد گزار دیتے ہیں۔ بے بے نے کروشیا کی بنائی پر ہاتھ پھیر کر اپنی تسلی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی۔ میں ضرور دانیال کی کسی ممکنہ بدتہذیبی کے خلاف اس کو تشفی دوں گی۔ انہوں نے اپنا اطمینان کرلیا۔

لیکن جب بے بے نے دیکھا واقعی الیکٹریشن آیا ہوا تھا۔ اور وہ اس کے ساتھ کونوں کونوں میں مغز پچی کرتی پھر رہی تھی تو انہوں نے معذرت کا پروگرام کینسل کردیا۔ اسپاٹ لائیٹ اس محنت کش کے مجسمے کو چمکا رہی تھی جو سر سے بلند ہاتھ میں کلہاڑا اٹھائے غالباً" کسی لکڑی کو کاٹنے ہی والا تھا۔

اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ کوئی اس سے خفا تو نہیں تھا۔ غنیمت ہوا کہ کوئی نہیں۔ سارا اس کو دیکھ کر حسب عادت خوشدلی سے ہنس دی۔ وہ اس کے ساتھ اس کی شرارت بھری چوری میں شیئر کرتے ذرا نہیں ہچکچا رہی تھی۔

لیکن دوپہر کا کھانا تھوڑا سا لیٹ ہوگیا۔

اول تو اس لیے کہ سرجن نثار پہنچ گئے تھے۔ اور وہ کب سے دانیال خان کا کمرہ بند کرکے مرہم پٹی کے انتظامات میں مشغول تھے۔ قیمت خان باہر برآمدے میں پاؤں پٹختا پھر رہا تھا۔ غصے میں بھرا پشتو میں کچھ کچھ بڑبڑا تا۔ اس کو قیمت خان سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ بلکہ وہ اس کو تھوڑا بہت برا ہی لگتا تھا۔ لیکن مالک سے اس کی وفاداری پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ سرجن نثار نے اس چابکدستی سے کمرے کا چارج سنبھالا کہ وہ زخم کی نوعیت کے بارے میں اندازے ہی لگاتا رہ گیا۔

خدا خدا کرکے کمرہ کھلا تو سارہ رب نواز دیا ع۔ جلا ع۔ جگ مگ جگ مگ کے انہی سروں میں ابھی تک غلطاں تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ہارمونیم نے بھولے سے ایک مرتبہ بھی ٹھیک سر نہیں پکڑا۔

لالا نثار اور لالا دانیال خان کا بیک وقت حکم تھا کہ وہ کھانا ایک ساتھ کھائیں گے لیکن دانیال خان فی الحال چلنے پھرنے سے معذور ہیں لہٰذا ٹرالی ان کے کمرے میں کھنچوالی جائے۔

ٹرالی کے ساتھ ہی آنسہ بیلا کی روح کھنچوالی گئی۔

وہ دانیال خان کی موجودگی میں سرجن نثار کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگی۔

لیکن اس کے پاس نہ بہانے بچے تھے' نہ لیت و لعل۔ اور وقت کی تنگی کا رونا رو کر بے بے نے بیلا کی جان خشک کردی تھی۔

"ٹرالی۔ کمرے میں چلی گئی اور تم لوگ یہیں دندناتے پھر رہے ہو۔ میں ذرا چار رکعت پڑھ لوں۔ تم چل کر بیٹھو۔ یہ مہمان سے اتنی بے پروائی ؟"

ری۔ ری۔ ری دیا جلاؤ۔ جگمگ جگمگ۔

"اٹھ جا شیریں۔"

"چلی جا سارہ۔"

"ذرا ایک نظر دیکھ لے بیلا۔"

وہ خود بھی جانتی تھیں۔ ان سارے احکامات میں سے صرف ایک ہی حکم مانا جا سکتا تھا۔ شیریں شرارت میں سارہ کے سرگرم بڑ کر کے خوش ہو رہی تھی اور سارہ نے قسم کھالی تھی جب تک سنگل خود آکر توبہ نہ کرلے' وہ معاف نہیں کرے گی۔

"آخاہ۔ آنسہ بیلا۔ ابھی آپ ہی کا ذکر خیر تھا۔ تشریف لایئے۔"

آرام کرسی میں دھنسے سرجن نثار احتراماً" کھڑے بھی ہوئے اور بیٹھ بھی گئے۔

اس کا رنگ ہلکا سا سرخ ہوگیا۔ یہ بے بے بھی عجیب بدحواس ہیں۔ نہ ابھی ٹرالی پہنچی تھی' نہ لوگ اور اس کو دھکیل دھکیل کر خوامخواہ۔ وہ سرجن نثار کی پیش کی ہوئی کرسی کے ایک کونے میں دھنس گئی۔ اپنے جلد آنے کی کوئی معقول یا نامعقول وجہ گھڑنے کی بابت سوچتی وہ کبھی سرجن نثار کو ہمہ تن متوجہ دیکھ رہی تھی۔ اور کبھی دانیال خان کو۔ جو سرجن نثار کے ساتھ آیا اخبار اپنے سامنے پھیلا کر لیٹے تھے۔

"آپ کی کتابیں مجھے مل گئی تھیں۔ آپ کا بہت شکریہ۔"

اس ذکر سے غالباً" وہ انجان تھے۔ دفعتاً" اخبار پلٹ کر انہوں نے گفتگو سننے کی کوشش کی۔

"آپ نے پڑھ لیں۔ واقعی؟ ایسی کتابیں میں اسے بھی دیتا ہوں۔ اس کی لائبریری میں آدھی کتابیں میری ہی تو ہیں۔"

چند لمحے دانیال خان کی آنکھوں نے سرجن نثار کے اس کھلے جھوٹ کے خلاف احتجاج کیا۔ پھر گفتگو کو غالباً" اپنے معیار سے گرا ہوا سمجھ کر دوبارہ اخبار کھول لیا۔

"کیوں' کیا تکلیف ہے؟" انہوں نے اخبار والے کو گھر کا۔ "اچھا چلو میں اعلان کرتا ہوں۔ اس کی لائبریری کی آدھی کتابیں میری نہیں ہیں۔ آپ پنجابی پڑھ لیتی ہیں۔"

"مشکل سے۔ لیکن پشتو والی کتابیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔ اصل میں مجھے پشتو نہیں آتی۔"

"اور یہاں ابھی تک کسی نے آپ کو سکھائی ہی نہیں۔" انہوں نے ایک نظر ہلکے ہلکے ہلتے اخبار کے پیچھے کچھ دیکھا۔

"چلیے میں سکھادوں گا۔ لیکن میری ایک شرط ہوگی۔"

"کیا؟"

"کہ پہلے آپ مجھے سرجری سکھائیں گی۔"

سارے جسم سے خون اکٹھا ہو کر بیلا کے چہرے پر جمع ہوگیا۔ اخبار میں ہلکی سی کپکپاہٹ ہوئی جسے دانیال خان نے سمیٹ کر ایک طرف ڈال دیا۔

"بہتر ہوگا اگر تم پہلے یہ پتا کرلو کہ اب تک کھانا اور کھانے والے کیوں نہیں آئے۔"

"جب دو بھلے آدمی حصول علم میں مصروف ہوں تو رخنہ ڈالنے والے جاہل گردانے جاتے ہیں۔"

"اتنی سخت اردو بول کر تم کیا سمجھا سکو گے؟"

"اچھا جاہل سمجھے جاتے ہیں۔ ہاں تو بی بی بیلا میں حیران ہوں آج کی دنیا میں کوئی اتنی قربانی کرنے والا اتنا ایثار پسند۔ اتنا Loving کیا کوئی ہو سکتا ہوگا۔"

وہ اپنی کرسی پر اسی جگہ جمی پہلو بدلتی رہی۔

"کاش آپ اپنی تھوڑی صفات اس گھر کے لوگوں میں تقسیم کردیں۔ یہ بہت دولت مند ہیں لیکن اندر سے تہی دست ہیں۔ بے چارے غریب' مفلس۔ میں سوچتا ہوں اگر ہم دونوں کا محبت بھرا ہاتھ ان لوگوں کے سر پر نہ ہوتا تو یہ کیسے جی سکتے تھے۔"

دانیال خان نے ایک نظر بڑی محبت سے اپنے دوست پر ڈالی۔

"آپ تو پشتو سکھانے جارہے تھے جناب۔"

"ہاں سکھاتا ہوں۔ تاسو توم ہوئے۔ یہ لو اور آگئیں حصول علم کی راہ میں رکاوٹیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہم بھی ہم پہلا سبق ہی پڑھ رہے تھے۔" وہ احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔

سارہ رب نواز کے ہنستے مسکراتے چہرے کے پیچھے شیریں خان کا اداس سا مرجھایا چہرہ تھا۔

"خیال رہے لالا نثار۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "ان کو چھٹی نہ ملی۔ پہلا سبق ہی دراصل آخری ہوتا ہے۔" شیریں اس کو کج بحثی میں الجھا چھوڑ کر دانیال خان کے پاس جا بیٹھی۔ وہ دونوں آہستگی سے کسی سنجیدہ موضوع کو زیر بحث لا کر ان سے دور ہو گئے تھے۔

"ایکو الف تینوں درکار۔" لالا نثار نے مزید ارشاد کیا۔

"صرف کھانا درکار ہے۔" دانیال خان نے ٹوکا۔ معلوم نہیں جب دانیال خان اتنی توجہ سے کسی کی بات سن رہے ہوتے ہیں تو کیسے ادھر ادھر کے فقروں کی بھنک ان کے کان میں پڑتی رہتی۔

"بے بے پچھلے آدھ گھنٹے سے چار رکعت پڑھ رہی ہیں۔"

یہ کھانا اس چھت کے نیچے پہلا کھانا تھا جو بے حد دوستانہ ماحول میں قہقہوں کے درمیان کھایا گیا۔ شاید اس لیے کہ بے بے نے اس میں شرکت نہیں کی تھی لہٰذا وہ حد ادب جو بے بے کے سامنے ملحوظ رکھنی پڑتی تھی اب ختم کر دی گئی تھی۔

سرجن نثار اور خان گل کی نوک جھونک نے لیے دیئے رہنے والوں کو بھی ہنسنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ لیکن معلوم نہیں بے بے کی نماز اتنی لمبی کیوں ہو گئی کہ ان کو کھانے کی طرف سے معذرت کہلوانی پڑی۔ پھر ان کو جو بھی بلانے گیا۔ ان کی نمازیں اتنی طویل لگیں کہ وہ سر بھی نہ اٹھا سکیں۔

☼ ☼ ☼

بیلا نے خاموشی سے کچن میں ٹرالی جمائی۔ بہت شام ہو گئی تھی بے بے اس طرح تو کبھی نہیں کرتی تھیں۔ وہ ٹرالی لے کر گئی تو حیران رہ گئی۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی ضرور تھیں لیکن نماز نہیں پڑھ رہی تھیں۔ روتے روتے ان کی ہچکی بندھی تھی اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے شدت سے رو رہی تھیں۔

اس نے بوکھلا کر ٹرالی دروازے کے پاس روکی اور بے بے کے عین سامنے شنیل کی گدے دار جائے نماز پر ہی بیٹھ رہی۔

بعض اوقات اپنی حیثیت کتنی احمقانہ کتنی بیکار سی لگتی ہے جب سامنے رونے والا کوئی بچہ بھی نہ ہو کہ اسے گلے لگا کر چوٹ دینے والے کو زوردار جھاڑ ہی پلا دی جائے۔ سفید بالوں والے اس پیارے سر کو جو ململ کی نیلی کنی والے دوپٹے سے ڈھکا۔ ہچکیاں کھا رہا تھا۔ وہ بھلا کیا کہہ سکتی تھی۔ انہیں چپ بھی کراتی تو کیسے؟

لیکن بے ساختہ ہی اس نے روتی ہوئی بے بے کو گلے لگا لیا۔

"کیا ہوا بے بے؟"

ہر روتا ہوا شخص اس لمحے تو بچہ ہی ہوتا ہے۔ ننھے سے معصوم بچے کی طرح ہی کسی کو خیر خواہ پا کر بلک سی اٹھیں۔ اس کے کندھے سے اتھاہ لگائے جیسے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہیں۔

"کسی نے کچھ کہا ہے بے بے؟"

"خان گل نے بدتمیزی کی ہے؟"

"کوئی بات ہو گئی ہے۔ ؟"

اپنی دانست میں تو اس نے بڑے تیر مارے تھے لیکن بے بے ایک نفی میں سر ہلا کر اس کی ساری تحقیقات پر پانی پھیرتی رہیں۔ کتنی دیر ململ کے دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتیں اور ہچکیاں ضبط کرتی رہیں۔

"وہ ظالم دانیال کو مار ڈالیں گے۔"

یاسیت کی شدید لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی سے گزری اور اسے جھرجھری آ گئی۔

"کون بے بے؟" اس نے آہستگی سے پوچھا جیسے خود بھی اسے یہی سوال کرنا تھا۔

بے بے نے خاموشی سے سر اس کے کندھے سے ہٹا لیا۔ شاید انہوں نے اپنے بے ساختہ پن کو محسوس کر لیا تھا۔

کتنی دیر وہ اسی طرح قبلہ رو سر جھکائے اپنے آپ پر قابو پاتی رہیں۔

"تمہیں معلوم ہے دانیال خان غسل خانے میں یونہی نہیں پھسلے۔ کسی نے ان پر گولی چلائی ہے۔"

بہت دیر بعد وہ بولیں تو ان کی آواز بھاری بھاری تھی۔ شدت گریہ سے لڑکھڑائی ہوئی۔

بیلا شرمسار ہو گئی کسی معصوم اور کھرے آدمی کے ساتھ جھوٹ نبھانا کتنا مشکل کام ہے۔ اس سے کوئی راز رکھنا کوئی بات چھپانا۔ کتنی بڑی دھوکے کی بات ہے۔ جبکہ وہ شخص خود آسمان کی طرح شفاف اور روشن ہو۔

"کون بے بے۔ کس نے۔ کون ان پر گولی چلا سکتا ہے۔"

"یہی تو پتا نہیں چلا قیمت خان کو خود بھی نہیں معلوم۔ ورنہ وہ ان کی پشتوں کو بھون کر رکھ دیتا۔ لیکن دانیال خان جانتے ہیں۔ پر وہ زبان نہیں کھولتے۔"

کتنی دیر وہ سامنے سجدے کے رخ کے نشان دیکھتی رہیں۔

"پر میں چپ نہیں رہوں گی۔ میں جانتی ہوں یہ گولی کس نے چلائی ہو گی۔ وہ جب تک اس معصوم کی جان نہ لے لیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ سوچو اگر گولی۔ اگر۔۔۔"

کسی ممکنہ بدشگونی سے پھر ان کی آواز رندھ گئی۔

بیلا الجھن میں مبتلا بے بے کی آنکھیں پھر برستی دیکھتی رہی۔

"اگر آپ کو معلوم ہے تو آپ ضرور قیمت خان کو بتا دیں بے بے۔ اس طرح تو دانیال خان کی جان کو ہمیشہ خطرہ لگا رہے گا۔"

بے بے نے اک نظر غور سے بیلا کی آنکھوں میں دیکھا جیسے وہ اعتبار کیے جانے یا نہ کیے جانے پر کشمکش کا شکار ہوں۔

"یہ بہت پرانی کہانی ہے۔" انہوں نے کسی حتمی فیصلے پر پہنچ کر آنکھیں بالکل رگڑ ڈالیں۔

"حالانکہ یہ بے چارہ معصوم ہے۔ اس کا تو کوئی قصور بھی نہیں۔" وہ الزام لگانے سے پہلے بری کرنے کی فکر میں مصروف تھیں۔

"بہت پہلے دانیال خان کے والد بھی زندہ تھے۔ اور ان کے بڑے بھائی بھی۔ وہ دانیال سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دونوں میں ڈھائی سال کا فرق تھا اور ان میں بہت پیار تھا بہت دوستی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تم نے دانیال خان کو دیکھا ہے۔ لیکن اس کا باپ۔ اف خدایا۔ جب وہ غصے سے بلبلاتا تو ساری گڑھی گونج جاتی۔ وہ ہاتھی کی طرح مست ہوتا اور شیر کی طرح پچھاڑ دیتا تھا۔ اس میں اتنا غصہ تھا، اتنا غصہ تھا کہ کیا بتاؤں۔ دانیال کو دیکھ کر کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اس شخص کا بچہ ہوگا۔ یہ اس کی ضد ہے۔ اس سے الٹ۔ نرم خو مہربان۔"

"ٹھیک ہے بے بے۔ محبت میں ہر طرح کے مبالغہ کی گنجائش رہتی ہے۔"

"وہ پٹھان بچہ تھا۔ وہ گولی چلانے پر آتا تو کوئی اس کا ہاتھ نہ روک سکتا۔ وہ ہنر برساتا تو دنیا پناہ مانگتی۔ خدایا! اس کا ایک رعب تھا۔ دبدبہ تھا، جلال تھا۔

اور پھر ان دنوں اس کے بھائی نے بڑی عجیب ضد چھیڑ دی۔ وہ بھی اپنے باپ کا تھا۔ وہی طنطنہ، وہی دبدبہ، وہی ضد۔ وہ اس کے دشمن کی بیٹی تھی۔ ان لوگوں نے ہمارے گاؤں کی بہت سی لڑکیاں اٹھائی تھیں۔ یہ بھی ان کی لڑکی اٹھا لایا۔ اصل میں لڑکی اٹھانے میں تو کوئی برائی نہیں۔"

جیسے چپ ہو کر حالات کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

"برائی تو یہ نکلی کہ ضد کرنے لگا اس کو عزت سے بیاہے گا۔ اور جانتی ہو بیلا اس کے باپ نے کیا فیصلہ کیا؟" انہوں نے لہجے میں فخر سمو کر بڑی شان سے بیلا کی طرف دیکھا۔

"ہماری آن اور عزت کے لیے بالکل درست فیصلہ۔ حالانکہ ایسے فیصلے ہمیں سینے پر پتھر رکھ کر قبول کرنے پڑتے ہیں، جس دن اسے بیاہ کر گڑھی لایا۔ اس کے باپ نے اس کو گڑھی کے محافظ چیتوں کے آگے ڈال دیا۔ اور تم سوچ سکو گی۔ اس سزا پر عمل درآمد کس نے کیا۔ یہ اپنے دانیال خان نے۔

آفرین ہے اس پر۔ تابعداری اور فرض شناسی کی اس نے ایک مثال قائم کر دی۔ اس نے منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر بھائی اور اس کی محبوبہ کو بھوکے چیتوں کے حوالے کر دیا۔ اسی لیے تو بستی کے لوگ دانیال خان کو پوجتے ہیں سوچو بیلا اس نے اپنی روایتوں کے آگے بھائی کی محبت کو آڑے نہیں آنے دیا۔ وہ روایتوں کا پاسبان اور وضعداری کا نگہبان ہے۔"

اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ بھیانک گونجتے سناٹوں کی سیٹیاں اس کے کان کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔

بے بے کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ کیا سن رہی تھی ایک سکتے نے جیسے اس کے سوچنے سمجھنے کے سارے نظام کو ماؤف کر دیا تھا۔

وہ گم صم ساکت جامد جہاں کی تہاں بیٹھی خالی خالی نظروں سے بے بے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

یا خدا یہ کون سی زمین ہے؟ اور اس پر کون سا آسمان ہے؟

جو اتنی قیامتیں دیکھ کر ٹوٹ نہیں پڑتا۔

"لیکن اس غریب کو کیا ملا؟ بدلے میں دشمنی، رسوائی۔ بھائی کی سسرال اس کی جانی دشمن ہو گئی۔ وہ کوئی موقع اب بدلے کا ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ سارے جنگلوں میں آگ لگا دیتے ہیں۔ ہمارے علاقے کی لڑکیاں اٹھا لیتے ہیں اور ہمارے گاؤں اجاڑ دیتے ہیں اور..."

"یا اللہ۔ یا اللہ۔"

یہ بے بے اتنی دیر سے کیا۔ بول رہی ہیں اتنی دیر تک اس کے دماغ نے کچھ سمجھنے سے انکار ہی کر دیا تھا۔ درمیان، درمیان سے اس کو بے بے کے بے ربط سے فقرے ٹوٹ ٹوٹ کر سنائی دیتے جیسے ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کہیں، کہیں کوئی کوئی مانوس آواز کانوں سے ٹکراتی ہے پھر ایک طویل وقفے کے لیے خاموشی سب کچھ نگل لیتی۔ اس کے اوپر جیسے ایک وزنی بوجھ آپڑا تھا۔ جس کی طاقت سے اس کے کندھے آہستہ آہستہ جھکتے چلے گئے۔

"اف۔"

اذیت کی ایک بھنچی بھنچی سی آواز جیسے ایک گہری سانس کی شکل آہستہ سے نکلی۔

"مالک"

"پتا نہیں اس نے کس کو پکارا تھا۔ گڑھی کے مالک کو۔ یا اس مالک کو جو ایسے سارے مالکوں کا مالک ہے۔

بے بے کو سراغ لگانے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ وہ تو شدت سے گریہ میں مشغول تھیں۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

یہ زمین پھٹی نہیں اور آسمان حیرت سے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ سب کچھ ہوا نہیں کرتا۔ ظالم ظلم کر کے سکون سے اپنی تعیش گاہوں کی طرف پلٹ جاتا ہے اور بے نام مظلوم کی ذات سے کبھی کسی کو آگاہی نہیں ہو سکتی۔

"وہ بے چارہ تو معصوم ہے، مظلوم ہے، شاباش ہے اس کو کہ اس نے اپنی روایات کی پاسداری کی۔" بے بے کے جائے نماز پر قبلہ رو بیٹھے فیصلے اس کے وجود پر کوڑے برسانے لگے۔

"لیکن شاید میں بزدل ہوں، ہاں میں بزدل ہوں، میں بہت بزدل ہوں۔"

اس کے کان سے بالکل نزدیک ایک بھاری سی آواز کی سرگوشی بہت سے طلسم توڑ رہی تھی۔ وہ ایک کمزور سا لمحہ تھا جس کی گرفت میں آنے سے پہلے اس نے خود کو بچا لیا تھا۔ وہ آواز کے سحر کا شکار ہوئی تھی، نہ ان بولتی آنکھوں کے جادو کی اسیر، لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں ایک روانی سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

معلوم نہیں وہ کس پر روئی تھی۔

مرنے والے پر یا مارنے والے پر۔

بعض اوقات انسان زمین پر چلتا پھرتا ہنستا کھیلتا۔ اچانک کسی کے دل میں مر جاتا ہے۔

وہ اپنے دل میں پڑی اس میت پر آج اتنے آنسو بہانا چاہتی تھی ساری کدورتیں، ساری گندگیاں اپنے ذہن سے دھو ڈالے۔

اس کا خیال تھا کہ باپ کی موت کے بعد کوئی غم اس کو اس شدت سے کبھی رلا نہیں سکے گا۔

لیکن دنیا بڑی عجیب چیز تھی۔ (گوتم بدھ ٹھیک کہتا تھا)

رحیم چاچا کی کوٹھری سے گڑھی عیسٰی خان کے اس محل تک۔ اس نے قدم قدم پر لوگوں کو ایسے دکھوں میں گرفتار دیکھا تھا کہ اس کے اپنے پاپا کی موت ایک گزرا ہوا معمولی سا واقعہ بن کر رہ گئی تھی۔

روتے روتے لمحہ بھر اس کا جی چاہا وہ بھی گوتم بدھ کی طرح فیصلہ کر دے کہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ اور دنیا سے بھاگ جائے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن اس کے اندر وہ بھاگ کر کہاں جائے گی۔ سو وہ پہلے ہی یہاں سے بھاگ کر تھک گئی تھی۔
ایک طرف ماتھا پر بہت سے۔ دوسری طرف بڑا کٹا مرا۔
یہ وہ سرا گھر تھا۔ جو اس نے ریت پر پاؤں ڈال کر تعمیر کیا تھا اور ایسے گھر پاؤں نکالتے ہی مسمار ہو جاتے ہیں، ڈھتے جاتے ہیں۔

وہ پہلا گھر اس کے باپ کا گھر تھا۔ تاش کے پتوں کا گھر جو ہوا کے معمولی جھونکے نے تہس نہس کر دیا۔

کتنی شام بھیگ رہی تھی۔ سورج نارنجی رنگ کی شعاعیں بکھیر کر جا چکا تھا۔

وہ اس حالت اور اس شکل سے لوگوں کے سامنے جا کر چیخنے چلانے سے باز نہیں آ سکے گی۔ وہ بستر میں منہ اوندھائے کتنی دیر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ کتنی ہی مرتبہ اس نے پری اور مریم کو اونچی آواز میں واپس چلے جانے کی ہدایت دی۔

رات گئے چوب دار نے بلند آواز میں پکارا تھا۔

چھتے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ کوئی شخص رات کے اس پہر میں باہر نہ نکلے۔

یہ ترجمہ ایک مرتبہ اسے پری نے سنایا تھا۔ وہ جب بھی چوب دار کی آواز اپنی کھڑکی کے نیچے سنتی دہل جاتی تھی۔ یہ چوب دار اور پہرے دار آہنی سلاخوں کے سائے میں رات بھر ہتھیار بلند کیے گڑھی کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

یہ گڑھی جو محبت جیسی معصوم چیز کو چیتے جیسے بھیانک درندے کے آگے پھینک کر روایات کی پاسداری کرتی ہے۔ لیکن وہ ان روایات میں حصہ دار نہیں بنے گی۔

وہ یہ زمین چھوڑ کر فرار بھی حاصل نہیں کرے گی کہ بھاگنا بزدلی ہے اور اس میں کوئی نروان نہیں۔

اس نے صبح سے پہلے پہلے ایک حتمی فیصلہ کر ڈالا۔

یہاں ان لوگوں میں رہ کر وہ ان سوئے ہوئے مُردوں کو برسوں کی نیند سے بیدار کرے گی۔

یہاں وہ ضرور ٹھہرے گی۔ اپنی مرضی کرے گی۔ اپنی من مانی کرے گی۔

تاوقتیکہ وہ لوگ اس کو بھوکے چیتوں کے آگے ان کے خونخوار پنجوں سے بھنبھوڑے جانے کے لیے پھینک ڈالیں لیکن وہ یہاں بیداری کا انقلاب لانے کی ایک بھرپور اور آخری کوشش ضرور کرے گی۔

وہ ایک مرتبہ یہاں کے لوگوں کو یہ احساس دلا کر ہی جائے گی کہ یہ روایات اور ان کی جھوٹی پاسداری ان کو ذلت کے کس گڑھے میں ڈال سکتی ہے۔

حتیٰ کہ ایک آخری گولی اور اس وادی میں برسے۔

ابھی صبح شروع ہونے ہی کو تھی۔

رات کی تاریک کشمکش کے بعد ایک چھپا چھپا سا سورج بادلوں کے پیچھے آسمان سے نکل رہا تھا۔ سورج بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن اس کی کمزور لیکن طاقت ور کرنوں کی روشنی کو زمین پر پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ تازہ ہوا اور خوشگوار روشنی نے کمرے کو جگمگا دیا۔

اس نے الماری میں نصب قد سے طویل آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ وہ سیدھے سادے عام

سے کپڑوں میں تھی۔ بالوں کو برش سے ہموار کر کے اس نے جوتے کسے۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔
ہاں اب وہ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ باہر برآمدے میں آئی تو معمول کے مطابق طویل سناٹوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ صبح کا وہ خوشگوار سا شور جو ہر گھر کا خاصہ ہے یہاں نہیں ہوتا تھا۔ ناشتے کی تیاری میں جو افراتفری اور ہنگامہ شہروں کے درمیانے طبقے کے گھروں میں نظر آتا ہے وہ بھی یہاں عنقا۔ میز یہاں سے وہاں تک ناشتے سے بھری ہو بھی تو پتا ہی نہیں چلتا۔ یہ کون جن بنا تا رہا ہے اور کب یہاں رکھ گیا ہے۔ ملازم یہاں سے وہاں گھومتے پھرتے بھی نظر آتے لیکن بغیر چاپ کے قدم اور بغیر الفاظ کے زبان۔

وہ سیدھی کچن میں گئی۔

خستہ خان اپنی مخصوص مہارت سے پراٹھوں کی شکل موڑنے کی کوشش کر رہے تھے اس کو ایک دفعہ پھر باورچی خانے میں دیکھ کر بوکھلا گئے۔ وہ ہمیشہ ان کے لیے مصیبت اٹھالاتی تھی اور خاتون خانہ کی اتنی سر چڑھی کہ وہ اپنی بد مزاجی کے مظاہرے اس کے سامنے کر بھی نہیں سکتے تھے۔

وہ بوکھلاہٹ میں کیا کیا بول رہے تھے وہ سمجھ نہیں سکی۔

وہ سنجیدگی سے کاؤنٹر کے دوسری طرف کھڑی ہو گئی۔ ”ایک کپ چائے۔“

خستہ خان اس کی جلد بازی کی وجہ سمجھنے سے قاصر الیکٹرک کیٹل کا پلگ لگا کر اس کے لیے اسٹول گھسیٹنے لگے۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے چائے کی پیالی ختم کی۔

”اور ہاں“ اس نے دروازے پر واپس جاتے پھر نصیحت کی ”اگر کوئی میرے بارے میں پوچھے تو بتا دینا۔ میں نے ناشتا کر لیا ہے۔ یہاں اس باورچی خانے میں۔“

اس نے نہایت سرد مہری سے قدم باہر نکالتے ہوئے کہا ”سن لیا خان! یہاں اس باورچی خانے میں۔“

وہ باہر نکلی اور سینکڑوں نگاہوں کی پروا کیے بغیر پہاڑی کے اس موڑ سے وادی کے نچلے حصے میں اتر گئی۔

”ہاں۔ آج روایات سے بغاوت کا دن ہے۔“

اسی لیے اس نے خان گل کی ملاقاتی لباس والی نصیحت کو قطعی غیر ضروری سمجھ کر رد کر دیا تھا۔

وہ دن اور وہ لوگ اب گزر گئے جو روایات سے پاسداری کا بھرم رکھ کر زندگی سے جوا کھیلتے تھے۔

پہاڑی کی قدرتی سیڑھیاں وادی کے مختلف حصوں میں جا کر اترتی تھیں۔

پہاڑوں پر کدال سے کھدائی کرنے والے مزدوروں نے کام روک کر اسے دیکھا۔

چشمے پر پانی بھرتی کپڑے دھوتی عورتیں رک گئیں۔

بچے تاش کے سوراخ دار پردوں سے سر نکال کر جھانکنے لگے۔

یہ سب کچھ فضول، بے معنی سا تھا۔ جیسے گلے کے بیل اسے دیکھ کر رسے تڑانے کی کوشش میں بلبلا رہے تھے۔ یہ جانور بھی عجیب شے ہے۔ انسان کی طرح وہ بھی غیر کو برداشت نہیں کرتے۔

بستی کے دوسری طرف گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ کسی خوش وقتی میں خان گل نے اس کو گھوڑوں کی سیر کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اب وہ باتیں اس کو برسوں پرانی لگ رہی تھیں جیسے وہ اسی پہاڑی کے اوپر اونچے گھر کا حصہ کبھی رہی ہی نہ ہو طویل اور پیچ دار پگڈنڈیوں پر جس جگہ کی اسے تلاش تھی۔ اس کے لیے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے کچھ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔

ٹین کی ترچھی چھتوں کے نیچے گورنمنٹ پرائمری اسکول گڑھی عیسیٰ خان کا محرابی گیٹ جا بجا چیدار ہوگیا تھا۔ بچوں کے پھینکے پتھروں نے اس پر جی بھر کر چاند ماری کی تھی۔

وہ عمارت کے اندر داخل ہوئی تو بہت سی عورتیں پاؤں پسارے دھوپ تاپ رہی تھیں۔ ان کے سامنے کسی ساگ کا ڈھیر تھا جس کو چابکدستی سے درانتی سے کاٹتے ہوئے وہ ہاتھ اور زبان افراط سے چلا رہی تھیں۔ ذرا فاصلے پر ان کی لڑکیاں اخروٹوں سے بیٹھے کھیل رہی تھیں۔

وہ خاموشی سے تختہ سیاہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ جس کی سیاہی پر وقت نے پوچا پھیر دیا تھا۔ بھاگتے اور شرماتے بچے آئے اور ایک دوسرے میں گھس گھس کر ٹاٹ پر بیٹھنے لگے۔ اس نے ان سے اردو اور پشتو میں سلام علیک کی۔ ان میں سے کچھ اس کو پہچاننے کا شرف رکھتے تھے۔ اس نے ان کو بیڈمنٹن کورٹ کے پاس کچھ سبق پڑھائے۔ پھر وہ گم ہوگئے۔

غالباً ان کے گھر والوں نے بے راہ روی سے محفوظ رہنے کے لیے مزید تعلیم سے روک دیا تھا۔

لیکن اب وہ تختہ سیاہ اور کرسی کے درمیان جمی کھڑی تھی۔ اٹل ارادوں کے ساتھ۔

تاوقتیکہ کوئی بھوکا چیتا۔ کوئی پیچ کوئی اسے ٹھنڈا نہ کردے۔ اس کو اپنے ارادوں سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ یہاں کے لوگوں کو درس دے گی۔ علم سکھائے گی۔ انقلاب لائے گی۔

یہاں تک کہ ان کی اگلی نسلیں پچھلی نسلوں کے کرتوتوں سے آگاہ ہو کر ان کو نیست و نابود نہ کردیں۔

اس کے سابقہ طالب علم تو خوشی خوشی شریک ہوئے تھے۔ کچھ بچے جو بھاگ لیے تھے بعد ازاں اور بچوں کے جم غفیر میں ننگے پاؤں دوڑتے دوڑتے شامل ہوگئے۔

اس کڑکتی سردی میں نہ ان کے پیروں میں جوتا تھا۔ نہ جراب۔ ان کی ناک کے نتھنوں سے گندگی بہتے بہتے جم گئی تھی۔ اور گالوں پر شدید سردی کی سرخی نیلی پڑ گئی تھی۔

اسکول کا آغاز ہوا تو عورتیں اپنا سامان اٹھا کر نکل گئیں۔

ان میں سے کسی بچے کو کوئی چھوٹی موٹی سورۃ زبانی یاد نہیں تھی۔ اس نے خود ہی سورۃ پڑھی۔ ترجمہ کیا اور دعا میں ان سب کو شریک کر کے اس کھلے آسمان کے نیچے دھوپ میں نئے علم کا آغاز ہوا۔

تھوڑی دیر کے لیے کوئی راہ چلتا دروازے میں رک کر اندر ہونے والے تماشے کا خوب مزا لیتا۔ پھر بدمزہ ہو کر اپنی راہ ہولیتا۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد اسکول تھا۔ یا شاید ان علاقوں میں ایسے بہت سے اسکول ہوں جو اس نے نہ دیکھے ہوں۔

ایک بوسیدہ سی گھن آلود الماری میں جانے کب کب کے اور کس کس وقت کے قاعدے کتابیں پڑے تھے۔ اس اسکول میں ایک ہی کمرے میں مختلف جماعتوں کے طالب علم تھے۔ اس کو مغز ماری تو بہت کرنی پڑی لیکن وہ ہر طالب علم کو حتی المقدور سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ ان ہی بچوں نے اپنی شکستہ اردو میں بتایا تھا کہ پچھلے سال یہاں ایک سر آئے تھے۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے۔ (شاید چیتے کے پیٹ میں) بعد دوپہر جب وہ گھر آئی تو اسے معلوم تھا جس طوفان سے اسے نمٹنا ہوگا۔

سوائے سرجن نثار کے کوئی بھی اس کے اس اقدام سے اتنا خوش نہیں تھا۔ بے بے اس کو ادھر اُدھر سے فقرے نکال کر محنت سے جوڑ کر یہ سمجھانے کی کوشش کرتی رہی تھیں۔ کہ یہ بستی آزاد پھرنے

والی عورتوں کو پسند نہیں کرتی۔

"کیوں نہیں کرتی؟" اس نے کج بحثی سے کہا "میں نے خود دیکھا ہے عورتیں ہر وقت اِدھر اُدھر پھرتی رہتی ہیں۔" بے بے کچھ دیر کو چپ ہوگئیں۔

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ وہ نیچ ذات ہیں۔ تمہارا مرتبہ اور ہے۔"

"میں بھی نیچ ذات ہوں۔" اس نے تحمل سے کہا۔ "اور میرا مرتبہ کچھ اور نہیں۔"

بے بے نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ اس طرح کی نہیں تھی۔ شاید گڑھی کی تنہائی نے اسے اکتا ڈالا ہے۔ حالانکہ اب تو اس گھر میں اس کی ہم عمر لڑکیاں بھی موجود ہیں۔ ان کی نماز کو دیر ہو رہی تھی۔ انہوں نے حیرت میں دیر تک غرق رہنے کے بجائے نیت باندھ لی۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ انہیں یقین تھا۔

لیکن اگلے روز وہ صبح اٹھ کر پھر اسکول چلی گئی۔ اس نے چھٹی کے وقت تک نہایت دیانت داری اور دل لگا کے انہیں پڑھایا۔

پھر وہ پری کو ساتھ لے کر بستی کی عورتوں میں شامل ہوگئی۔ المیہ یہ تھا کہ وہ ان کی اور یہ اس کی زبان سمجھنے سے قاصر تھیں۔ پری جھجکتے جھجکتے آئی ـــــ اتنے عرصے کے ساتھ نے اس میں بیلا سے وفاداری کا احساس بھی پیدا کر دیا تھا۔ وہ گڑھی کے مالکوں سے بھی غداری نہیں کر سکتی تھی۔

وہ ہچکچا کر چپ ہو رہی۔

"یہ کہتی ہیں ہم بوڑھی ہوگئی ہیں۔ ہمیں کام کاج سے فرصت نہیں۔ ہم کیسے پڑھ سکتے ہیں۔" پری نے خواتین کا جھجکتے جھجکتے ـــــ ترجمہ کیا۔

"یہ کہتی ہیں ہمیں کوئی شوق نہیں۔"

"یہ کہتی ہیں ہمارے مرد ہم سے خفا ہو جائیں گے۔"

وہ خاموشی سے واپس آگئی۔

ہر کام کی ابتداء میں انسان اسی طرح مایوسی کے گڑھے میں گرتا ہے لیکن اگر وہ اٹھنا نہ سیکھے تو لوگوں کی نظروں میں عبرت کا نشان بن جائے۔ اس نے خود کو خاموشی سے کمرے میں بند کر لیا تھا۔ ان دنوں زندگی پروگرام بناتے اور ان کو توڑتے گزر رہی تھی۔ بچوں کا نصاب' عورتوں کا نصاب' کشیدہ کاری۔ اون سلائیاں' کروشیا اور ان جلاوطنی کے دنوں میں اس کی کس کس سے جھڑپ نہ ہوئی۔ بے بے سے' نمارہ سے' خان گل سے ہاں لیکن اگر جھگڑا نہیں ہوا تو دانیال خان سے۔

انہوں نے جیسے اس کو من مانی کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اور کتنی مرتبہ وہ ان کے سامنے چیلنج کرتی دندناتی گزری۔ لیکن ان کی نظر میں اس کا یہ اقدام نہ قابل تحسین تھا نہ قابل مذمت۔

کہ اچانک گڑھی کی زندگی میں وہ انقلاب آگیا جو کم از کم بیلا کی نظروں میں ناقابل قبول ہی تھا۔

اگر یہ کسی بالکل اجنبی شخص کا معاملہ ہوتا تو تب بھی وہ شاید اس میں مداخلت کرنے سے باز نہ آتی۔ یہ تو پھر اس کی دست راست پری گل کی کل زندگی کا سوال تھا۔

وہ صرف چودہ سال کی تھی اور قیمت خان نے اس کی شادی اڑتیس سال کے اپنے قبیلے کے ایک فرد سے طے کر دی تھی۔ اڑتیس سال کا تو وہ اپنے منہ سے کہتا تھا لیکن دیکھنے میں پینتالیس سال سے کم نہیں لگتا تھا۔ اس کی پچھلی بیوی سے اولاد نہیں تھی اور قیمت خان اپنی نسل کے خاتمے سے خوف کھاتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھا۔ وہ اس کا اکلوتا بھتیجا تھا۔ اور ظلم یہ ہوا کہ پری نے اپنے تمام تر ضبط کے مظاہروں کو شان سے ملحوظ رکھ کر بیلا کے سامنے بھی زبان نہیں کھولی۔ وہ بچے کو بمشکل لفظوں سے روشناس کرا رہی تھی کہ اس کی سہیلی روتی دھوتی فریاد لے کر آ پہنچی۔ وہ روتی جاتی تھی۔ ناک پونچھتی جاتی تھی اور بڑی مشکل زبان میں بولے لفظوں کا وہ ایک مطلب بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کہ پری نے ٹائپ رائٹر سے اگلے لفظوں کی طرح کھٹ کھٹ ترجمہ شروع کر دیا۔

"یہ کہتی ہے پری پر ظلم ہو رہا ہے۔ ہم یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتے۔"

"وہ سمجھا رہی ہے کہ پری کی شادی بے جوڑ ہو رہی ہے۔ اس کا باپ ظلم کر رہا ہے۔"

"وہ کہتی ہے آپ جا کر سردار کو سمجھائیں۔ بے بے کے ہاتھ پاؤں جوڑیں۔ یہ لوگ چاہیں تو یہ شادی رک سکتی ہے۔"

وہ چپ چاپ پری کو دیکھتی رہ گئی۔

ہم لوگ ظلم سہتے سہتے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ ظلم برداشت کرنے کی عادت بھی اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے صلاحیتیں لے آتے ہیں۔ پری نے اس سے کچھ شکایت نہیں کی تھی۔ بیلا نے اس کو ترجمہ کرنے کے لیے اپنے ساتھ رکھ رکھا تھا۔ لہٰذا وہ کسی بے ایمانی کے بغیر ایک بہت بڑے ٹرانسلیٹر کی طرح بے لاگ رپورٹ پیش کر دیتی۔

ایسا کرتے ہوئے نہ اس کی آنکھیں جھکیں، نہ چہرے کا رنگ اڑا، نہ ہی وہ ہسٹیریک ہو کر روئی جیسے ہر روز ایک بوڑھے آدمی سے شادی کرتے رہنے کی عادی تھی۔

شاید جو ہم روز مرہ اپنے ارد گرد ہوتے دیکھتے ہیں اس کے اسی طرح عادی ہو جاتے ہیں اور منتظر رہتے ہیں کہ کس دن یہ واردات ہم پر گزرے گی۔

وہ جانتی تھی کہ بے بے سے بات کرنا بالکل ضائع جائے گا۔

انہوں نے بات تفصیل سے سنی بھی نہیں کہ کاٹ دی۔ "بیلا میں دیکھ رہی ہوں تم بہت حساس ہو اور ضرورت سے زیادہ حساس انسان اپنی ذات کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ لوگ اسی طرح خوش رہتے ہیں۔ یہ کوئی ظلم بھی نہیں۔"

اس کا اندازہ یہی تھا۔ اسے اس سے زیادہ جواب کی توقع بھی نہیں تھی۔ ظلم کے خلاف احتجاج کرنا تو آپ تب سیکھیں گے جب آپ ظلم اور انصاف کے درمیان تفریق کر سکیں۔ بے بے کے علاوہ کسی سے بھی کچھ کہنا بے کار تھا۔ گڑھی کے معاملات میں صرف وہی لوگ دخیل تھے۔ اور دوسرے شخص سے اس نے غیر محسوس طریق سے کترانا شروع کر دیا تھا۔ اور اتفاق ہی تھا کہ انہوں نے بھی کسی ضرورت یا کام کے سلسلے میں اسے طلب نہیں کیا۔ ورنہ شاید اس طلبی کے جواب میں وہ اس تابعداری کا مظاہرہ کر بھی نہ سکتی جو اس کی شخصیت کا خاصہ بن گئی تھی۔ خان گل مست ملنگ آدمی تھا۔

اور جب سے اس کو اپنی ذات میں ایک نئے انسان کا وجدان ہوا تھا۔ جہاں وہ اور لوگوں سے کٹی تھی خان گل سے بھی کٹ کر رہ گئی۔ باقی ماندہ لوگ اس کی اس بے توجہی کا شکار نہیں ہوئے۔ مرجن نثار ان کے زخم کو تسلی بخش پا کر ویسے ہی جا در رواں ہو گئے تھے۔ سارہ اور شیریں اپنی زندگی میں مصروف تھیں۔ کبھی سارہ نے کوشش بھی کی تو دوسرے شخص کو سرد مہر سمجھ کر وہ گزر ہی گیا۔

ایک بیبے بے تھیں۔ رات سونے سے پہلے وہ کچھ دیر کو ان کے پاس آ جاتی۔ وہ واضح تبدیلی تو اس میں دیکھ رہی تھیں لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ یہ انقلاب ان کا اپنا ہی لایا ہوا ہے۔ وہ دانیال خان کی سختیوں سے بھی واقف تھیں ضرور اس نے سخت سست کہہ کر بچی کو بدگمان کر دیا ہے۔

لیکن خان گل اندازوں کا عادی نہیں تھا۔

اس نے تھوڑے دن نہایت صبر و برداشت سے بیلا کے اس رویے کو برداشت کرنے کی کوشش کی پھر وہ سیدو شریف چلا گیا۔ صرف جانے سے قبل اس نے ایک آخر جھڑپ بیلا سے لی۔ وہ بھی بیلا کے سرد سرد سے خاموش رویے نے اسے جیسے کسی نئے راستے کا پتا دے دیا۔

"ابھی تو میں نے تم سے کیے وعدوں کو پورا بھی نہیں کیا تھا کہ تم اکتا گئی ہو۔"

"ہائیں۔ ہائیں۔ کوئی سنے گا تو کیا سوچے گا خان گل۔" اس نے شرارت سے جواب دیا۔ "یہ وعدے ہیں بھی کون سے گھڑ سواری۔ بستی کی سیر جنگل اور جنگل کے جانوروں کا دیدار۔ چلو خیر تمہارا کام زیادہ ضروری ہو گا تبھی تم جا رہے ہو۔" اس نے بڑے رسان سے کہنا چاہا۔ لیکن خان گل طبیعت کے اس رسان کو ہضم نہیں کر سکا۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ اور یہ تو جنگل کے جانور بھی سوچ رہے ہیں کہ تمہارے اندر ایک بڑی تبدیلی آ رہی ہے۔"

"قسم سے۔" اس نے خوش ہو کر کہا "تو جنگل کے جانوروں نے سوچنا شروع کر دیا۔ دعا کرو اسی طرح ایک دن انسان بھی سوچنے لگے۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ اگر انسان سوچنے لگا تو تمہارا کیا بنے گا۔"

وہ لڑنے کے بجائے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیا تم نے اپنے راستے بدل لیے ہیں؟"

بیلا سے اس کے لہجے کی معنی خیزی چھپی نہیں تھی۔ اور وہ اس تصور کو طول بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔

وہ اس کو ہمیشہ ہنساتا رہا تھا۔ ہنسانے والے آدمی کے چہرے پر تکلیف کا یہ اذیت ناک تصور دوستوں کو بہت تکلیف دیتا ہے۔

"جناب خان صاحب۔ میں نے تو ابھی اپنے راستوں کا انتخاب بھی نہیں کیا۔ آپ بدلنے کا بہتان باندھ رہے ہیں۔"

"راستوں کا انتخاب بہت مشکل کام نہیں۔" خان گل نے اپنی سخت قسم کی سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

"ہاں واقعی۔ یہ ایک پگڈنڈی ہے جو جنگل کی طرف نکل جائے گی۔ یہ راستہ بستی کی طرف جاتا ہے جہاں ایک پرائمری اسکول ہے۔ وہاں پر میرا پڑھانا آپ کے لیے کافی معیوب ہے۔ اور یہ ایک راستہ ہے جو ساتھ کی گڑھی کی طرف....."

"گویا آپ گڑھی کے چوک پر کھڑی ہیں اور آپ کو راستہ نہیں مل رہا۔ اور آپ بھول گئیں بیلا بی بی۔ یہ ایک راستہ گڑھی کے سردار مغل کی طرف بھی جاتا ہے۔"

وہ جب سے ملا تھا زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اس کو اصلی نام سے پکارا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر وہ الٹے قدموں پلٹ گیا۔ پتا نہیں گڑھی کے محل کی طرف اشارہ کرکے وہ اسے کیا جتا رہا تھا۔ اس گڑھی میں اس سمیت بہت سے مکین آباد تھے۔

لیکن وہ چلا گیا اور پری کے سلسلے میں جو اس کو ری سی بات کی امید تھی ساتھ لے گیا۔ شام تک وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ پری کی زبانی ہی اس کو پتا چلا کہ وہ سارا اور شیریں کو ہوسٹل چھوڑنے چلا گیا ہے۔ اور وہیں سے اس کی رپورٹ موصول ہو گئی کہ وہ چند روز سیدو شریف میں قیام کرے گا۔

اب گفتگو کے لیے صرف ایک شخص باقی تھا۔

اور اس سے گفتگو کرنے سے خنجر کھا کر مر رہنا بہتر تھا۔ اس کا لہجہ اس کے تیور کسی تلوار سے کم نہیں تھے۔ وہ اس کو ملاقات کے لیے ڈھونڈتی پھری اور وہ اصطبل کے پاس گھوڑوں کے سلسلے میں کسی سائیس پر برس رہا تھا۔

"قیمت خان" اس کے ٹھہرے ہوئے لہجے پر وہ چونک کر گھوم گیا۔ اس نے اپنی ذات کے گرد جو خوف کا بھوت طاری کر رکھا تھا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا یہ معمولی سی لڑکی اس کو یوں چونکا دے گی۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ قیمت خان۔" اس کے ماتھے پر جڑی ہوئی گھنی بھنویں دو بل کھا کر آپس سے جا ٹکرائیں اس کی آنکھوں میں حیرت اور اس کی جسارت پر تنبیہ سی تھی۔ لیکن لمحوں میں اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔ اس نے پشتو زبان میں اپنے سائیس کو غالباً "چلے جانے کے احکامات دیے۔ کیونکہ وہ فوراً" ہی غائب ہو گیا تھا۔ سوالیہ نشان۔؟ ایک بڑا سا سوالیہ نشان اس کے ماتھے پر تھا۔ اس کی آنکھوں میں تھا۔ اس کے چہرے پر تھا۔

"مجھے پری کی بات کرنی ہے؟" اس کے سوالیہ نشانوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی حیرت زدہ تھا۔ وہ پری کی آخر کون سی بات کرسکتی ہے۔

کسی پڑھے لکھے آدمی سے لمبی چوڑی تقریر کرنا۔ اور کسی ان پڑھ آدمی کو الف بے پڑھانا ایک اور کام تھا ایک بالکل ہی اجڈ گنوار شخص کو جو اپنے نظریات میں پتھر کی طرح سخت ہو۔ ہلانا بہت مشکل امر تھا۔

وہ اسی طرح اس کے راستے میں ڈٹا ہوا تھا۔

"پری کی بات؟"

"تم پری کی غلط جگہ شادی کر رہے ہو۔"

قیمت خان کی آنکھوں میں سرخ رنگ کا خون لہرایا۔ اگر اسے دانیال کا لحاظ نہ ہوتا۔ اور اگر وہ دانیال خان کی مہمان نہ ہوتی تو شاید لمحوں سے پہلے اس کی جسارت پر اس کی گردن اڑا دیتا۔ انسان اور جانور کے غصے میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ اور جانوروں کے بیچ میں رہتے رہتے انسان ان سے وفاداری تو سیکھتا بھی کہ نہیں لیکن ان کے جارحانہ تیور ضرور سیکھ لیتا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اعصاب تنے ہوئے تھے اور غصے کے مارے اس کے منہ سے کف نکل رہا تھا۔ لمحہ بھر کو اس کو لگا اگر قیمت خان کی کوئی دم ہوتی تو وہ ضرور کھڑی ہو جاتی۔

"مجھے پری سے محبت ہے۔ اور میں اس کے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ میں تمہاری شکایت دانیال خان سے لگاؤں گی۔ اور بے بے سے کہوں گی۔"

حالانکہ وہ اپنی دھمکی کے بے اثر ہونے سے خوب آگاہ تھی۔

اسی لیے شاید یہ دھمکی کارگر ہونے کے بجائے الٹی پڑ گئی۔ اس کا اشتعال پہلے سے بڑھ گیا۔ اور اس سے قبل کہ اس کا سرخ منہ ایک دھماکے سے پھٹ جاتا وہ اچانک ٹھنڈا پڑ گیا۔ شاید اس نے احساس کر لیا تھا کہ وہ باہر کی ایک لڑکی ہے جو علاقے کی روایات کی ابتدا سے بھی آگاہ نہیں۔

اس نے ٹھنڈے لہجے میں اور صاف اردو میں پوچھا۔ "یہ آپ سے پری نے کہا ہے؟"

"نہیں۔ وہ بے چاری کچھ کہتی تو تمہاری یہ جرأت ہوتی کہ تم اس پر اتنا بڑا ظلم کرو۔"

اس نے تھوک حلق میں نگل کر اسی شائستگی سے کہا۔

"بہتر ہوگا۔ آپ اس معاملے میں نہ پڑیں۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

"واہ۔ کیوں نہیں آئے گا۔ قیمت خان افسوس کی بات یہ ہے کہ تم پڑھے لکھے نہیں ہو۔ کاش تمہارے سردار نے تھوڑا سا دھیان تمہاری تعلیم کی طرف دیا ہوتا۔ تھوڑا سا تم لوگوں کو انسان بنانے کی کوشش کی ہوتی۔"

"ہاں۔" اس نے اس کی سکون سے بات کاٹ دی۔ "اگر پشاور کی ایک یونیورسٹی تک سولہ سال پڑھنے سے تعلیم نہیں آئی تو آئے گی بھی نہیں۔ یہ تو میری کم علمی ہے۔ سردار کا کیا قصور؟"

وہ گنگ رہ گئی۔ کتنی دیر تک انگریزی زبان میں بولے اس کے لفظوں کو وہ مختلف انداز میں تولتی سا کن سی رہ گئی۔

"اور ہاں بی بی۔" اس نے پھر اسی ٹھنڈے سے لہجے میں کہا۔

"میرا بھتیجا ایک ہی ایک ہے۔ اس کی پہلی بیوی سے اولاد نہیں۔ میرا اپنا کوئی بیٹا نہیں۔ آپ خود سوچیے ہم خانوں میں بے نام مر جانے سے بڑا گناہ کوئی نہیں۔"

"آپ اس کی دوسری شادی کسی اور سے کریں۔ پری کا مقدر۔"

"آپ چلیے۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر اسے محل کا راستہ دکھایا۔ "میں سردار سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گا۔"

وہ میکانکی انداز میں اس کے بڑھے ہوئے اشارے کی طرف چلی تھی۔ کہ ٹھٹک کر رک گئی۔

"دانیال خان سے نہیں کہنا۔"

زندگی میں پہلی مرتبہ قیمت خان کے سخت اور سنگین چہرے پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لہر لمحہ بھر کے لیے کوندتی دیکھی۔

"ٹھیک ہے۔ نہیں کہوں گا۔" اس نے اسی سنجیدگی کو دوبارہ طاری کر لیا۔

"لیکن یہ بھی یاد رکھنا یہ ہمارے گھر کا مسئلہ ہے۔ ہم اس میں باہر کے لوگوں کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔"

وہ خاموشی سے چلی آئی۔ وہ پری سے شرمندہ تھی۔ اور کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ پری نے اس سے شکایت نہیں کی تھی۔ اور اپنے لیے انصاف بھی نہیں مانگا تھا۔ لیکن وہ اس کی بجھی سی اٹھتی اور گرتی پلکوں کے پیچھے آنکھوں کے سب رنگ پڑھ لیتی تھی۔ وہ پچھلے برسوں سے اس کے ساتھ تھی۔

☆ ☆ ☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر اسکول میں دوسرا انقلاب آگیا۔

وہ جو ایک مدت سے چمگادڑوں کا مسکن تھا۔ جہاں آوارہ لڑکے اخروٹ کھیلنے کے سوا کچھ نہیں کرتے تھے۔ ایک اسکول ماسٹر آگیا۔ وہ محکمہ تعلیم کی روایات کے عین مطابق اسکول بند کر کے مخملیں گھاس پر سنہری دھوپ کا لطف لیتے سب بچوں کو ایک سرکل میں بٹھائے ان کے گھر کا کام چیک کر رہی تھی کہ اس کو اطلاع ملی کہ وہ محکمہ تعلیم کی طرف سے نامزد کردہ ایک ٹرینڈ ٹیچر ہے۔ اور متعلقہ ڈائریکٹر نے اس کی باقاعدہ تقرری کر کے یہاں بھیجا ہے۔ وہ لمحہ بھر میں سمجھ گئی۔

یہ سب دانیال خان کی محنت کا ثمر ہے۔

یوں اسکول میں لور لور پھرنے سے بچانے کا غالباً" ایک ہی حربہ تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی اس کو اپنے ان ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن وہ کتنے کمینے شخص تھے کہ درپردہ بڑی گہری قسم کی سازشوں میں ملوث تھے۔

اس نے نئے ٹیچر کے کاغذات کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔

"یہاں کوئی اسکول نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ہے بھی تو اس کا چارج آپ کو نہیں دیا جائے گا۔" اس نے بے مہری سے کاغذات لوٹا دیے۔ اس کو شاید جوائن کرنے کا زیادہ شوق بھی نہیں تھا۔ اتنی مصیبتیں جھیل کر اتنا سفر طے کر کے وہ اتنی دور پڑھانے آنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو سکون سے چلا گیا۔

اور بظاہر زندگی میں امن و امان بھی لکھا گیا تھا کہ اس واقعے کے چند ہی روز بعد دانیال خان کے کمرے میں اس کی طلبی ہو گئی۔

پچھلے دو پندرہ روز میں اس نے اس طرف کا رخ کیا تھا نہ کوئی بلاوا آیا تھا۔

اس خون اور گوشت کے کھیل کی کہانی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اسے ان کے روبرو جانا تھا۔ پتا نہیں وہ اپنے چہرے پر ان کے لیے پھیلی نفرت روک سکے گی یا کھل کر اظہار کر آئے گی۔

پتا نہیں ایک شقی قاتل اور ایک بے رحم خونی کے چہرے پر وہ کہانی دوبارہ پڑھ بھی سکے گی جو اس نے ادھوری پھاڑ کر پھینک دی تھی۔

وہ منقش خوبصورت دروازہ... جو لوگوں کی زندگیوں سے بے رحمی سے کھیلتا اور ان کی تقدیر کے بدترین فیصلے کرتا رہا ہے۔ اس نے بے آواز آہستہ سے کھولا۔

چند روز میں پندرہ برسوں کے فاصلے کیسے آجاتے ہیں؟

یہ وہی جگہ تو تھی جہاں ایک مرتبہ ایک مرتے ہوئے شخص نے آخری سانسوں میں اس کو پکارا تھا۔ موت کتنی خوفناک ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ آپ کو اپنے سامنے نظر آ رہی ہو۔ اس موت کے فیصلے ہم کتنے بے دردی سے دوسروں پر ٹھونس دیتے ہیں۔ وہ شخص اس کے سامنے ہی آرام کرسی میں دھنسا کمبلوں اور تکیوں کا ایک حصہ لگ رہا تھا۔

کاش میں تمہیں سمجھا سکوں دانیال خان۔ زندگی اتنی آرام دہ نہیں۔

لیکن وہ بے تکان اس کی آنکھوں میں دیکھتے اس کو حواس باختہ کرنے کے لیے جیسے ہر گر آزما رہے تھے۔ اس نے ماتھے پر بکھرے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر پیچھے کیا۔ اور ہاں ساتھ ہی ساتھ ایک تہیہ بھی کہ وہ اتنی کمزور اور اتنی پست نہیں۔ وہ نہ لفظوں کے گھماؤ میں آئے گی نہ نظروں کا یہ سحر اس کا کچھ بگاڑ

سکے گا۔

"آپ نے مجھے بلایا تھا۔" اس نے سامنے کھڑے ہو کر صاف اور کھلی آواز میں ان کو چونکا دیا۔

"تشریف رکھیے۔" انہوں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

وہ خاموشی سے صوفے کے پاس پڑی ایک کرسی پر بیٹھ رہی۔ اسے بلایا گیا تھا۔ اور وہ اپنے عزائم سے ہر جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے بیٹھی تھی۔ اور اس کے یہ عزائم ڈھکے چھپے بھی نہیں تھے۔ وہ ناہڑ تو ڑ اس کے چہرے سے برس رہے تھے۔

"جی؟"

انہوں نے کچھ دیر رک اس کی طرف دیکھا۔ اپنی گود میں بکھرے کاغذوں کو انہوں نے الٹ پلٹ کر کے کھڑکایا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی اس کی طلبی کے سلسلے میں یہ کاغذ بھی ایک اہم وسیلہ ہیں۔ شہر والوں نے اس کے خلاف کوئی عرضی دی یا اہل شہر کے تو یہ بس کی بات نہیں لگتی۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔ یہ پچھلے تیرہ دنوں میں آپ کی سرگرمیاں کیا رہی ہیں۔"

"ڈیکوریشن کا کام مکمل ہے۔ لائٹیں ارینج ہو گئی ہیں۔ فرنیچر کے سلسلے میں جو آپ نے..."

انہوں نے مشین کی طرح بولتے اس کے لہجے کو ٹوک دیا۔

"میں گھر کے اندر کی نہیں۔ باہر کی بات کر رہا ہوں۔"

"باہر کی بات کون سی بات؟" اس نے اپنے ہاتھوں کو مسلا۔

"اتفاق سے آپ حقیقت میں بھی اتنی ہی انجان ہیں۔ جتنی آپ اس وقت ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ازراہ کرم مجھے صحیح صورتحال سے آگاہ کیجئے۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کیلے میں بیٹھ کر دانیال خان سے جھگڑا کرنے کا پروگرام بنانا اور بات ان کی آنکھوں کے سامنے بیٹھ کر ان سے کج بحثی کرنا اور۔

"میں عورتوں کے پاس بیٹھ کر عام طور پر ان کو پڑھانے کی..."

"میں اسکول کی بات پوچھ رہا ہوں۔ آپ نے اسکول ماسٹر کے ساتھ کیا کیا؟"

"وہ۔ جوائن کرنے جو آیا تھا۔" جھوٹ بولنے کے سارے ہنر اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔

"اسے جوائن کیوں نہیں کرنے دیا گیا۔" ان کی آواز بتدریج تیز ہو رہی تھی۔

"وہ یونہی آیا تھا۔ وہ یہاں رہتا بھی نہ۔ اس کے ارادوں سے لگتا تھا وہ تھوڑے دنوں کے بعد نوکری چھوڑ کر چلا جائے گا۔ جیسے وہ ہمیشہ یہاں رہے گا بھی نہیں۔" اچانک ان کی آواز کی تیزی آہستگی میں بدل گئی۔

"اور آپ۔ آپ کو ہمیشہ یہاں ہی رہنا ہے؟"

بے ساختگی کی ایک لہر کے ساتھ بیلا کا منہ تپ گیا۔ واقعی اس نے یہاں تک تو سوچا بھی نہیں تھا۔ دانیال خان نے غالباً" اس کو صاف صاف جتا دیا تھا کہ اس اسکول ماسٹر اور کوہی عیسیٰ کی بیلا میں کوئی خاص فرق بھی نہیں۔ ان دونوں کو یہاں ملازمت کے لیے بلایا گیا ہے۔ مدت ملازمت کے خاتمے پر دونوں ہی کو جانا ہو گا۔ کتنی دیر وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی۔ کاش اس فرش میں اتنی سی گنجائش نکل آتی کہ وہ آہستگی سے اس میں سما سکتی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے لگا جیسے اس کے پاؤں میں بھاری پتھر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پڑے ہیں جیسے وہ ایک قدم اٹھا کر بھی ان کے سامنے سے گزر کر کہیں نہیں جا سکتی۔

"سوری" ایک طویل خاموشی کے پل سے گزر کر آہستگی سے اس کے منہ سے پھسلا۔ "آپ دنیا کو بدل نہیں سکتے جب تک آپ کے پیروں کے نیچے زمین مضبوط نہ ہو۔"

"سوری؟"

"اتفاق سے میں اتنا خود مختار نہیں بیلا۔ یہ اسٹیٹ حکومت کی ٹیکس دہندہ ہے۔ جہاں قانون حکومت پاکستان ہی کا چلتا ہے۔ ملازم بھی ان ہی کا آتا ہے۔ یہ دیکھو ایجوکیشن والوں نے میری کتنی سخت باز پرس کی ہے۔ تم نے ان کا آدمی بھگا دیا۔ اگر تمہیں اس اسکول میں نوکری کرنے کا شوق ہے تم مجھ سے کہتیں۔ میں تمہارا تقرر کروا دیتا۔" وہ خاموش ہو گئی۔ اچانک دنیا نے ایک بڑی کروٹ لی تھی۔ اور کہنے کو اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔

"میں تمہیں صرف ایک نصیحت کروں گا بیلا۔ تم عورتوں کو پڑھاؤ۔ بچوں کو تعلیم دو۔ جہاں دل چاہے جاؤ۔ جن کے درمیان رہنا چاہو رہو۔ لیکن خدارا قیمت خان کے معاملے میں دخل نہ دینا۔ وہ الٹے دماغ کا آدمی ہے۔" وہ چلتے چلتے رک گئی۔

"لیکن قیمت خان نے وعدہ کیا تھا وہ آپ سے۔۔۔" اس نے زبان دانتوں سے روک لی۔

"قیمت خان بہت ظالم ہے۔" حالانکہ وہ طے کر آئی تھی وہ آج دانیال خان کے ظلم جتا کر دم لے گی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی بیچ میں قیمت خان بھی آجائے گا۔

"لیکن قیمت خان کی تمہارے بارے میں اتنی بری رائے نہیں۔ اور وہ ظالم بھی نہیں۔ بس تم نے اس کو جانا نہیں ہے۔"

"آپ اس کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ وہ پری کی شادی وہاں نہ کریں۔ وہ پڑھا لکھا ہے۔ اور۔۔۔"

"پڑھے لکھے آدمی کو کون سمجھا سکتا ہے۔ آپ بہتر جانتی ہیں۔ ہاں آپ جو کچھ کر رہی ہیں۔ میں اس کی تعریف کرتا ہوں۔ آپ گر ان میں انقلاب لے آئیں تو۔۔۔"

وہ ساکت رہ گئی۔ اس انقلاب کا ٹارگٹ کون ہے سردار دانیال خان۔ شکر کرو کہ تم یہ نہیں جان سکے وہ مجرموں کی طرح قدم اٹھاتی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"بیلا بی بی۔ آپ نے ایک بات کا تو جواب دیا ہی نہیں۔"

وہ چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے پلٹ کر ایک سیکنڈ کے لیے ہی دیکھا تھا۔

"کیا آپ کو یہاں ہمیشہ رہنا ہے؟"

پھر جیسے وہ پتھر کی ہو گئی۔ لفظوں کے انداز بات کے انداز کو بدل ڈالتے ہیں۔ اور اس کے پاس دفاع کے لیے نہ ڈھال تھی نہ تلوار۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اترتی دوڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ جاگنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن سونا اس کے لیے دشوار ہو گیا۔

وہ آنکھیں بند کرتی تو جلتی چنگاریاں اس کی پلکوں میں چبھنے لگتیں۔ گرم گرم راکھ جیسے پپوٹوں کے درمیان آجاتی۔ وہ کن لوگوں کے درمیان رہتی ہے؟

کیا خونی قاتل، بے رحم شخص اس قدر پرسکون انداز میں کسی کے اندر اتنی اتھل پتھل کر سکتا ہے۔ وہ بچوں کو پڑھاتی یا عورتوں کے درمیان مغز مارتی اس کی آنکھیں جیسے ایک ہی کہانی اور ایک ہی منظر دہراتی رہتی تھیں۔

کبھی کبھی وہ اسی تواتر سے گزرنے والے منظر سے گھبرا جاتی۔

پھر وہ بچوں کے ساتھ ان کو بیڈمنٹن کھیلنا سکھاتی۔

ان کو بہتے ہوئے تیز تازہ پانی کے دریاؤں میں تیرنا سکھاتی۔

چھوٹے خچروں اور تیز رفتار گھوڑوں پر گھڑ سواری کا درس دیتی۔

شاید ایسا ہی ایک ناکام دن تھا۔ جس دن بچہ پانی میں ڈوبنے سے بچا۔ اور دوسرا بیڈمنٹن کی شاٹ مارتے پہاڑی سے لڑھک آیا۔ اور وہ تیز رفتار جن گھوڑا اس کو لے کر بے قابو ہو گیا۔

لحہ بھر کو اس کو لگا آسمان الٹ کر نیچے آیا ہے۔

پہاڑ اور بچے سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ اس نے پاگلوں کی طرح دوڑتے گھوڑے کو مضبوطی سے پکڑنا چاہا۔ لیکن اس نے منٹوں کی جست میں ٹھوکریں کھا کر اس کو گرا دیا۔

گرانے کے بعد بھی گھوڑے کا اشتعال ختم نہیں ہوا۔ وہ پہاڑی راستوں پر جھٹکے کھاتا اسی روانی میں بہت آگے نکل گیا۔ اونچائی سے گرنے سے کتنی دیر اسے چکر آتے رہے۔ شاید اس کے سر میں چوٹ بھی آئی تھی۔

گھوڑا بہت آگے نکل گیا تھا۔ وہ اسی طرح سر پکڑے دونوں گھٹنوں کو سہارا دیے اپنی چوٹیں سہلاتی رہی۔

یہ کون سی جگہ تھی۔ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

پتا نہیں وہ ابھی بستی ہی میں تھی یا بستی سے پار نکل گئی تھی۔ دوستوں میں تھی یا دشمنوں میں۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور چکرا کر گری۔

کتنے منٹ اس نے آنکھیں بند کر کے تھکے ہوئے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

"آہ" وہ سامنے ہی گھر نظر آ رہا تھا۔

گھر اور اس جگہ کے درمیان صرف سیب اور خوبانیوں کے باغ ہی تھے۔ ان باغوں میں اس نے کتنی مرتبہ چہل قدمی کی تھی۔ کتنی مرتبہ قیمت خان کو اس نے اس طرف دوڑتے دیکھا تھا۔ کتنی ہی مرتبہ قیمت خان نے اس کو یہاں سے دھتکار کر بھگایا تھا۔

اس کے سارے جسم میں سردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

یہ اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ چیتے کے ٹھکانے کے عین سامنے چاروں شانے چت ایسے لیٹی تھی جیسے مدتوں سے اس آرزو کی تکمیل کی خواہش کرتی آ رہی ہو۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن شدید چوٹ کے ہاتھوں وہ چکرا گئی۔

لیکن چکرا کر گرنے سے پہلے کسی نے اسے سنبھال لیا۔

ہوش اور بے ہوشی کی اس کیفیت کے درمیان اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ پھر آہستگی سے اس پر غنودگی غالب آ گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنے سے سنبھالا لیتے لیتے اس نے کسی کو خود پر جھکا ہوا محسوس کیا۔ جھکنے والا کچھ بڑبڑایا بھی تھا۔ لیکن وہ ہوش میں تھی ہی کہاں۔

اس کے اوپر جھکتا ہوا نیلا آسمان پھر دھندلا گیا۔ آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔

"ارے یہ جنگل میں پھول کہاں سے کھلا؟"

بلاشبہ اس فقرے کی ساخت کو اگر وہ ہوش میں ہوتی تو کبھی برداشت نہ کرتی۔ اس اجنبی سے ویرانے میں لہجے میں شائستگی اس کو بند ہوتی آنکھوں میں بھی محسوس ہوئی۔ یہ لہجہ' یہ انداز اس نے کہاں سنا ہے۔ اس نے دماغ پر زور دینا چاہا۔ بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل اس پر مرکوز کیا لیکن طویل سائے کے سوا اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ پھر وہ سایہ بھی اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ وہ دنیا سے بالکل بے خبر ہو گئی۔ ایسی میٹھی اور خوبصورت نیند جس کو مدتوں سے وہ ترس رہی تھی۔ اس کے وزنی سر اور آنکھوں پر طاری ہو گئی۔

وہ پتا نہیں کتنی دیر سوئی ہو گی۔

اس کی آنکھ کھلی تو اس کو لگا وہ رات بھر کی طویل اور پرسکون نیند کے بعد بیدار ہوئی ہے۔ لیکن وہ کہاں سوتی رہی تھی۔

کیا یہ لاہور والا گھر ہے؟ لیکن اس کی بستی پر بہروپیہ سا ایسے براق بادل تو نہیں اترتے۔ یا یہ رحیم چاچا کی بستی ہے۔ یا وہ یونہی کمر ٹکانے کو گوشی کے بستر پر لیٹی تھی اور سوتی رہ گئی۔

حالانکہ وہ کوئی شہزادی نہیں تھی۔ نہ اس کی آنکھوں کی سوئیاں نکالنے کسی کو آنا تھا۔ بوجھل سر سے اس نے ذہن سے بہت کچھ جھٹکنا چاہا۔ یہ سب کچھ وہ نہیں تھا۔ باہر جو پرندہ چہچہا رہا تھا اس کی سہانی آواز شاید وہ حشر کے دنگل میں بھی سن کر پہچان لے گی۔ ایک ہی آواز گڑھی کی آواز تھی۔ جو آزادی سے درختوں پر چہچہاتی پھرتی تھی' جس پر کوئی گولی اس کو خاموش رکھنے کے لیے آج تک نہیں گونجی تھی۔ لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی کے اس طرف چیک کپڑے کا پردہ سلاخوں سے سر ٹکرا کر پھڑپھڑا رہا تھا۔ باہر کوئی ویرانہ تھا کہ پرندوں کی بے شمار نئی آوازیں سکوت کو توڑ توڑ کر ماحول کو بالکل اجنبی بنا رہی تھیں۔

یہ گڑھی عیسیٰ خان ہے۔ لیکن گڑھی کا یہ کون سا گھر ہے یہاں تک وہ کیسے پہنچی؟

اس نے بستر سے تھوڑا سا اٹھنا چاہا۔ پاؤں چارپائی سے نیچے اتارا۔ لیکن زور کا ایک چکر آیا اور سر کی ٹیس نے اسے اٹھنے کے قابل نہ چھوڑا۔

"نہ نہ۔ یہ غلطی نہ کرنا۔ تمہیں چوٹ آئی ہے۔"

اس نے بے ساختگی میں آواز کی سمت کھلے دروازوں میں ایستادہ اس شخص کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔ بلاشبہ وہ اتنی مضبوط اعصاب کی مالک نہ ہوتی تو اس وقت ضرور بے ہوش ہو جاتی۔ گالوں پر بکھرے داڑھی کے سیاہ بال' طویل مونچھوں اور سر کے کالے سیاہ بے ترتیب سے بالوں کے سوا اس کے چہرے پر اگر کچھ تھا تو ان جڑی ہوئی بھنوؤں کے نیچے بڑی واضح روشن آنکھوں میں دیوانگی کی کوندتی سی لپک تھی۔

ایک نظر میں وہ شفاخانے سے بھاگا کوئی دماغی مریض لگتا تھا لیکن وہ بڑے دوستانہ انداز میں مسکراتا بھی تھا جس سے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی بے پناہ کرختگی ہلکی سی ماند پڑ جاتی۔

"یہ لڑھکتے ہوئے آپ کہاں سے آ رہی تھیں؟"

پتا نہیں وہ کہاں سے آ رہی تھی۔ اس وقت کسی کام میں مصروف تھی اور یہاں تک کیسے پہنچی۔ شدید چوٹ کا درد ماتھے میں ابھرا۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے ماتھا چھو کر جیسے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"او ڈاکٹر۔ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ حیرت ہو گی کوئی فلم بھی نہیں دیکھی۔"

اس نے حیرت سے اس اجنبی شخص کی طرف دیکھا۔ وہ کتنے سکون سے اس کے ساتھ مذاق کر رہا تھا۔ جیسے وہ اس کو برسوں سے جانتا ہو اور یہ بھی سمجھتا ہو کہ وہ کس مذاق پر ہنس دے گی یا کس مذاق پر برا منا لے گی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دکھتا سر تھام کر گھٹنوں پر روک لیا۔

"تم کوئی حور ہو شاید یا روح ہو۔ اور بھٹکتی بھٹکتی اس جنگل میں آ گئی ہو۔"

(یہ تو شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا وہ پاگل۔ وہ اپنے محور کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔)

"اور تمہارے سر میں بھی درد ہے۔ ٹھہرو میں تمہارے لیے کافی بنا کر لاتا ہوں۔ تاکہ تمہارے حواس ٹھکانے لگیں۔"

"یہ کیسی جنت ہے جہاں دودھ اور شہد کے بجائے کافی ملتی ہے۔"

"ہائیں۔" وہ دروازے تک واپس جاتا جاتا بے ساختگی میں ایڑیوں پر پلٹ گیا۔

"ویل سیڈ جو شخص اتنی تکلیف اور بدحواسی میں بھی حس مزاح نہیں ضائع کرتا۔ اس سے میری دوستی ہو سکتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے ہماری آپ کی بہت پکی دوستی ہو جائے گی۔ ٹھہرو' ابھی ہم ایک کپ کافی پر کچھ مذاکرات کرتے ہیں۔"

وہ لمحوں میں پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے بھی قیمتی تھی۔ اس میں رکھے مگ بھی عام مگوں سے مختلف تھے اور سنہری کافی سے بھاپ دیتی خوشبو بھی لذت آمیز تھی۔ اس نے ایک گھونٹ بھرا اور جیسے دماغ کی رگوں سے جسم کے ذرے ذرے تک تھکان اتر جانے والی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس وقت واقعی اس کو چائے یا کافی کی شدید ضرورت تھی۔ وہ اپنا پورا مگ تجربات کے گھونٹ گھونٹ خالی کرتی اور اس کی حلاوت کا مزا لیتی رہی۔ وہ جھکی' بھٹی' منحنی اور بیمار آدمی اپنی لپکتی تڑپتی زبان کو بمشکل لگام دیے اس کے مگ کے خاتمے کا انتظار کرتا رہا۔

"کافی اچھی تھی؟" اس نے ہاتھ بڑھا کر مگ ٹرے میں رکھا ہی تھا کہ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

اسے خیال ہی نہ آیا تھا۔ ورنہ پوچھنے سے پہلے یہ بات تو اسے خود کو کہنی چاہیے تھی۔ وہ تو چھپر کھٹ پر شہزادیوں کی طرح بیٹھی اپنی خدمت کے مزے لوٹ رہی تھی۔ جیسے وہ اسی کام کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

"شکریہ۔" اس نے خفیف سا ہو کر کہا۔ "بہت اچھی تھی۔"

"اور لو گی؟"

"نہیں شکریہ۔"

"تکلف نہیں۔"

"نہیں کوئی تکلف نہیں۔" اس نے خجالت سے کہا۔

"شکر ہے خدایا۔ اگر تم تکلف کرو گی تو مجھے تکلیف ہو گی۔" وہ بڑی دیر سے کھڑا تھا اس نے کونے سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرسی اٹھائی اور اس کے پلنگ کے نزدیک گھسیٹ کر بیٹھ رہا۔

"ہاں تو اب جائیے۔ تھوڑا کر! مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔ کیا فلموں میں اب بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔"

وہ بے ساختگی سے ہنس پڑی۔

"تمہاری ہنسی بہت دلکش ہے۔ اور دیکھو میری کسی بات کا برا مت منانا میں جنگلی سا آدمی ہوں اور سچ کہتا ہوں سچ کے سوا کچھ نہیں۔ چاہے بات اچھی ہو یا تلخ۔ میں تو سیدھے اور براہِ راست الفاظ ادا کرتا ہوں۔"

اس نے بہت تھوڑی سی دیر میں اس کے تاثرات سے بہت کچھ جان لیا تھا۔

"دیکھو یہاں میرے ارد گرد ایک فرضی سی دنیا ہے۔ لیکن وہ دنیا جنت ہے کیونکہ یہاں کی سب سے بڑی حقیقت سچائی ہے۔"

"میں نے آپ کو پہچان لیا۔" وہ بستر پر تھوڑی سی سیدھی ہو کر بیٹھی۔

"آپ خلیل جبران ہیں۔"

"آپ کا کیا نام ہے؟"

"خلیل جبران۔ ابھی تم نے خود تو لیا ہے۔ چلو اب اپنا نام بتاؤ۔"

"میرا نام ہے۔" وہ ہچکچائی۔ "چلیں خیر جو بھی ہوگا۔ آپ میرا نام لیں ہی نہ۔ آپ۔۔۔"

"یہ ٹھیک ہے خور ارضی۔ میں خود ہی تمہارا اپنا نام رکھ دیتا ہوں۔"

وہ چپ سے ہو گئی۔ "اس کا مطلب ہے آپ خلیل جبران کو جانتے ہیں۔ یہ یہاں اس بستی میں عجیب دستور ہے۔ ایک تو یہاں نئے نئے نام ڈالنے کا رواج ہے دوسرے یہاں عموماً عالم فاضل لوگ جاہل نظر آتے ہیں اور جاہل لوگ قابلیت کے زعم میں بڑے خود گماں ہوتے ہیں۔"

"تو تم اس بستی کی نہیں ہو۔ میں بھی حیران تھا اس بستی میں یہ خوشگوار ہوا کا جھونکا۔ تم آئی کہاں سے تھیں؟"

"لاہور سے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"لاہور سے گھوڑی پر دوڑتی۔ ناممکن۔" اس نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں چڑھائیں۔ اسے اس کے جنگلی چہرے پر یہ شائستہ سی شرارت بہت بھلی لگی۔ کم از کم وہ دشمنوں میں سے تو نہیں لگتا تھا۔

"میں دراصل سردار دانیال خان کے محل میں ملازم ہوں۔"

"اوہ۔ تب تو سردار دانیال خان بڑے حسن نواز آدمی ہوئے۔ کیا ملازم ہو وہاں؟"

"ملازمت تو ملازمت ہوتی ہے۔ بس کیا اور کہاں نہیں ہوتی؟"

"ارے عقلمند لڑکی۔ شکر کرو ملازم ہو قیدی نہیں ہو۔ قید ہونا ملازم ہونے سے بدتر ہے۔"

وہ چپ ہو گئی۔ یہ پاگل آدمی عجیب عجیب منطقیں جھاڑتا ہے۔ اور بے تکلفی سے دوسروں کو بیوقوف بنا رہتا ہے۔ حالانکہ ابھی ابھی وہ سچ بولنے کا سخت دعویٰ کر رہا تھا۔ اس کے سر کی اب درد ٹھیک ہو گئی تھیں اور آنکھوں کے سامنے ناچنے والے تارے بھی کہیں ڈوب گئے تھے۔ اس نے پلنگ سے پاؤں اتار کر زمین پر رکھا تو اس کے قدم لڑکھڑائے نہیں۔

پری نے تو اب تک اس کی گمشدگی پر محل میں دہائی ڈال دی ہوگی۔ اور معلوم نہیں اب تک کتنی

گولیاں اِس طرف اور اُس طرف سے چل چکی ہوں گی۔

"اگر تم کھانے تک رکو تو میں تمہیں بہت شاندار کھانا کھلاؤں گا۔ اپنے ہاتھ کا پکا۔ میں بہت کمال کا آدمی ہوں۔"

"مجھے یقین ہے۔" اس نے سلاخوں کے پیچھے دور دور تک پہاڑی کے دامن میں پھیلے کھیتوں کے اس طرف خوبانی اور بادام کے باغوں کی طرف دیکھا۔ "آپ بہت کمال کے آدمی ہیں۔ لیکن میری تھوڑی بہت یادداشت واپس آ چکی ہے۔ اور جو مجھے یاد آیا وہ بہت خطرناک ہے۔"

"پلاؤ۔ زردہ۔ مرغ۔ گڑ کے چاول۔ طہری۔ جو کچھ کہو۔"

"اوھار۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔" اس نے خوشی سے کہا۔ "اس کا مطلب دوبارہ آؤ گی۔"

"ضرور۔" اس نے بے خیالی میں کھیتوں سے پرے دیکھتے کہا۔ "یہ وہی جگہ تو نہیں جہاں کہیں چیتے بھی رہتے ہیں؟"

"تم سے کس نے کہا؟"

"قیمت خان نے۔"

"تب تو تمہاری معلومات بہت قیمتی ہیں لڑکی۔"

"پتا نہیں یہ جگہ محل سے کتنی دور ہے۔"

"یہاں سے تیرہ کلو میٹر ہے۔ لیکن ایک خفیہ راستہ بھی ہے جو صرف میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔"

وہ پھر خوشدلی سے ہنس دی۔ "پراسرار حویلی۔"

"عرف چیتے کا راز۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔ یہ دیکھو یہ سامنے پہاڑ کے دامن میں۔ ایک چھوٹا سا غار ہے جو سیدھا محل میں قیمت خان کے کمرے کی طرف کھلے گا۔ آپ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اتریں تو تیرہ کلو میٹر لگتے ہیں۔ یہ اس راستے سے تیرہ منٹ ہے۔"

"کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"لیکن اتنی رازداریوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"ضرورت ہے نا۔"

"کیا ضرورت؟" اس نے مستحکم لہجے میں پوچھا۔

"تم بہت ضدی ہو۔" اس نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے۔ "میں یہاں قیدی ہوں قیمت خان کا اور قیمت خان کبھی کبھی اچانک میرے پاس آتا ہے۔"

کتنی دیر حیرت اس کے چہرے سے جگہ جگہ برستی رہی۔

وہ عجائبات اور طلسمات کی عجیب دنیا میں نکل آئی تھی۔ ہر لمحہ ایک نیا حادثہ نیا واقعہ اس کو چونکاتے رہتے تھے اور یہ دیوانہ جو محاورے کے مطابق فرزانوں سے زیادہ عقل کی باتیں کرتا تھا کیا اس کی بکواس کو محض ایک بڑ سمجھے یا اعتبار لے آئے۔ وہ تو بات کر کے بے فکر ہو گیا تھا۔

"قیدی۔ قیمت خان کا۔" آہستگی سے اس کے لبوں سے ادا ہوا تھا۔

"کیا تم کو محل میں کوئی اور جانتا ہے کہ ایک آدمی یہاں قید ہے؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ اس گھر میں ایک چیتا ہے خطرناک اور خونخوار۔ جو دشمنوں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتا ہے۔ بلکہ تمہیں پتا ہے لڑکی کہ چیتا دوست اور دشمن میں فرق بھی نہیں کر سکتا۔"

"اوہ۔" وہ دیر تک خاموشی کے طلسم میں گھری رہی۔

"تو وہ چیتے آپ ہیں۔ اور اصلی چیتے؟"

"اصلی نقلی سب میں ہی ہوں۔"

"لیکن آپ تو خطرناک نہیں لگتے۔" اس کے بچوں ایسے معصوم لہجے پر وہ ہنس دیا۔

"پنجرا کھلا ہو، تب چیتا خطرناک بھی ہو لڑکی تو کسی کو کیا نقصان پہنچائے گا۔ سوائے اس کے کہ اپنے پنجوں کو سلاخوں پر بار بار مار کر زخمی کر لے۔ تم مجھ سے ڈر تو نہیں گئیں۔"

وہ ڈرنے کے بجائے چپ ہو گئی۔ اسے اس مظلوم سے آدمی پر ترس آنے لگا تھا۔

"کیا محل میں رہنے والے لوگ اس بات سے آگاہ ہیں کہ آپ۔۔۔؟"

"شش۔ کسی سے اس بات کا ذکر بھی نہیں کرنا۔ دیکھو۔" اس کی دیوانگی سے سوچتی آنکھیں کہیں اور جمی ہوئی تھیں۔

"ایک مدت بعد ایک ایسے شخص کو دیکھا ہے جس کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا ہے۔ اور میں تمہیں گنوانا بھی نہیں چاہتا۔ کسی سے مت کہنا مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ سوائے ایک نقصان کے۔"

"نقصان؟" اس نے پھر سادگی سے سوال دہرایا۔

"ہاں نقصان۔ بہت بڑا نقصان۔ تمہیں کھو دینے کا نقصان۔ ہیں نا۔ کاروبار میں یہ کتنا بڑا گھاٹا ہے۔"

"آپ کیا کاروبار کرتے ہیں؟"

"گھاٹے کے۔ میں دیکھ رہا ہوں اور ذہنی طور پر تیار ہو رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے یہاں بھی میرا نقصان ہو گا۔"

"آپ کو اس قید خانے میں نقصان کون پہنچاتا ہے؟ یہ قیمت خان؟ میں سردار کو بتاؤں گی یہ ضرور ان کی لاعلمی میں ہو رہا ہے۔ وہ اس قسم کے آدمی نہیں ہیں۔ وہ آ کر سنیں گے۔"

وہ جوشِ بیان میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ مخاطب اس کی بات پر دھیان دیئے تھا اور اس کا شفقت سے بدلتا رنگ جیسے نقابوں سے پردے اٹھا رہا تھا۔

"اپنا دھیان رکھنا اچھی لڑکی۔ تم بھیڑ کی طرح معصوم ہو اور دنیا میں چیتے جیسے اور بہت درندے ہیں۔ میں تمہارا ضرور انتظار کروں گا۔ تمہارے آ جانے سے تھوڑی دیر کے لیے تو یہ قید خانہ بھی جگمگا اٹھا تھا۔"

وہ ابھی پہاڑی سے بہت اوپر بھی نہیں پہنچی تھی کہ اسے گھوڑا لیے ہوئے پری مل گئی۔

"آپ کہاں چلی گئی تھیں؟" اس نے تشویش سے کہا۔ "میں اتنی پریشان تھی لیکن سمجھ نہیں سکی کسی سے کہوں یا۔ گھوڑی خالی واپس آئی اور تھان پر بابا نے باندھ بھی دی۔ انہیں یا کسی کو پتا نہیں چلا۔"

"کسی کو پتا نہیں چلا۔ یہ اچھا ہوا پری۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا آپ ٹھیک ہیں۔ میرا دل کہتا تھا۔ لیکن اب آپ تھوڑی دیر اور نہیں آتیں تو میں ضرور سردار محل میں کسی سے کہہ دیتی۔ آپ کہاں تھیں؟"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ الجھے الجھے لمبے بالوں میں گھرا شخص تھوڑی دیر پہلے پلٹ کر دیکھنے پر نظر آ رہا

تھا اب کہیں غائب تھا۔

"یہاں ایک دیوانہ بھی رہتا ہے۔ مجھے فکر تھی کہیں وہ آپ کو پکڑ نہ لے۔"

اس نے غور سے پری کو دیکھا۔ "کیا اس نے پہلے کسی کو پکڑا ہے؟"

"وہاں تو کوئی جاتا ہی نہیں۔ جی وہاں چیتے بھی تو ہیں اور وہ مجذوب ہے۔ وہ بد دعا دے کر ساری دنیا کو پھونک سکتا ہے۔ سب اس سے ڈرتے ہیں۔"

"تم ایسی باتوں کو مانتی ہو؟"

"مانتی تو نہیں۔" اس نے مایوسی سے کہا "لیکن ڈرتی تو ہوں۔"

"مجذوب سے ڈرتی ہو؟"

"نہیں بابا سے۔ اس نے صداقت سے سچ بولا۔ "اگر انہوں نے سن لیا ہم میں سے کوئی بھی وہاں گیا تھا تو وہ ہمیں اڑا دیں گے۔"

"لیکن کوئی کیسے سنے گا پری۔ جب تک ہم دونوں میں سے کوئی زبان نہ کھولے۔ اور ہم دونوں نہیں کھولیں گے" وہ کمال کی رازدار تھی۔ اس کے لیے کسی وعدہ وفائی کے الفاظ کی ضرورت بھی نہ تھی۔

اور یہ شاید اتفاقات کی کڑی کا ایک حصہ تھا جب وہ محل میں پلٹی تو کسی کو کانوں کان اس حادثے کی خبر نہیں ہو سکی۔ وہ ان دنوں اتنی مصروف تھی اور گھر سے اتنی اتنی دیر تک کے لیے باہر رہنے لگی تھی کہ کسی کو اس کی اپنی ذات سے اتنی دیر کی علیحدگی پر شبہ نہیں ہوا۔ وہ بے بے کے پاس آ کر بیٹھی تو انہوں نے اس کے کھوئے کھوئے پن کو محسوس بھی نہیں کیا۔ وہ دن بھر اپنے آپ کو تھکاتے رہنے کی عادی ہو گئی تھی صبح سے دوپہر تک اسکول میں پڑھاتی۔ پھر عورتوں کی طرف نکل جاتی۔ وہیں کہیں جہاں بھوک لگتی چپکے سے کسی کے گھر بیٹھ کر کھانا کھا لیتی۔ شام کو بچوں کو سکھانے پڑھانے بیٹھ جاتی۔

"آپ نے چائے پی لی بے بے؟"

کتنی مدت بعد اس نے اتنی اپنائیت سے فرمائش کی تھی۔ بے بے نے اون سلائیاں میز پر دھر دیں اور ان کے علم میں بھی نہیں تھا کہ اتنی محبت سے وہ اسی کے بچھائے جال میں پھنس چکی تھیں۔

"بے بے کی جان۔ تمہارے ساتھ اور پی لوں گی۔"

وہ جلدی جلدی چائے گرم اور اچھی لانے کے لیے مریم کو سمجھا رہی تھیں۔ وہ گردن نیہوڑائے سوچتی رہ گئی۔ ہم معصوم لوگوں کو کتنی بیدردی سے دھوکا دے ڈالتے ہیں۔ یہ اس گڑھی کی روایت ہے شاید کہ ہر ظالم مظلوم کے ساتھ دھوکا دہی کی واردات ضرور کرتا ہے۔ وہ بھی شاید گڑھی کا حصہ بن کر انہی روایات کا شکار ہو رہی تھی۔

بے بے کے پاس جو بچی کبھی کبھی پیلا کی کہنی تھی۔ وہ اب اس سے بھی محرومی کا شکار ہو چکی تھیں۔ آج وہ کتنی مدت بعد ان کے پاس آئی تھی۔ پیار سے بیٹھی تھی۔ اور اپنے پن سے چائے کو پوچھا تھا۔ واقعی پتا نہیں وہ بھی کیسے اتنی شفیق خاتون سے اتنی مدت کے لیے دور دور ہو گئی تھی۔

چائے کی قطعی خواہش نہ ہونے کے باوجود اس نے اپنا لبالب بھرا کشمیری قہوے کا پیالہ گھونٹ گھونٹ پینا شروع کر دیا۔ وہ آئی تھی اور ان کی چیزوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اخلاق نبھانے میں بے بے کا بھی ثانی نہ تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ میں نے تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا ہے اتنی جان مت مارو۔"

"مجھے اچھا لگتا ہے بے بے۔ آپ کو برا تو نہیں لگتا۔"

"برا تو خیر نہیں لگتا۔ یہ تمہاری محبت ہے بیلا۔ لیکن۔۔۔" وہ ہچکچا سی گئیں۔

"مجھے معلوم ہے تم دونوں ہی بہت ضدی ہو۔ تم میں سے کوئی بھی میری بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ لیکن بستی کے لوگ تمہیں اس نیکی کے صلے میں کوئی بھی کبھی بھی ۔۔" وہ بدشگونی کی کوئی بات منہ سے نکالتے نکالتے چپ ہو گئیں۔

"کون دونوں بے بے؟"

"تم بھی اور دانیال بھی۔ اگر ذرا بھی عقل استعمال کرو۔ اگر ذرا بھی۔" وہ جیسے خوف کے صحرا میں دوڑتے دوڑتے خواب سے بیدار ہو گئیں۔ انہوں نے اون سلائیاں دوبارہ اٹھائیں۔

"تمہارا کام کیسے جا رہا ہے؟"

"کام بہت اچھا جا رہا ہے بے بے۔ میں ضدی نہیں ہوں۔ میری خواہش ہے جب تک میں یہاں ہوں بچے مجھ سے ایک قاعدہ یاد کر لیں یا۔۔۔"

"جب تک تم یہاں پر؟ کیا مطلب تم کہاں جا رہی ہو؟"

"میرا مطلب ہے۔ جب بھی میں جاؤں گی۔ آخر ایک دن تو مجھے جانا ہے بے بے۔"

بے بے چپ کسی گہری سوچ میں غرق۔

"جو تمہارا جی چاہے کرو۔ میں تو اس لیے کہتی ہوں کہ کہیں نہ دیکھو، وہ جو چونے کا سفید گھر ہے نا، وہاں چیتے رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو اور بچوں کو اس علاقے سے دور رکھنا۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں خوبانی کے باغوں سے اس طرف جو جی چاہے کرو لیکن اُدھر وہاں واپس جانے کی بات کی تو میں ایک لگاؤں گی۔"

بے بے کی بھرائی سی آواز نے اس کی آنکھیں بھگو دیں۔

اگر بے بے نہ ہوتیں تو شاید زندہ رہنا دشوار ہو جاتا۔

"ٹھیک ہے بے بے۔ آپ جو کہیں گی اور جس طرح کہیں گی۔ میں ہمیشہ آپ کی بات مانوں گی۔ صرف آپ مجھے یاد دلاتی رہا کریں۔" پتا نہیں چونے کے اس گھر میں رہنے والے چیتے کے راز میں اس بستی کا اور کون کون آدمی شریک ہے۔ اور کوئی نہیں تو کم از کم خان گل کو اس واقعے سے ضرور آگہی ہوتی۔ اور اگر وہ ذرا بھی آگاہ ہوتا تو سادی خصلت کا معصوم آدمی اس کو ضرور شریک راز کر لیتا۔

وہ رات کو دیر تک بستر پر لیٹی چھت تکتی رہی۔

گو اس وقت وہ اس سے ناراض اور کوسوں دور تھا۔ وہ اس کو بلا کر اس مہم میں شریک کر لیتی تو شاید حالات اس کے حق میں نہ رہتے۔ وہ تھوڑی بہت واقف ہو گئی تھی کہ وہ اس سے کیوں ناراض ہوا تھا اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے کیوں اس سے اتنی دور جا کر رہنے لگا تھا۔

بے بے کو بھی کسی نے اصلیت نہیں بتائی۔ ورنہ وہ چیتوں کے ذکر پر اس طرح نہ لرز جاتیں۔

رہ گئے دانیال خان۔

اور کون جانے جو یہ سارا جال اور اس کے تانے بانے ان کی ذات کے ارد گرد الجھ رہے ہوں۔ اور کیا معلوم قیست خان وفاداری اور محبت کے فریب میں درپردہ غداری کا مرتکب ہو۔

سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں شل ہو کر بند ہو جاتیں لیکن ان رازوں کا کوئی بھی سرا اس کے ہاتھ نہ آتا۔ وہ خاموشی سے قیست خان کا تعاقب کرتی رہتی۔

جیسے ایک زمانے میں وہ خود بیلا کے پیچھے تند و تیز لہجوں میں غراتا تھا لیکن پھر اس نے بیلا کو بے ضرر سمجھ کر یا قابل اعتماد سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔

قیست خان دن میں ایک مرتبہ چیتوں کے مکان کی طرف ضرور جاتا تھا اور کوئی روک ٹوک بھی نہیں کرنے والا تھا کیونکہ گڑھی میں اس کا شہرہ چیتوں کے ٹرینر کی حیثیت سے بھی اتنا ہی مسلم تھا جتنا گڑھی کے نمک خوار کی حیثیت سے۔ گویا پہلے واقعے کی طرح دوسرا حادثہ بھی قابل اعتماد نہیں۔

باقی کا بیشتر وقت وہ گھوڑوں کے قرب میں گزارتا۔ اسے گھوڑوں سے شدید پیار تھا۔ وہ ایک ایک گھوڑے کو علیحدہ علیحدہ بہت وقت دیتا۔ تھپکی دیتا ان سے باتیں کرتا جاتا۔ جیسے دوان سے اپنی غیر موجودگی کی خبروں پر تبصرہ کرتا ہو لیکن چونکہ وہ بہت روانی سے پشتو بولتا تھا لہٰذا اس کا بولا سمجھ میں نہ آتا۔

پھر وہ ٹال پر چلا جاتا۔ جہاں پر اس کی موجودگی بہت ضروری اور اہم تھی۔ سی آئی ڈی کا انتظام، جنگلات اور لکڑی کی کٹائی کا سارا کام اس کی نگرانی میں ہوتا۔

یہ وقت سب سے محفوظ تھا۔ کیونکہ وہ جب جنگلات کی طرف جاتا تو وہاں گھنٹے بسر کرتا تھا۔ اور معلوم نہیں وہ دانیال خان کو کہاں کہاں دھوکا نہیں دے رہا تھا۔ دانیال خان خواہ کچھ بھی۔ لیکن بحیثیت سردار اسے دھوکا نہیں دینا چاہیے۔ یہ غداری ہو گی۔ اور غداروں سے اسے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

اس کے پاس اس مسئلے کے حل کا صرف آخری تیر بچا تھا۔

اگر یہ تیر بھی ناکارہ رہ گیا تو وہ تہی دست ہو جائے گی اور نہتا آدمی کتنا بے بس کتنا بے چارہ سا لگتا ہے لیکن اس کا کوئی اور علاج بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے جب دانیال خان کی اسٹڈی میں قدم رکھا اس وقت بھی اس کے علم میں تھا کہ چیتے کے گھر میں تو وہ اس وقت داخل ہو رہی تھی۔ ذہنی طور پر وہ اس کی ہر باز پرس، ہر جھڑکی اور ہر قسم کی تضحیک سے نبرد آزما ہونے کی تیاری کر کے چلی تھی لیکن اسٹڈی ٹیبل پر فائلوں میں غرق لیمپ کی روشنی میں ان کو بے پناہ مصروف دیکھ کر اس کے سارے ہتھیار ہاتھ سے ایک ایک کر کے چھوٹ گئے۔

لمحہ بھر اس نے سوچا، وہ واپس لوٹ جائے لیکن واپسی کے ارادے کا وہ لمحہ بھی چپکے سے گزر گیا۔

دانیال خان نے چین فائل پر نظر ڈالی تھی۔ گو انہوں نے دھکا بند نہیں کیا تھا۔ اور بھنویں اٹھائے منتظر تھے کہ وہ بات کر چکے تو اپنا کام دوبارہ شروع کریں۔ لیکن کہنے کو اور کرنے کو اس کے پاس بچا ہی کیا تھا۔

حتی کہ چپکے سے بھاگ نکلنے کا خیال بھی اب خام ہی تھا۔ ان کی مستقل جمی سوالیہ نظریں اس پر گڑی تھیں۔ اور اس کو ان سے اب کچھ نہ کچھ کہہ کر ہی پیچھا چھڑانا تھا۔

وہ خجالت سے دروازے میں کھڑی اپنا نچلا ہونٹ اضطراری سی کیفیت میں دانتوں میں دبا رہی تھی اور وہ جانتے تھے۔ یہ ہیجانی انداز وہ صرف اس وقت اختیار کرتی ہے جب وہ کسی بڑی الجھن میں مبتلا ہو۔ وہ یہ بھی جانتے تھے ان دنوں اس نے خود کو کیسی کیسی الٹی سیدھی مشکلات میں پھنسا رکھا تھا۔ انہوں نے فائل ایک طرف کھسکا کر بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف توجہ کی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آخر آپ یہ کب تک بہت بنی کھڑی رہیں گی۔ مجھ سے کوئی کام ہے...؟"

وہ جواب نہیں دے سکی لیکن دو قدم اٹھا کر کمرے کے اندر آنے کی ہمت کر ہی بیٹھی۔

"یقیناً کوئی بڑی بات ہوگی۔ فرمائیے۔" ان کے چہرے کی سنجیدگی کا ساتھ ان کی آنکھوں کا تاثر نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ کچھ بھی کر لے اس کا مذاق اڑایا جائے گا۔ ابھی تک اس کے کسی عزم، کسی ارادے، کسی بھی کام کو کسی نے ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ کسی نے اس کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا اور دانیال خان تو مستقل اس کا تمسخر ہی بناتے رہے ہیں۔

وہ ان کے بھٹ کے دروازے پر گو مگو کی کیفیت سے دوچار الجھ رہی تھی۔ وہ اس شخص کے پاس فریاد لے کر آئی تھی جس کے لیے اس کے دل میں عجیب و غریب قسم کی نفرت تھی۔ وہ نفرت جو کسی بھی ایسے مغرور اور فرعون صفت آدمی کو دیکھ کر ہمیشہ کسی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جو لوگوں کی تقدیروں سے کھیلتا ہو اور با اختیار ہونے کی وجہ سے ان کی زندگیوں کے بارے میں بے رحمانہ فیصلے کرتا رہا ہو۔ وہ بھی ایسے بے رحمانہ فیصلوں کے نتیجے سنانے میں بے بس نہیں رہی تھی۔

وہ بے دردی سے ان کے منہ پر کھڑے ہو کر کہنا چاہتی تھی۔

مجھے تم سے نفرت ہے۔ نفرت۔

لیکن یہ دانیال خان تھے جنہوں نے اس کو شدید الجھنوں میں مبتلا دیکھ کر کرسی چھوڑ دی تھی اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر اس کے روبرو کھڑے اس کے احکامات کے منتظر تھے۔

لیکن وہ یہ ہی تو ان سے کہنے سے عاجز تھی کہ مجھے تم سے نفرت ہے دانیال خان۔ اتنی شدید نفرت کہ شاید دنیا میں کبھی کسی نے کسی اور سے... لیکن نفرت میں اتنی بے چارگی تو نہیں ہوتی۔

اور شاید وہ ان سے واقعی اتنی نفرت کرتی تو یوں ان کو بچانے کے لیے بار بار سامنے ڈٹ کر کھڑی نہ ہو جاتی۔

"بیٹھ جاؤ بیلا۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اس کے ڈولتے ہوئے لرزتے کندھوں کے جھکاؤ پر ٹکا دیں۔ "اور آرام سے وہ سب کہہ دو جو کہنے آئی ہو۔ میں تمہارے ہاتھوں نقصان اٹھانے کا عادی سا ہو گیا ہوں۔"

اس نے کندھے کی خفیف سی جنبش سے ان کے ہاتھ جھٹکنے کی کوشش کی۔

"اب کیا ہوا ہے؟ اسکول ماسٹر کو بھگانے، بے بے کو خفا کرنے، خان گل کو خود ساختہ جلاوطنی پر مجبور کرنے اور قیمت خان کے غصے کو ہوا دینے کے بعد اب تم نے کون سی غلطی کر دی ہے؟"

وہ اس کے جھٹک کر گرائے ہاتھ سے دوسرے کندھے پر رکھے ہاتھ کی انگلیوں پر الزامات کی فہرست گن کر سنانے لگے۔

"قیمت خان آپ کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔" الفاظ اس کے منہ سے پھسلے تھے اس نے ادا نہیں کیے۔

وہ ان پر سے ہٹائی اور بند حسن ماند حتیٰ ہی رہ گئی اور وہ ہوا ہو گئے۔

ایک جھٹکے سے دانیال خان نے ہاتھ کھینچ لیے۔

"حالانکہ میں جانتا ہوں اس بات کو سچ ثابت کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا تمہیں جھٹلانا۔ تم اس کی بیٹی والے قصے کو اپنے اوپر طاری نہ کرو بیلا۔ تمہارے خلوص پر کسی کو شبہ نہیں ہے۔ لیکن ..."

"یہ وہ بات نہیں ہے۔ کچھ اور ہے۔" اس نے اپنی سنجیدگی کو جانے نہیں دیا۔ "لیکن آپ فی الحال میری بات پر اعتبار نہیں کریں گے۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے مجھے کچھ وقت چاہیے ہوگا۔ پھر آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور مان لیں گے۔ باقی وادے۔ جو چار پانچ الزام آپ نے مجھ پر لگائے ہیں ان میں سے کسی میں بھی میرا قصور نہیں۔ اسکول ماسٹر تو واپس آیا ہی نہیں۔ بے بے مجھ سے خفا ہو ہی نہیں سکتیں۔ خان گل کی جلاوطنی سے میرا کیا مطلب اور قیمت خان نے تو خود میرے غصے کو ہوا دی ہے۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

"کیا خان گل کے یہاں سے چلے جانے میں واقعی تمہارا کوئی دخل نہیں بیلا۔ لیکن بہر صورت وہ تم سے ناراض تو تھا اور قیمت خان نے تو تمہارے غصے سے ڈر کر اپنی بیٹی کی شادی کا فیصلہ بدل ہی دیا ہے۔"

وہ ہکا بکا رہ گئی۔

یقیناً یہ فیصلہ دانیال خان کی مداخلت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ ان کا ہر روپ اس کو حیران کر دینے کے لیے تھا۔ وہ مہربان آقا تھے۔ شفیق القلب بھائی تھے فرماں بردار اولاد تھے۔ سخت مزاج باس تھے۔

لیکن ان سب سے اوپر ایک بہت اچھے دوست تھے۔

لیکن ان میں سے ان کا اصلی روپ کون سا تھا۔ شاید اس کو کبھی پتا چل سکے۔

وہ اچانک کسی بات پر خوش ہو گئے تھے۔ اس کے دیئے ہوئے بیانات میں سے جانے کون سا ٹھیک ان کے اندر جا گزیں ہوا تھا۔ کیوں ایسی بے ساختہ ہنسی سے وہ اس سے چند قدم دور ہو گئے۔

"آپ زندگی میں پہلی مرتبہ از خود میرے کمرے میں تشریف لائی ہیں۔ فرمائیے آپ کی خاطر کیسے کی جائے؟" وہ سکون سے مہمان داری کے اصول نبھانے لگے۔ اس کا منہ ہلکا سا سرخ ہو گیا۔ وہ کچھ بہت اچھے عزائم کے ساتھ تو آئی نہیں تھی۔

"نہیں بہت تھک گیا تھا اور ٹی بریک کے لیے کوئی بہانہ ہی تلاش کر رہا تھا۔ ذرا تکلیف کر کے بیل دبا دیجیے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ لیکن میں چائے پینا نہیں چاہتی۔" اس نے واپسی کے ارادے سے قدم اٹھائے ہی تھے کہ ان کی تیز آواز نے اس کو وہیں ساکن کر دیا۔

"ٹھہر جائیے۔ آپ جو بات کرنے آئی ہیں وہ کیے بغیر کہیں نہیں جائیں گی۔ بیل بجائیے اور اس کرسی پر تشریف رکھیے۔" کوئلوں کی دہکتی اونچی اونچی آگ کے شعلے اس کی حدت سے دہکتے رخساروں پر جھلکنے لگے۔

وہ پچھتاتے ہوئے معمول کی طرح ان کی پیش کردہ کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

وہ بزدل اور ڈرپوک نہیں تھی لیکن معلوم نہیں دانیال خان کے اس بھٹ میں کیا جادوگری تھی کہ وہ ہتھیار چھوڑ کر بیٹھ جاتی۔ وہ ان کا حکم ماننا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کو بلا چون و چرا تسلیم کرنا پڑتا۔

وہ حکم منوانے کے عادی تھے اور بات منوانے کے بعد ان کے چہرے پر کوئی فاتحانہ رنگ بھی نہ آتا تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ سے ایسے ہی کرتے رہنے کے عادی تھے۔

وہ ان کے احکامات کی بجا آوری کی عادی نہیں تھی لیکن عاجز تھی۔

وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ستم توڑنے کے لیے اپنے آپ کو ان کے ایک اور ٹارگٹ کے طور پر پیش

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کردے۔

"میں جربات کہنے آئی ہوں۔ بھول گئی ہوں۔" اس نے احمقانہ لاپروائی سے آگ کی طرف دیکھتے اپنا رخ بدلا۔ اور اس طرح خود کو ان نظروں سے محفوظ کرنے لگی۔ جو آگ سے گرم اور بارش کی پھوار سے نرم تھیں۔

"میں یاد کرادوں گا۔" انہوں نے چراغ کے جن کی طرح حاضر ہونے والے شخص کو پشتو میں شام کی چائے کی ہدایات دیں۔

"ہم بیبے کو بھی بلالیں۔" اس نے اپنی بزدلی کو پردوں میں چھپایا۔

"میرا مطلب...!!" اس نے ان کے ابرو اٹھا کر گھورنے پر وضاحت کی۔ "اگر چائے میں کوئی خاص اہتمام ہے۔"

"اب آپ فرمایئے کہ قیمت خان کے بارے میں کیا کہہ کر تعول جانا چاہتی ہیں۔"

اس نے تھوک حلق سے نگلا۔ "وہ یری ہی کے سلسلے میں۔ اب اگر اس نے۔ انہوں نے۔" وہ اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کا مزا لیتے رہے جیسے ان کے سامنے اسکرین پر کوئی نہایت دلچسپ منظر دکھایا جا رہا ہو۔

"بات یہ ہے بی بی۔ وہ جھوٹ بولنے والے لوگ اور ہی ہوتے ہیں۔ جب وہ بولتے ہیں تو ان کی زبان نہیں لڑکھڑاتی۔ رنگ زرد نہیں پڑتا اور اس طرح وہ پکڑے نہیں جاتے۔ تم آن۔ بھروسہ رکھو اور سچ بولو۔"

کیا واقعی وہ بھروسہ کرلے اور سچ بول دے۔

وہ آخر کیا سوچ کر یہاں تک آگئی تھی۔ کیا چیتے کے مکان میں اس آدمی نے اس کی ذات پر اتنا بڑا اعتماد اس لیے کیا تھا کہ وہ پرنچے اڑا کر اسے کسی اذیت میں مبتلا کردے۔ یا اس کا راز رکھے۔ اور دانیال خان کو کسی مصیبت میں پھنسا ڈالے۔

"جلد بازی کی کوئی بات نہیں ہے۔ جب بھی تمہیں میرا اعتبار آجائے۔ اطمینان سے سوچ لو اور بتا دو۔" انہوں نے کشمکش میں الجھے اس کے چہرے سے مسائل سلجھانے کے لیے وافر وقت دیا تھا۔

وہ سوچ تو نہیں رہی تھی لیکن چپکی ہو گئی تھی۔ دانیال خان نے اسی وقفے میں لوہے کی سلاخ سے انگاروں کو کرید کر آگ تیز کی۔ اس کی پشت کو بہت سارے کشن سے سہارا دیا۔ چھوٹا سا پیروں پر ڈالنے والا کمبل اس کے حوالے کرکے وہ اس کے لیے چائے بنانے لگے۔

یہ عجیب بات ہے۔ وہ یہاں خدمت کی غرض سے بلائی گئی تھی۔ اور وہ موقع محل سے اس کو جتانا بھی کبھی نہیں بھولتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ اس کی خدمت اور خاطر مدارات اس کو ان ہی کی طرف سے ملتی تھی۔

پیالی میں چمچ چلا کر انہوں نے بڑی عزت سے اس کے سامنے ایک نچلی تپائی پر رکھی۔ پھر جیسے وہ ڈرامائی سا وقفہ بھی ختم ہو گیا۔

"جناب۔" وہ اس کے نزدیک، زمین پر پڑے کشن پر آرام دہ حالت میں بیٹھتے ہوئے بولے۔ "فرمایئے۔" وہ ایزی چیئر پر بہت سارے کشنوں کے سہارے کمبل گھٹنوں پر ڈالے سکون سے بیٹھی تھی۔

اسے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ اس کے قدموں کے بہت نزدیک تھے لیکن بے دھیانی میں یا شاید آرام کی غرض سے وہ اپنی کسی بھی پسندیدہ جگہ پر جا بیٹھتے تھے۔ یوں جیسے کوئی بت خانے کا ماننے والا دیوی کے چرنوں میں۔

وہ آہستگی سے کھسک کر نیچے اتر آئی۔

گو اس طرح عجلت سے اترنے میں ان کے درمیان کا وہ تھوڑا سا فاصلہ بھی برائے نام ہی رہ گیا لیکن احترام اس کے اپنے ہاتھوں خوفناک غلطی ہوگئی۔ اب وہ اتنے نزدیک ضرور تھے کہ اس کے ہاتھوں میں لرزش کے سبب پرچ پیالی کی کھنک سن سکیں۔ اس کی اڑتی رنگت بغور دیکھ سکیں۔ اور بے تحاشا دھڑکتے دل کی ناہموار سی آوازیں صاف صاف محسوس کرسکیں۔

اور ان کے ذہن رسا سے کچھ بعید نہیں۔ وہ اڑتی چڑیا کے پر گن لینے کے عادی ہیں۔

انہوں نے پیالی بغیر گھونٹ بھرے ایک طرف دھر دی۔ وہ بالکل سنجیدہ تھے۔

"قیمت خان اس بستی کا سب سے بڑا خیر خواہ ہے بیٹا۔ وہ محبت کرنے والا آدمی ہے۔ وہ بھی مجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتا۔ تمہاری طرح۔ ہاں میں کہوں گا تمہاری طرح۔ تم نے کتنی دفعہ میری زندگی بچائی ہے بیٹا۔ میں اس کے لیے تمہارا اور بھی احسان مند ہو گیا ہوں۔ تم دونوں ایک جیسے ہو۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ ناراض نہیں ہوتا لیکن تم ناراض ہو۔ پتا نہیں کس سے اور کیوں؟" وہ خاموشی سے چائے کے گھونٹ بھرتی رہی۔

"تم قیمت خان سے ناراض ہو؟"

"نہیں۔"

"خان گل سے یا بے بے سے۔؟"

"نہیں۔"

"مجھ سے؟"

وہ چونک سی گئی۔ ان کے لہجے کی معنی خیزی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

"نہیں کسی سے بھی نہیں۔"

"آں ہاں۔ جھوٹ نہیں بولنا۔ میں نے تمہیں سمجھایا ہے۔ جھوٹ بولنا تمہیں راس نہیں آتا۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ واقعی جھوٹ اسے راس نہیں آتا۔ اور سچ سنانا اس کے بس سے باہر تھا۔ کتنی دیر وہ خاموشی سے چائے کے گھونٹ بھرتی ایک تواتر سے اپنے اوپر گرتی ان نظروں کو ٹالتی رہی۔

"شاید بستی کے معاملے میں تمہیں میری روک ٹوک پسند نہیں آئی۔ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا بیٹا۔ لیکن میں تمہارا نقصان نہیں چاہتا۔ شاید میں زندگی میں تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکوں لیکن نقصانات سے تو محفوظ رکھ سکتا ہوں نا۔ اور قیمت خان کے بارے میں بھی یہی ہے۔ اگر بقول تمہارے وہ مجھے کوئی دکھ دینا چاہتا ہے تو میں جانتا ہوں تم مجھے اس دکھ سے بھی بچاؤ گی۔ بچاؤ گی نا؟"

میں آپ کو کون کون سے دکھوں میں گرانا چاہتی ہوں اور کن کن دکھوں سے بچانا چاہتی ہوں۔ سردار دانیال خان یہ نہ کوئی سمجھ سکے گا نہ میں سمجھا سکوں گی۔

"پتا نہیں۔" اس نے افسوس سے کہا۔ "کیا آپ قیمت خان سے کہہ دیں گے۔ وہ میرے معاملے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دخل نہ دیا کرے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔

"میں تو کہہ ہی دوں گا خاتون۔" وہ طنزاً "پروٹوکول" کے طور پر کھڑے ہوتے ہوئے "لیکن ماننا اور نہ ماننا اس کی ذاتی پسند ناپسند پر منحصر ہے۔ اب تو اس کا حق بن گیا ہے دخل دینا۔ آپ کہیں جا رہی ہیں؟"

"ہاں۔"

"کدھر؟" چند لمحوں کے لیے دانیال خان کے چہرے پر آتی پژمردگی بیلا سے بھی چھپی نہ رہی۔

"خیر۔۔۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔ "یہ بہت عجیب بات ہے۔ بہت دن پہلے ایک دفعہ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ لیکن شاید آپ وعدہ ایفائی کی قائل نہیں۔ یا شاید آپ وعدے بھی بچوں کے بہلاوے کے طور پر کرتی ہیں۔ یا میں آپ کے لیے اتنا اہم نہیں کہ۔ خیر۔۔۔"

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ "آئیے میں آپ کو رخصت کر دوں۔"

وہ چپ چاپ باہر نکل آئی۔ چند سیڑھیاں اتر کر اس نے دیکھا۔ وہ کشادہ دروازہ جیسے ہمیشہ کے لیے اس پر بند ہو گیا تھا۔ لفظوں کا وہ اسم بھول بیٹھی تھی۔ کیا لفظوں کے ان اسرار کو وہ اسی طرح سمجھتی ہے جس طرح وہ دکھائی دیتے ہیں۔ یا نظروں کا دھوکا انسان کے ذہن کو بھی فریب دینے لگتا ہے۔

قیمت خان راشن کے سلسلے میں پشاور گیا ہوا تھا اور کل شام سے پہلے اس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ اور ان دونوں وہ کہاں جانا چاہتی تھی، دانیال خان کو یہ بتانا اس کے بس میں نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اس سے وعدہ کر آئی تھی اور اسے بھولی بھی نہیں تھی۔

بستی کے معمولات میں یہ ایک عجیب و غریب سرا تھا۔ وہ اس کو جتنا سلجھانا چاہتی تھی، ریشمی لچھوں کی طرح الجھ الجھ کر سرے اس کے ہاتھ سے بالکل ہی نکل جاتے تھے۔

اصطبل میں صرف ایک ہی گھوڑی قابل اعتبار تھی۔ گو اس نے بھی ایک دن دھوکے میں اس کو کہاں سے کہاں لا پہنچا تھا۔ پری کو غداری پسند نہیں تھی مگر ستم ظریفی سے وہ محبتوں کے ضمن میں دونوں کی یکساں وفادار تھی۔ اس نے دیکھا آج پھر بیلا بی بی نے قیمت خان کے شہر سے باہر ہونے کا سن کر چونکنے کا مظاہرہ کیا تھا اور بہت جلد ہی نواب خان کو اس نے اپنی پسندیدہ گھوڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔

"آپ کہاں جائیں گی؟" پری جھم کر سامنے آ گئی۔

"چیتے کے گھر پری۔" اس نے سکون سے گھوڑی کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"چیتے کے گھر؟" اس کا رنگ فق ہو گیا۔ "وہاں اور کون ہے بیلا بی بی؟"

"تم بتاؤ پری! وہاں اور کون کون ہے؟" وہ لپک کے پاؤں جما کر گھوڑی پر چڑھ گئی۔

"شاید تم لوگ جانتے ہو لیکن مجھے بتانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ میں تم میں سے نہیں۔ پری، مجھے اس منافقت کی امید نہیں تھی۔"

"نہیں جی۔" وہ زرد رنگت سے دو قدم پیچھے ہٹی۔ "صرف بابا کو پتا ہے جی۔ وہاں قیدی بھی ہے۔ ایسے قیدی اس علاقے میں بہت ہوتے ہیں۔ جو ہمارے علاقے سے جنگل سے لکڑی کاٹتا پکڑا جاتا ہے یا ہمارے علاقے میں کوئی اور واردات کرتا ہے۔ لوگ ان کو پکڑ کر بند کر دیتے ہیں۔ پھر ان کی تلاش میں دشمن چھاپے مارتا ہمارے علاقے میں آتا ہے اور مزید لوگ قیدی بنا دیے جاتے ہیں۔ لیکن بیلا بی بی اس نے

آپ کو پکڑ لیا تو؟ یا یرغمال بنا لیا اپنی رہائی کے عوض۔ میں لوگوں کو خبر کر دوں گی بی بی۔ میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے صلح جو لہجے میں کہا۔ "اگر سورج بادام کی اس شاخ تک آ گیا تو تم لوگوں کو خبر کر دینا لیکن اس سے پہلے میرا انتظار کرنا۔"

گھوڑی کے ٹاپوں نے سخت زمین پر بھی تھوڑی سی دھول اڑائی۔

بیلا کو نرسری میں پڑھی سنڈریلا کی کہانی یاد آ گئی۔ اس کو گاڈ فیری نے کہا تھا جونہی شہر کا گھڑیال بارہ کا گجر بجائے۔ اور وہ ایڑ لگاتی دوڑ گئی۔

یہ عجیب بات تھی کہ راستہ اس سے زیادہ گھوڑی کو ازبر تھا۔ وہ مناسب اور مستقل قدموں سے چلتی آئی اور ویرانے میں کھڑے چونے کے اس سفید گھر کے سامنے گویا دو زانو ہو کر جھک گئی۔ گوریا چڑیا جیسے اس دن سے لگاتار چہک رہی تھی۔ پہاڑی کوا اپنی کرخت آواز میں چلایا۔ اور اس کی پکار ویرانے میں دور تک ٹکرا کر واپس آتی رہی۔

پتا نہیں یہ قدم اس کا ٹھیک تھا یا غلط۔ معلوم نہیں اس کے اس اقدام کو دانیال خان معاف کر دیں گے یا گولی سے اڑا دیں گے۔ ویسے تو وہ گولیاں چلانے اور انسانی جانوں کو درندوں کے حوالے کرنے کے عادی سے ہو گئے ہیں اور وہ خود ہے بھی کیا۔ نہ ان کی ذات کا کوئی حصہ۔ نہ "ہم وطن"، نہ ہم زبان۔

لکڑی کے پرانے دروازے پر دستک کی بازگشت خود اس کے لیے شاید اتنی ہی اجنبی تھی جتنی کہ اندر سننے والے کے لیے۔ محتاط طبع شخص نے دروازہ کھولنے میں کچھ وقت لگایا۔ شاید کوئی درز یا جھری اس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ کہ آنے والے کی نیت کو پہلے سے جانچ لیا جائے۔ لکڑی کا لمبا سا ڈنڈا جو دو کواڑوں کے درمیان حائل تھا اٹھا کر بڑی سہولت سے اس کے اندر آنے کی جگہ بنا دی گئی۔

"یہ پہاڑی کوے بھی جھوٹ نہیں بولتے۔ خانم۔ میں ابھی اس کو ڈانٹ رہا تھا کہ میری منڈیر پر بیٹھ کر مت بولو۔ یہاں کون آتا ہے؟"

"میں آئی ہوں یہاں۔"

"آپ کو تو میں ماضی کا خواب سمجھ کر بھول بیٹھا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے وہ قورمہ پلاؤ، زردہ آج نہیں ملے گا۔"

"ضرور ملے گا۔ کیوں نہیں ملے گا۔ اگر اپنی شادی پر آپ نے مجھے بلایا۔ بہترین حجام ثابت ہو گا۔ فی الحال کافی ہے گزارہ چل جائے گا۔"

"گزارہ تو چل ہی جائے گا۔" وہ اندر آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"لیکن اس کا غم تاحیات رہے گا۔"

"آہ ننھی لڑکی۔ تم اور تمہارے غم۔" وہ مضحکہ خیز ہنسی سے بولا۔ "ہم تو بڑے بڑے غم بھول جاتے ہیں۔ آپ کن ننھے منے غموں کو رو رہی ہیں۔"

"بڑے بڑے غم تو ہم بھی بھول جاتے ہیں۔ البتہ چھوٹے غموں کا پچھتاوا نہیں جاتا۔"

وہ چلتے چلتے ٹھٹھک گیا۔

"میں نے یہاں اس قید تنہائی میں خدا سے صرف ایک دعا مانگی تھی۔ کہ خدایا مجھے صرف ایک ہمدرد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوست چاہیے۔ عورت ہو یا مرد۔ بالغ ہو یا نابالغ۔ عاقل ہو یا پاگل' پتا نہیں کتنی مدت سے خدا سے دور وراز اس سے بدگماں اور ناراض مسلسل ایک ہی تکرار سے ایک ہی دعا مانگتا آیا ہوں۔ لیکن وہ بچپن میں جو سنا تھا قبولیت کی گھڑی کے بارے میں وہ شاید۔ میں تمہاری ذہانت سے خوفزدہ ہوں خانم۔ یہاں ذہانت کا انجام موت ہے۔" اس نے بے ترتیبی سے بات کے سمت سے پہلو بدل ڈالے۔

"آپ کون ہیں' دوست کہ دشمن؟"

اس نے الماری کھول کر کافی کے مگ نکالے۔ پرکولیٹر میں کافی کے موٹے دانے ڈال کر پلگ آن کر دیا۔

"کس کے؟ تمہارے؟" پرکولیٹر کی گڑگڑ میں اس نے آہستگی سے پوچھا تھا۔

"بستی کے؟"

"تمہیں بستی سے کیا علاقہ؟ تم خود بستی کی کیا ہو' دوست کہ دشمن؟"

"میں بستی کی وفادار ہوں۔" وہ کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتی بولی۔

"واہ۔ تمہارا یہ پوز بہت شاندار ہے۔ میں تمہارا مجسمہ بناؤں گا۔"

"آپ مجسمے بھی بنا لیتے ہیں؟"

"بھی سے کیا مراد ہے بی بی؟"

وہ سیاہ کافی مگ میں بھر کر اس کے سامنے لے آیا۔ "افسوس کہ پاؤڈر ملک ختم ہو گیا ہے۔ شام تک آجائے گا۔ تم گزارہ کر لو گی؟ مجھے پتا ہے تم کر لو گی۔ لگتا ہے تم ہر طرح کے حالات میں گزارہ کرنے کی عادی ہو۔" اس نے گھونٹ بھر کر مگ پیچھے رکھ دیا۔

"تم نے دیکھا میں کتنا پھوہڑ ہوں۔ آج قیمت خان کو میری وجہ سے منڈی جانا پڑا۔"

"وہ اپنے قیدیوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔"

"ہاں" اس نے گہرا سانس لیا۔ "کیونکہ قیدیوں کو زندہ رکھنا ان کے مفاد میں ہے۔"

"میں آپ کی بنائی ہوئی چیزیں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور۔ ان کے لیے تمہیں کسی آرٹ گیلری تک نہیں جانا۔ صرف یہ ساتھ کا دروازہ کھولنا ہے۔"

"نہیں آپ کی تصویریں دیکھنے کے لیے تفصیلی وقت نکال کر آؤں گی۔ فی الحال میں پری کو ناراض نہیں کر سکتی۔"

"جنوں پریوں پر بھی اختیار ہے آپ کا؟"

"کیوں نہیں۔ آپ کا نہیں ہے؟"

"پریوں پر تو ہے۔" وہ معنی خیزی سے ہنس پڑا۔ "حالانکہ پریوں نے ہم پر بڑے جادو کیے ہیں۔" وہ اس کے ساتھ باہر آیا اور گھوڑی کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ گھوڑی ہنہنائی اور اگلے پنجوں کو نئے نالی سے زمین پر مارتی رہی۔ اس نے گھوڑی کو تھپکی دی اور پشتو میں کچھ ہدایات دی تھیں۔

وہ غور کرنے کے باوجود صرف اتنا ہی سمجھ پائی۔ وہ گھوڑی کو کہہ رہا تھا۔ یہ زنانہ مہمان میری مہمان ہیں۔ ان کو حفاظت سے پہنچانا ہے۔

سورج اوپر کو جا رہا تھا۔ اور وہ سنڈریلا نہیں تھی۔ اس کے پاؤں میں اس کے اپنے دونوں جوتے تھے لیکن اس کو لگتا تھا وہ اپنا جوتا یہیں کہیں گرا آئی ہے۔ اس کی سوتیلی بہنیں اور ماں اس کی منتظر ہیں گھوڑی

نے ایک دوڑ لگائی اور منزل مقصود پر تھی۔ بحفاظت اور محفوظ۔
شاید بستی کے گھوڑے بھی پشتو سمجھتے تھے۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح اس کے لیے ایک حیران کن خبر لائی۔

سردار دانیال خان منہ اندھیرے ہی بستی سے کہیں چلے گئے تھے۔ اور وہ رخصت کے وقت صرف بے بے سے ہی مل کر گئے تھے۔ اور بے بے ناشتے کی میز پر نوکروں کو ہدایات دے رہی تھیں جو کام سردار کی غیر موجودگی میں ان کو نمٹانے تھے کیونکہ اب ان کی ذمہ داری بڑھ گئی تھی۔ اور وہ سردار کی کچھ عادی سی ہو گئی تھیں۔

سوکھا توسٹ بیلا کے حلق میں اٹک سا گیا۔ اس نے پانی کے بڑے سے گھونٹ سے توالا اتارا اور مری مری آواز میں پوچھا تھا۔

"بے بے۔ وہ کب واپس آئیں گے۔" اور پوچھ کر شرمندہ سی ہو گئی۔ اس کی اپنی آواز اس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔

"ہاں۔" بے بے نے ختہ خان سے دھیان ہٹا کر اس کو دیکھا۔

"کچھ معلوم نہیں جان بیبے۔ اتنی مدت تو وہ کبھی گڑھی نہیں ٹھہرے۔ اب گئے ہیں تو ان کو سال بھی لگ سکتے ہیں اور مہینے بھی۔"

روشن روشن ڈائننگ ہال اس کی نظروں میں آہستہ آہستہ دھندلا گیا۔ اس نے میز کے کنارے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ایک لمبا اور گہرا سانس لیا۔

"تم اپنے کام مکمل کر لینا بیلا۔ وہ کبھی بھی آجاتے ہیں۔ اچانک اور ادھورے کاموں پر بہت ناراض ہوتے ہیں۔"

"لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اس مرتبہ وہ لمبے عرصے کے لیے باہر نہیں رہیں گے۔" بے بے لاپروائی سے اپنے فقرے ادھر ادھر پھینک رہی تھیں۔

"شعبان' رمضان" وہ انگلیوں پر گنتے بولیں۔

"عید وہ ہمیشہ گڑھی میں گزارتے ہیں۔ رمضان شریف اب دور نہیں۔ شعبان' پھر رمضان۔ شوال۔ ایک مرتبہ تو وہ امریکہ کے دور دراز شہر سے عید کرنے وطن آئے تھے۔"

بے بے کو سابقہ عیدوں کی یاد نے ہنسا دیا۔

"ساری دنیا ان کا مذاق کر رہی تھی کہ دنیا جہاں کی آسائشیں چھوڑ کر یہ تہ خانے میں عید منانے آئے ہیں۔"

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے الجھتی سی رہی۔ بے بے کا اطمینان ہر مشکل چیز کے مقابل قابل رشک ہوتا ہے۔ شاید ان کا یہی مثبت طرز فکر ان کو دنیا کی بیشتر بوڑھیوں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ کسی طرف سے ناامید نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ ڈیڑھ دو ماہ کی۔ کسی ایسے شخص سے طویل جدائی بھی ان کے لیے یاس انگیز نہیں۔ وہ پر امید ہیں۔

وہ عید پر آئیں گے۔

اور عید کے ساتھ گزرے دن اور گزری رونقیں یہ اور کیا معلوم اس طرح ان کی گزری زندگی کے اچھے باب پھر سے پلٹ جاتے ہوں۔ وہ مسکرائے جا رہی تھیں۔ جیسے کوئی کتاب آپ کو از بر ہو۔ اور آپ اپنے پسندیدہ حصے والے صفحے پلٹ کر بار بار پڑھ لیں۔ یا کسی اچھی کیسٹ کا اچھا سا مصرعہ مسلسل دہرا کر لطف لیتے رہیں۔

واہ بی بی جی۔ تم سے اچھی تو یہ بوڑھی خاتون ہی رہیں۔ جنہوں نے انسان اور اس کی سوشل لائف پر موٹی موٹی کتابیں نہیں پڑھیں لیکن زندگی کو گزارنے کا سلیقہ تم سے بہتر ہی آتا ہے۔

کوئی قیامت نہیں آئی۔ اس نے کھانے کی میز سے اٹھ کر فیصلہ کیا۔ صرف ایک شخص درمیان سے چلا گیا ہے بس حالانکہ وہ جہاں گیا ہے' وہاں بہت خوش ہو گا۔ تبھی تو وہ یہاں سے غیر معینہ مدت کے لیے چلا گیا ہے اور ایسی کوئی بات بھی نہیں کہ اس کی کمپنی بہت خوشگوار تھی۔ وہ جہاں بیٹھتا تھا لطیفوں کی بھرمار ہو جاتی۔ یا وہ آپ کا ہمدرد اور مہربان تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں تھا صرف اس کی تند خوئی کی عادت سی ہو گئی تھی اور عادتیں جیسے پڑتی ہیں ویسے چھوٹ بھی جاتی ہیں۔ اس نے دیوار پر آویزاں سنہری کلاک کے ڈائل پر ایک نظر گھمائی۔

اسکول کا وقت ہو گیا تھا۔ بچے صبح ہی بستروں سے اٹھ کر اوندھے سیدھے بھاگتے اسکول پہنچتے ہیں۔ یہ اسکول سے زیادہ ایک ذاتی سا ٹیوشن سینٹر کیونکہ اس کے ایک ہی کمرے میں پہلی سے پانچویں تک کے بھی بچے پڑھتے تھے۔ وہ باری باری سب کا سلیبس چیک کر کے تیاری کروائی جاتی۔

اس نے باوجود اصرار کے گڑھی عیسیٰ خان کے مالکن کا کوئی احسان نہیں لیا۔ اسکول چلانے کے لیے ادھر اُدھر سے بہتیری مدد مل گئی تھی۔

بچے خود ہی اسکول کی صفائی کرتے۔ پری کہیں سے پنسلیں اور چاک وغیرہ یار کر کے لائی تھی۔ بلکہ کچھ رنگ اور برش بھی تھے جو اس نے اپنے باپ کے سامان سے مانگ کر بچوں کے لیے نکالے تھے۔ قیمت خان جیسا خونخوار آدمی اور خونخوار نام والا آدمی۔ بھلا اس کا آرٹ سے کیا واسطہ' مطلب یہ کچھ سمجھنے کی اس کو ضرورت نہیں تھی۔ یہ آم ہے۔ وہ آم کی تصویر بناتی اور اپنے کام سے کام رکھتی۔

بلجیم کی پارٹی جب سے کامیاب لوٹی تھی اس کے سر سے نالائقی کا مستقل لیبل تو اتر گیا تھا لیکن بے بے اس کو سہانے سے باز نہیں آتی تھیں۔ وہ اس کو روزانہ ہی کہہ دیتیں۔ "دیکھنا دانیال خان کسی بھی دن اچانک آ پہنچیں گے کوئی کام ادھورا نہ رہ جائے۔" یا شاید یہ ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ اچانک پہنچے حالانکہ ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔

وہ صبح صبح اٹھ کر کہاں روانہ ہوئے تھے۔ یہ ان کے ذاتی ملازم کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا اور اس غریب کے پاس بھی اتنی خبر تھی کہ وہ گڑھی سے باہر کسی کام سے کچھ مدت کے لیے جا رہے ہیں۔

بے بے بے چاری 'ممتا کی ماری دانیال خان کی اس "صریحاً" بدتمیزی کو بھی ان کی طبیعت کا ایک حصہ سمجھ کر مخطوظ ہوتی رہتیں کہ وہ جب سے گئے تھے' ان کی کوئی خبر نہیں پہنچی تھی۔ کبھی کبھی قیمت خان بے بے سے تشویش سے آکر دریافت کر لیتا۔ کبھی بے بے اس کو بلا کر باز پرس کر لیتیں۔ وہ ان دونوں کی بے بسی پر دل ہی دل میں ہنستی خاموشی سے غور کرتی رہتی تھی۔

پھر جب وہ بچوں کو اسکیچ کے کام میں الجھا دیتی تو اس کا ذہن اس کی اپنی گتھیاں الجھانے لگتا۔ واقعی اس

کی بلا سے وہ کہیں بھی ہوں۔ کیسے بھی ہوں۔ اس کا کام اس گھر کے چیدہ چیدہ حصوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ سو وہ کر رہی ہے جب تک وہ مقیم ہے اور جب تک اس کی یہاں ضرورت ہے۔ اور جب یہ ضرورت ختم ہو جائے گی تو خدا کی بنائی ہوئی یہ دنیا اتنی چھوٹی بھی نہیں کہ اس کے رہنے کے سب ٹھکانے ختم ہو جائیں۔ وہ کہیں بھی چلی جائے گی۔

لیکن شاید وہ زیادہ دن باہر نہ گزار سکیں۔ شاید وہ جلد واپس آ جائیں حالانکہ اس یقین کے لیے اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن وہ اتنی خوبصورت گڑھی اس پہ بچھے ہوئے سرخ بالٹے کے رنگ کا آسمان چھوڑ کر کتنی دیر اور کتنی دور رہ سکتے ہیں۔ وہ فارغ وقت میں آبشار کے کنارے خاموش بیٹھی پتھروں کو پانی میں لڑھکا کر پانی کا راستہ بدلنے کی کوشش کرتی۔

"بابا گاؤں جا رہا ہے۔" پری لاتعلقی سے اس کو خبر دیتی حالانکہ وہ خوب جانتی تھی بابا کے گاؤں جانے سے بیلا بی بی کو کتنی شدید دلچسپی تھی۔ اور شاید اس کے باپ کی صرف اس ایک خبر سے بیلا بی بی کو دلچسپی رہی تھی۔ وہ کب جا رہا ہے۔ وہ کب آئے گا۔

"اچھا۔" اس نے کہرے سے مری ہوئی خشک گھاس کا لمبا تنکا دانتوں میں دبا لیا۔

"وہ مالک کی خبر لینے جا رہے ہیں۔"

بیلا لمحہ بھر کو چونک گئی۔ اردو کا یہ بے ضرر سا محاورہ اس کے ہاں کسی اور طرح سے استعمال ہوتا تھا۔

"دراصل سردار نے گڑھی سے جا کر کسی کو خیریت کی خبر بھی نہیں بھیجی۔ اور قدم قدم پر ان کے اتنے دشمن ہیں جو ان کو قتل کرنے کے درپے ہیں۔ ہمیں ہر وقت ان کی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لیے بے بے بھی پریشان ہیں۔ بابا نے سوچا ہے وہ جا کر ان کی خیریت لائیں۔"

"اچھا۔" وہ چپ سی ہو گئی۔ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے لیے پریشان ہونے والے' آنسو بہانے والے اور جاگ جاگ کر وقت کاٹنے والے ایک دو نہیں کئی ہوتے ہیں۔ اور دانیال خان کی خوش قسمتی پر تو اس کو کبھی کوئی شک ہوا ہی نہیں تھا۔

پتا نہیں کیوں اچانک اس کو ایسے بہت لوگ یاد آئے جو اتنے خوش قسمت نہیں تھے۔ جن کے لیے کوئی پریشان نہیں ہوتا کوئی جاگ کر دعا نہیں کرتا۔ جن کا کسی کو انتظار نہیں رہتا۔

یہ وہ خود ہوتے ہیں جو مجسم پریشان اور سراپا انتظار ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں میں اس کو دوست قیدی بھی یاد آیا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے ہم ہمیشہ ان لوگوں سے شکوہ کناں رہتے ہیں جو ہماری ضرورت ہیں۔ ہم نے کبھی نہیں سوچا جن کی ضرورت ہم بن چکے ہیں ان پر کیا گزرتی ہو گی۔

"پری!" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔ "کیوں نا میں اس قیدی سے مل آؤں۔ پھر تو شاید اگلے ماہ سے پہلے تمہارے بابا گاؤں سے نہیں جائیں گے۔ کیونکہ وہ راشن وغیرہ تو لے آئے ہیں۔"

"یہ آپ ٹھیک نہیں کرتیں بیلا بی بی۔" اس نے رسمی سی نصیحت کی تھی۔ وہ جانتی تھی مالکوں کی یہ مہمان مالکوں کی طرح ضدی اور اڑیل ہے۔ اسے بھی اپنی جان کی پروا نہیں۔ اسے بھی اپنے ارادوں کے سامنے مر جانے سے ڈر نہیں لگتا۔

لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ خود بھی ویسی ہی تھی۔ وفادار۔ مخلص۔ کسی کی محبت میں بے دریغ سولی چڑھ جانے والی حالانکہ یہ اس سے بھی پوشیدہ نہیں تھا کہ جس دن بھی اس کا باپ قیدی اور بیلا کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

در میان اس رابطے سے آگاہ ہوا۔ ان دونوں کے سوا اس کو بھی کوئی کا نشانہ بننا ہوگا۔

"گھوڑی تیار ہے۔" وہ لگام سے کھینچتی گھوڑی کو اس کے سامنے لا کر چھوڑتی جیسے ہیروئن کو کسی مظلوم کردار کے قدموں میں لا کر پٹختا ہے۔ "اور یہ آپ کی کتابوں کا پیکٹ بھی۔"

"اپنا خیال رکھیں بی بی۔ اس میں بھاڑا پھوٹ جانے کا بڑا ڈر ہے۔" وہ دھول اڑاتی اس کی نظروں سے غائب ہوئی تو وہ اپنے باپ کی بخشی ہوئی سیٹ پر بیٹھ کر گڑھی کی حفاظت کرنے لگی۔

دس پندرہ منٹ کا یہ راستہ۔ اور گھنٹہ ڈیڑھ کی یہ چوکیداری کسی دن اس سے بہت بڑی قیمت لے گی۔ وہ جانتی تھی لیکن بیلا کے لیے وہ اس سے بڑی قیمت چکانے کے لیے تیار تھی کہ وہ اس کی زیر احسان تھی اور پٹھان احسانوں کا بدلہ چکانے کے لیے جان دینے میں سعادت محسوس کرتے ہیں۔ اس نے پٹھانوں کے پرانے قول دہرا کر اس کی عزت اور حفاظت کی قسم کھائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کے بڑے دنوں میں آئیں۔" قیدی کے لہجے میں شکوہ تھا یا شدت۔

وہ شرمسار ہو گئی۔ واقعی وہ کوشش کرتی تھی جلدی جلدی آئے۔ لیکن یہ اس کے علاقے کی زمین تو تھی نہیں۔ وہ خود اس قیدی سے زیادہ با اختیار تھی نہ با اثر۔

"دیکھو میں نے تمہارے لیے ایسی شاندار کافی منگوائی ہے۔ گھونٹ بھرو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔"

وہ چوکڑی مار کر اس کے آرام دہ صوفے پر بیٹھی اس کی اسپیشل روسٹڈ کافی کے گھونٹ بھرتی افسوس کرتی رہی۔ واقعی ہم کیوں اپنے آپ کو کسی کی ضرورت بنا ڈالتے ہیں۔ جو سزا ہم سے برداشت نہیں ہوتی وہ ہم دوسروں کو جھیلنے کے لیے کیوں دے ڈالتے ہیں۔ وہ اس کے لیے کیا کر سکتی ہے۔ اگر آزادی کی فضا میں اس کو چند سانسوں کی مراعات نہیں دے سکتی۔

"کیا بات ہے؟ دوست۔"

(دوست کا لفظ تو اس کے لیے گالی سا بن گیا ہے۔ دوست اور دوستی کے لیے اس نے کیا ہی کیا ہے۔؟)

"جناب اگر میں یہاں آ جاتی نا تو قیمت خان آپ کو اور مجھے گولی سے اڑا دیتا۔" اس نے بے فکری سے اپنے فقرے ادا کر کے ماحول کے کھنچاؤ کو کچھ کم کرنا چاہا۔ وہ اتنی دور سے اور اتنی مشکل سے اس کو پریشان کرنے تو نہیں آتی نا۔ کیا ہے اگر کچھ دیر کے لیے وہ اپنے دکھ بھلا ہی دے۔ اس کی بلا سے وہ دانیال خان یا گڑھی کا کتنا ہی بڑا دشمن کیوں نہ ہو یہ۔

"اول تو میں اتنا خوش قسمت نہیں کہ تمہارے ساتھ گولی سے اڑایا جاؤں۔" وہ انگلیوں پر گننے لگا۔

"نمبر دو۔ میں تو تم سے یونہی پوچھ رہا تھا۔ بر سبیل تذکرہ۔ کہ وجہ اداسی کیا ہے۔ پریشان کیوں ہو وغیرہ۔" کافی اس کے ہاتھ سے چھلک گئی اس نے سوچا بھی نہیں کہ وہ اتنی اداس نظر آنے لگی ہے کہ اداسی کے پوسٹر اس کے چہرے پر چسپ گئے ہیں۔ اب ہر شخص بر سر عام اس کے چہرے سے افسردگی اور اداسی کے رنگ پڑھ ڈالتا ہے۔

وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ پتا نہیں قیدی کیا سمجھتا ہو۔

کیونکہ وہ بڑی خاموشی سے اس کے کپکپاتے ہاتھوں کی لرزش پر غور کر رہا۔ جیسے وہ لفظوں کے اٹکنے سے اور ہاتھوں کی اعصابی سی گھبراہٹ سے کوئی مطلب نکالتا ہو۔

"میں تم سے شکایت نہیں کرتا۔ تم جب بھی آ جاؤ۔ جتنی دیر کے لیے آ جاؤ۔ مجھے خوشی ہوتی ہے۔ میرا یہ بے نصیب سا گھر جگمگا اٹھتا ہے۔ اور ہاں اس بات کو یاد رکھنا میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم پر کوئی حرف آئے۔ کیونکہ تمہاری حفاظت میری ذمہ داری ہے۔"

وہ حیرت زدہ سی اسے دیکھتی رہی۔ یہ کیسا عجیب۔ بے ریا اور مخلص سا شخص ہے۔ جو اپنے اوپر خود بخود چند ذمے داریاں عائد کر لیتا ہے۔ حالانکہ اس پر کسی حساب کسی رشتے ناتے سے اس کی حفاظت کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی لیکن شاید ایک میری دوستی کے ناتے اس نے خود ہی اس کو اپنا فرض جان لیا ہے۔ حالانکہ وہ خود جانتا ہے وہ کتنا بے بس ہے۔ ایسا شخص جو خود اپنی زندگی کے لیے دوسروں کی حفاظت کے رحم و کرم پر ہو وہ بھلا کسی کی حفاظت کا کیا بیڑا اٹھا سکتا ہے۔

"چلو یہ اداسی چھوڑ دو۔" اس نے اس کو جیسے مسلسل کشمکش سے آزاد کرایا۔

"اور خوش ہو جاؤ۔" اس نے نازک سی قہوہ دانی سے سیاہ رنگ کی سیال کافی اس کے مگ میں قدرے اوپر سے انڈیلی۔

"میں تمہیں قدرے یقین دلاتا ہوں۔ تم جس بات پر اداس ہو۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ وہ خود ساختہ ہے۔ کافی میں دودھ ڈالوں؟"

"ایں" وہ اس کی دیوانگی سے لبریز آنکھوں میں ٹھہری ہلکی سی شرارت حیرت سے دیکھتی رہی۔

"کیا مطلب؟"

"دیکھو تم عقلمند لڑکی ہو۔" وہ اس کے نزدیک پڑے قالین پر دو زانو بیٹھتا ہوا بولا۔

"تمہیں کوئی بات براہ راست۔ صاف صاف اور کھل کر کہنا تمہاری ذہانت کی توہین ہے۔ اور میری لیاقت کی بھی۔" اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں۔ حالانکہ اس نے اپنا چہرہ سنجیدہ رکھنے کی پوری کوشش کر رکھی تھی۔

آنکھوں کے یہ رنگ۔ یہ سوچتی مسکراتی آنکھیں کتنی اچھی، کتنی مانوس لگتی ہیں۔ ان سے اپنائیت کی جو کرنیں پھوٹتی ہیں۔ ان سے مقدس اور نایاب کیا شے ہو سکتی ہے۔ یہ اس کا سب سے قیمتی اثاثہ ہیں۔ سب سے مہنگا سرمایہ ہیں کہ دوستی اور خلوص سے بڑی نعمت کہاں مل سکتی ہے۔

محبت کرنے والے سچے دوست سے قیمتی شے اور کیا ہو سکتی ہے۔

"ایک بات پوچھوں۔"

"ضرور" وہ دوبارہ موضوع کی نوعیت بیلا کے چہرے پر دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔

"آپ یہاں سے بھاگ سکتے ہیں۔ تو بھاگ کیوں نہیں جاتے۔"

"آپ کو کیسے خیال آیا۔ میں یہاں سے بھاگ سکتا ہوں۔"

"آپ قید تو نہیں ہیں۔"

"قید ہونے کے لیے پیروں میں بیڑیاں ہونا ضروری تو نہیں۔"

"بیڑیاں نہ ہوں تو انسان بھاگ سکتا ہے۔"

"کس طرف۔ انسان بھاگ کر جائے بھی تو کس طرف۔ اگر سب راستے ادھر ہی آتے ہوں۔ دیکھیں اگر آپ اپنے پالتو جانور کے گلے سے پٹا اتار کر اس کو کہیں دور چھوڑ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ تو وہ کہاں جائے گا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آپ پیالتو نہیں ہیں۔"

"کیا جانور تو ہوں۔؟" اس کا دیوانہ وار قہقہہ جنگل کو ہلا گیا۔

"کیا کسی دن یہ لوگ آپ کو قتل کر دیں گے۔"

"کہہ نہیں سکتا۔ مجھی دوست۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میرا قتل ہو جانا یا زندہ رہنا ان کے مفاد میں نہیں ہے۔"

"اگر آپ ان کے خیال میں اتنے ہی بے ضرر ہیں تو وہ آپ کو قید میں کیوں رکھے ہوئے ہیں۔"

"ہاں میرا قید سے باہر آجانا بڑا خطرناک ہے۔ میرے سر پر خون سوار ہے۔ موقع ملتے ہی میں بہت سے قتل کروں گا۔ وہ مجھ پر واجب ہیں۔"

وہ سہم سی گئی۔ "وہ کس۔ کس کے قتل؟"

وہ بولی تو اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ وہ اس کے ہکلانے پر ایک اور قہقہہ لگا اٹھا۔ زندہ اور جاندار۔

"چلو۔ تمہیں اتنی رعایت دیتا ہوں۔ کہ سردار دانیال خان کے قتل کا ارادہ واپس لیتا ہوں۔"

اس نے پرانے بادشاہوں کی طرح شان سے جیسے پھانسی کے مجرم کو معاف کر دیا۔

"جی۔" وہ سکون سے بیٹھی اچھل پڑی۔

"میرے کہنے سے۔ میں۔ کیا مطلب؟ بھلا اس میں میرا کیا دخل ہے۔"

"بری بات۔ دوستوں سے چھپانا اچھا نہیں ہوتا۔ دوستوں سے کچھ چھپتا بھی نہیں ہے۔ جو آپ کو اوپر سے جانتے ہیں وہ اندر سے بھی جان لیتے ہیں۔ شرط صرف اتنی ہوتی ہے کہ وہ جاننا چاہیں۔"

"آپ غلط بات کر رہے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں میں یہاں نہ آؤں۔"

وہ گڑبڑا کر چپ ہو گئی۔ وہ بات کو اتنے شدومد سے گھسیٹ کر دور نہیں لے جاسکتی تھی۔ شاید اس میں اتنی جرات ہی نہیں رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اس کی بات کو جھٹلا سکے۔ اس کے دعوے کو رد کر سکے۔ وہ جو اس کا کچھ نہیں تھا اور بیٹھے بیٹھے اس کے بارے میں فتوے صادر کرتا تھا۔

"تم جانتی ہو۔ میں چاہتا ہوں تم یہاں آؤ۔ یہ بار بار دہرانے کی اور یقین دلانے کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔" وہ خوشدلی سے ہنستا ہوا بولا تھا۔

"بالکل اسی طرح تمہیں سردار کے بارے میں یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ یہ بھی اس کی ایک ادا ہے۔ وہ جہاں گیا ہے لوٹ کر یہیں آئے گا۔ وہ کہیں نہیں جاسکتا۔ جب تک تم اس چھت کے نیچے موجود ہو۔"

"میں چلتی ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سوری۔ میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں تو تمہاری پریشانی دور کر رہا تھا۔ تم یہاں آتی تھیں۔ ہنستی مسکراتی تازہ دم اور ہشاش بشاش چہرے لیے۔ آج جب میں نے تمہارے لیے دروازہ کھولا تو تمہارے کشادہ پیشانی پر ساری کہانی لکھی تھی۔ مجھ سے جھوٹ نہیں بولا گیا۔"

"آپ آج بہت عجیب باتیں کر رہے ہیں۔"

"ہاں شاید کر ہی رہا ہوں۔ تنہائی نے میرے اندر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے بہت سی باتیں جان لیتا ہوں۔ بہت سارے واقعات میری آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگتے ہیں۔ شاید اس لیے بھی" اس نے درختوں کی اونچی چوٹی کے ذرا نیچے کہیں اور دیکھتے کہا۔

"اس لیے بھی۔ کہ اس راستے کے سارے مسافر ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ میں تمہیں پہچان لیتا ہوں۔ تم نے ابھی مجھے دریافت نہیں کیا۔ خیر چھوڑو۔ میں سارے دعوے۔ سارے ثبوت اور تمام الزامات واپس لیتا ہوں۔"

یہ کوئی جن تھا کہ یا پری کے بقول واقعی کوئی مجذوب تھا۔

یا زندگی کے انمول تجربوں سے گزر کر بے وحشی انسان کے اندر کو سکتا تھا۔ بہر کیف یہ کندن جیسے تجربے زندگی کا نچوڑ بھی ہو سکتے ہیں جب آپ نے عمر کا کچھ حصہ تیاگ دیا ہو۔ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پتا نہیں یہ بے نام سی اداس واقعی اس پر طاری تھی یا دیوانے کی عجیب و غریب باتوں نے اس کو چونکا سا دیا تھا۔

"میں نے جو باتیں تم سے کی ہیں ان پر یقین رکھنا۔ خوش رہنا۔ کتابوں کے لیے بے حد شکریہ۔"

"کون سی باتیں۔" وہ حیرت سے پلٹی۔ لمحوں میں اس کا چہرہ رنگا بھی گیا۔ باوجود کوشش کے وہ اپنے چہرے سے کچھ بھی کھرچ نہیں سکی۔ حالانکہ یہی وہ وقت تھا جب وہ اس کے دعوے کی نفی کر سکتی تھی۔ وہ شرمندگی سے کھڑی رہ گئی۔

"یہ کتابیں میری نہیں۔ میرا مطلب ہے مجھے واپس کرنی ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ آپ کے اگلے ٹرپ سے پہلے میں انہیں پڑھ ڈالوں گا۔ اور کوشش کروں گا کہ آج رات ہی پڑھ ڈالوں۔ تاکہ میرے شگون کے مطابق کل ہی آپ کا ٹرپ ہو۔"

وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

☆ ☆ ☆

یہ عجیب و غریب تغیر اس میں اچانک نہیں آیا تھا۔ شاید کسی شخص نے ٹوٹ کر احساس دلا دیا تھا۔ اور وہ مایوسی کی شدت میں ڈوب سی گئی تھی۔ بے ایک نظر اس پر ڈال کر بینائی کی طرف متوجہ ہو جاتیں۔ وہ ان لوگوں کے چلے جانے سے اتنی بیکار، اتنی فارغ ہو گئی تھیں کہ دھڑا دھڑ بنائی کر کے ڈال رہی تھیں۔ ایک لمبا سا اسٹول تو انہوں نے میلا کے لیے بن بھی ڈالا تھا۔

دھوپ کیسے اترتی ہے؟

سورج آسمان پر کیسے چمکتا ہے۔ رات کیسے اتر جاتی ہے۔

بادل۔ بارش۔ برسات۔ جیسے دنیا اس کو ہر چیز سے بیگانہ کر رہی تھی۔

کیا کبھی کسی ایک شخص کے چلے جانے سے زندگی اتنی خالی خالی بھی لگ سکتی ہے۔

یا شاید۔

یہ ایک شخص کے جانے کی وجہ سے نہیں۔ وہ ایک گہرا سانس کھینچتی۔

"کتنی خاموشی ہو گئی ہے۔ یہ"

"ہاں۔ دانیال خان کے دم سے ماشاءاللہ رونق رہتی ہے۔ لیکن وہ یہاں تو آتے ہی مہمانوں کی طرح ہیں۔" انہوں نے لاپرواہی میں اڑایا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

واقعی۔

یہ تو اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اور یہ بے نام سی اداسی دراصل اتنے بہت سے لوگوں کے چلے جانے کی وجہ سے ہی تھی۔ ورنہ کوئی ایک آدمی اس کے لیے کبھی اتنا اہم نہیں ہو سکتا تھا۔

"خان گل کو بلوالیں بے بے۔ کچھ تو رونق ہوگی۔"

"وہ تو بہت مصروف ہے۔ مشکل سے ہی کام پر راضی ہوتا ہے وہ۔ اب کرنے دو کوئی کام ٹِک کر اسے۔"

"اچھا تو خان گل صاحب کام کر رہے ہیں۔" بڑی مدت بعد کسی خبر نے اس کو ہنسا ڈالا۔ "کام کرتے وقت وہ مسخرہ پن چھوڑ دیتا ہوگا کیا۔"

"اور سرجن نثار۔"

"وہ بھلے آدمی ہیں لیکن وہ چھٹی کیسے لیں گے۔"

"اور شیریں اس کو چھٹی مل سکتی ہے۔"

"اس کے تو سنا تھا کوئی امتحان وغیرہ ہیں۔"

"بے بے۔ دانیال خان کی کوئی خبر نہیں آئی۔"

کتنی دیر سے قابو کی گئی زبان بے لگام سی ہو گئی۔ حالانکہ اس نے خود کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ وہ دانیال خان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پوچھے گی۔ خواہ اس کو ادھر ادھر کے ہزاروں سوال کرنا پڑیں۔

"ہاں وہ وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مرغزار میں۔ خٹک ہاؤس میں۔"

ان کی لاتعلقی نے اس کو سرد سا کر دیا۔

انہوں نے تو جاتے وقت اس کو یا کسی کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ گویا ان کے نزدیک اس کی حیثیت اتنی ہی بیکار اور بے مقصد سی تھی۔ پھر بھلا اس کو کیا پڑی تھی وہ کرید کرید کر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرتی۔

نہیں تو نہ سہی۔

"خٹک ہاؤس۔ وہ کون لوگ ہیں؟"

کبھی کبھی ہماری زبان کیسے ہمارے دماغ کے حکم کے تابع نہیں رہتی۔ نصیحت، شعور، سوچ، ضمیر اور دماغ کے سکھائے سارے فیصلوں کو زبان بے دردی سے رد کر دیتی ہے۔

"ارے تم ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔" بے بے نے بڑی خوشگوار سی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔

"خٹک ہاؤس کا اس بستی کی تاریخ میں بڑا عمل دخل ہے۔ خاص طور پر اس گھر کی تاریخ میں۔ پتا نہیں میرا اندازہ درست ہے کہ غلط۔ لیکن۔۔۔" وہ کچھ سوچ کر مسکرانے لگیں۔

"اگر میں غلط نہیں سوچ رہی تو اس میں کوئی برائی بھی نہیں۔"

اس کے بالکل اندر کہیں کوئی بھڑکتی سی آگ جیسے پانی کے ایک چھینٹے سے بجھ گئی۔

"اور دانیال خان میں تو اتنی خوبیاں ہیں۔ اتنی کہ بیک وقت کسی شخص میں ہونا بہت مشکل ہیں۔ ان کی وجاہت۔ ان کا اخلاق۔"

"کیا خٹک ہاؤس میں کچھ خاص خواتین ہیں۔"

بے بے بے ساختہ زور سے ہنس پڑیں۔

"آپ نے دیکھا ہے ان لوگوں کو؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ بہت اچھی طرح۔"

"ان میں سب سے اچھی کون ہے۔"

"سب سے اچھی تو وہی ہے بیلا بچی یا بات۔ لیکن" وہ کچھ دیر چپ رہ کر جیسے بالکل بجھ گئیں۔

"لیکن وہ مجھے بالکل پسند نہیں کرتی۔ دراصل اس کو دانیال خان کی زندگی میں میرا عمل دخل پسند نہیں ہے۔"

"خیر میرا کیا ہے۔" انہوں نے اپنی آواز اور اپنے لہجے کے تاسف پر قابو پالیا۔

"میں واپس بنوں چلی جاؤں گی۔ ایک مرتبہ اس کا گھر آباد ہو جائے۔ میں تو اسی لیے یہاں ٹھہری ہوں کہ دانیال خان اور خان گل اپنی گرہستی سنبھال لیں۔ شیریں کی ذمے داری پوری کریں۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔"

اس کے اندازوں کے بت منہ کے بل گرنے لگے تھے۔ اسے عجیب سی حیرت ہوئی۔ دانیال خان، خان گل اور شیریں ایک مثلث کے کونے نہیں تھے۔ وہ آج تک دانیال خان کی دلچسپی کا محور جس لڑکی کو سمجھتی رہی تھی وہ وہ نہیں تھی۔

"عدیلہ خٹک بہت نئی لڑکی ہے۔ نئے زمانے کی۔ وہ جیسے تم کہتے ہو موڈرن۔ وہ اپنے چہرے سے اپنے کپڑوں سے اپنے ہر انداز میں خوب ہے۔ وہ بھی دانیال خان پر جان دیتی ہے۔ وہ جہاں کہیں ہوں ان کے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہے۔"

"اور باقی کی تین لڑکیاں۔"

"وہ بھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے دانیال اچھے لگتے ہیں اور میں مبالغے سے کام لے رہی ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ جہاں ہوتے ہیں ساری محفل کی توجہ کھینچ لیتے ہیں۔ وہ تینوں بھی اپنی سی پوری کوشش کرتی ہیں کہ دانیال خان ان کی طرف متوجہ رہیں۔"

پتا نہیں بے بے سچ کہہ رہی تھیں یا مبالغہ کر رہی تھیں۔

ایسی عورتیں اس نے دیکھی تھیں لیکن بہت زیادہ نہیں۔ سوسائٹی سے متعلق اس کا تجربہ کچھ خام ہی تھا۔

"دراصل ان میں تین خوبیاں ایسی ہیں جو مشکل سے یکجا رہتی ہیں۔ اول ان کا خون، دوم ان کی دولت اور آخری بات ان کا تجربہ ہے۔ انہوں نے دنیا دیکھی ہے ان کو دلوں میں گھر کرنا آتا ہے۔ دیکھو گڑھی کے لوگ کس طرح ان پر جان دیتے ہیں۔"

"تو کیا جان دینے والے گڑھی سے باہر بھی رہتے ہیں۔"

بے بے بالکل بھی نہیں مسکرائیں۔ اس وقت وہ سنجیدہ تھیں اور بیلا کا بات ٹال دینا ان کو قطعی اچھا نہیں لگا۔

"وہ کہاں کہاں نہیں رہتے۔"

"آپ کے خیال میں بے بے کیا وہ لوگ شادی کرنے والے ہیں۔"

"مجھے تو یقین نہیں ہے لیکن۔ ان آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے اور اب اتنا تجربہ حاصل کر لیا ہے کہ غلطی کی گنجائش نہیں رہتی۔ ایک موقع پر جب وہ سب یہاں آئے رہتے تھے عدیلہ خٹک نے ان سے گانے کی فرمائش کی۔ تم تو ان کو اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ کتنا لیے دیے رہتے ہیں لیکن انہوں نے گانا گا لیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھا۔ اور عدیلہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔"

"اچھا۔" وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔ "دانیال خان گا بھی لیتے ہیں، مجھے پتا نہیں تھا۔"

"ارے ان کی آواز تو بہت بھاری اور خوبصورت ہے۔"

"اور عدیلہ خنک کی؟"

"ہاں اس کی بھی بہت اچھی ہے۔" بے بے فراخدلی سے سرٹیفکیٹ لٹانے پر تلی ہوئی تھیں۔

(یہ کتنی عجیب بات ہے۔ اس نے دل میں سوچا کہ دانیال خان میں اچھے ہیروؤں والی ساری ہی باتیں ہیں۔ شکر ہوا کہ وہ خود روایتی ہیروئن بننے سے بچ گئی)

"انہوں نے کون سا گانا گایا تھا؟"

وہ اپنے سوال کے بچگانہ پن پر ٹھٹک گئی۔ کوئی اور ہوتا تو اس کا خوب ہی مذاق بنتا۔ یہ شکر ہوا کہ بے بے

☆ ☆ ☆

وہ رات گئے بستر پر لیٹی تو یونہی بلا ارادہ اس کی نظر ڈیجیٹل کیلنڈر کی طرف اٹھ گئی۔ اکیس دن گزر گئے تھے۔ اتفاق سے ہر رات وہ دن انگلی پر گن لیتی تھی۔ حالانکہ ان دنوں کو گننے سے اس کا کوئی خاص مقصد بھی نہیں تھا۔ بس

بے بے نے کہا تھا وہ عید پر ضرور آئیں گے اور ممکن ہے نہ آئیں تو سال بھر نہ آئیں۔

ان کا یہاں رہنا اور یہاں سے چلا جانا کون سا قابل ذکر کارنامہ ہے کہ وہ دن گن گن کر اپنی زندگی اجیرن کرے۔ اس نے بہت سے تکیے سر کے نیچے لگا کر جیسے ڈوبتے ڈوبتے سوچا۔

کبھی کبھی قدرت ہم پر بہت مہربان رہتی ہے جب وہ ہم کو کسی غلط راستے پر نکل جانے سے پہلے روک لیتی ہے۔ سارے وجود پر چھائی ٹھنڈی لہر اور سویا سویا سا دماغ۔

کبھی ہم کو یونہی محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارا دل بند ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ کسی بڑی چھوٹی خبر پر بند نہیں ہوتا۔ اس نے بے لگام چھوڑی سوچوں کو قابو کر لیا۔ شکر ہے وہ اس ریلے میں بہتی دور نکل نہیں گئی تھی۔ اسے خود کو سنبھال کر رکھنا بھی آتا تھا۔

اسے منٹوں کے لیے یہ لگا تھا کہ شاید وہ اتنے بہت سے بڑے بڑے ناموں کے سامنے چھوٹی چھوٹی سی رہ گئی ہے۔ کچھ حقیر سی ہو گئی ہے۔ وہ نہ حسین ہے نہ جمیل ہے۔ نہ اعلیٰ سوسائٹی کی پروردہ۔ نہ وہ جدید ضروریات زندگی سے آگاہ ہے حتیٰ کہ اسے گانا بھی نہیں آتا۔

سینے میں سلگتے ہیں ارماں۔ آنکھوں میں اداسی چھائی ہے

اور اصل میں بات یہ ہے بیلا بی بی کہ گڑھی تیمی خان اور اس بستی کے مالک پر تمہارا اس سے زیادہ حق بھی نہیں ہے کہ یہاں ملازمت کرو اور اس کے عوض اپنی تنخواہ حاصل کرتی رہو۔ کیا یہ غنیمت نہیں کہ ملازمت کے باوجود آپ کے ساتھ ملازموں والا رویہ نہیں رکھا جاتا۔ آپ کی عزت اور احترام میں کوئی فرق نہیں آنے دیا جاتا۔ کیا یہ کہ گھر والوں اور آپ کے بیچ کوئی لمبی چوڑی دیوار حائل نہیں۔

اور یہ بات بھی یاد رکھو بیلا بی بی۔ اس نے تخیل میں بڑے بڑے خود کو بہت اچھے بچوں کی طرح نصیحت کی۔ تنخواہ ہی وہ واحد رشتہ ہے جو آپ کے اور اس کے درمیان ایک حقیقت کی طرح موجود ہے۔ اور وہ آپ کے کسی حصے کو سنجیدگی سے لیتے بھی ہیں تو صرف اسی حصے کو۔

لہٰذا خوبصورت چیزوں کے چناؤ کے لیے کسی اور وقت کسی اور رشتے کا انتظار کرو کہ عزت نفس جیسی چیز

گنوانے کے لیے نہیں پالی جاتی۔

وہ خاموشی سی اپنی دن بھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ لیکن چلتے ہاتھ پیروں کے ساتھ اس کا دماغ یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ کبھی کبھی شدت سے اس کا جی چاہتا۔ وہ گڑھی چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے۔ ملازمت کی تلاش میں کہیں اور نکل جائے۔

پھر کسی دن، کسی وقت کوئی شخص راستہ بھول کر واپس گڑھی آ جائے تو ایک مرتبہ تو یہ پوچھے۔

"وہ جو ایک گھریلو امور میں امداد کے لیے ایک غیر اہم سی لڑکی ملازمت میں رکھی گئی تھی۔ کیا وہ گڑھی چھوڑ کر جا چکی ہے؟" یا اس مسلسل فریب سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ طویل سفر کے بعد جب لوگ واپس پلٹتے ہیں تو پیچھے رہ جانے والے لوگ ان کے حافظے میں بچے ہوتے ہیں یا مٹ جاتے ہیں۔

کون جانے؟

اور تجربے کے انتظار میں بھٹی میں جلتا رہے کہ کب وہ رد کیا جاتا ہے۔

دوپہری کے ساتھ کام کاج میں اور بھی شدت سے مصروف ہو گئی تھی۔ گویا اسے جلد سے جلد یہ سب کام نمٹا کر فارغ ہونا تھا۔ وہ کوئی کام ادھورا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ خواہ وہ اس کی ڈیوٹی میں شامل ہوتا یا نہیں۔ اسکول کا معاملہ ہو یا عورتوں کے امور۔ وہ پری کو ساتھ لیے جلد جلد سارے کام نمٹاتی رہتی۔ اس لیے وہ کتنی مدت تک خلیل جبران سے ملنے بھی نہیں جا سکی۔ کیا فائدہ جو وہ واپس آئیں اور کسی ادھورے سدھورے کام میں نقص نکالیں۔

☆ ☆ ☆

پیدائش کے بعد سے آج تک اس نے رمضان شریف کا چاند اتنا واضح اتنا نمایاں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شہروں کی چھتوں پر خوشیاں لانے والے چاند شہروں کی روشنیوں میں دھندلے ہو کر نظر بھی نہیں آتے تھے۔ یہ تاریک سی گڑھی عیسیٰ خان تھی۔

جہاں سر شام ہی اندھیرا گرنا شروع ہو جاتا۔ موسم بھی صاف تھا لہٰذا چمکیلا صاف چاند آسمان پر خوب اچھی طرح نظر آنے کے بعد غائب ہو گیا۔

بستی میں لوگوں نے پٹاخے چلائے اور آسمان کی طرف بندوقوں کا رخ کر کے دعائیں دعائیں گولیاں داغ دیں۔ جانے اس سے ان کا کیا مطلب تھا۔ ساری بستی رمضان کی آمد پر چہچہا رہی تھی۔ بے بے اسٹور سے اناج تلوا کر بجھوانی رہیں اور لوگ رمضان کا سلام کرتے رات پڑے تک آتے رہے۔ بے بے بے تحاشا مصروف تھیں پھر بھی انہوں نے بتایا کہ رمضان تو ان کے ہاں بہت اہم مقام ہے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بچے شرط لگا کر روزہ رکھتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ سحری کھائے بغیر روزہ رکھیں گے۔ بعض لوگ اپنے تین چار سال کے بچوں کو روزہ رکھواتے ہیں۔ اور بعض لوگ۔۔۔

وہ چپ چاپ بے بے کا جوش و خروش اور اہتمام دیکھتی رہی۔ وہ ان سے مذہب پر بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ کہنا نہیں کیونکہ جن چیزوں کی رعایت خود اللہ تعالیٰ نے ہمیں دے رکھی ہے۔ ہم اپنے اوپر ان کو ممنوع کر کے اور اپنے لیے مسائل کھڑے کر کے یہ کیسے سمجھ لیتے ہیں کہ مذہب کو اس سے کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے۔

"لیکن بے بے۔" اس نے منمنا کر کہا "میں تو سحری کھائے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔"

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ میں بھی سحری کھا کر رکھتی ہوں۔ تمہارا بندوبست بھی ہو جائے گا۔" بے بے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے اس کو تسلی دی تھی "تو رمضان آ گیا۔" اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

"وقت اگر اس طرح بھاگتا رہا تو۔" اس نے خیالوں کے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں۔ خود کو بے اختیار کرنے سے حاصل؟ دانیال خان کسی ضروری کام سے کہیں بہت دور نہیں گئے تھے۔

وہ یہیں مرغزار میں "ختک ہاؤس" میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ لیکن وہ کسی قسم کی اطلاع بھیجنے یا ملاقات کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ آج پہلا روزہ تھا۔ اور اس روزے کے سلسلے میں جانے وہاں اہتمام کی صورت کیا ہوگی۔ اگر وہ روزے رکھتے یہاں۔ جاتے تو بے بے بھی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتیں لیکن شاید وہ خاطر تواضع اس خدمت کا مقابلہ کر بھی نہیں سکتی۔

پنجاب میں بھی افطاری ایک اہم ایونٹ ہوتا ہے لیکن گڑھی عیسیٰ خان کی یہ افطاری شاید عمر بھر یاد رکھنے والا ایک واقعہ ہی تھا صرف روزہ کشائی کے لیے پورے ہال کمرے میں پھیلی میز یہاں سے وہاں تک اٹی پڑی تھی اور اذان کی آواز کے منتظر اتنی بڑی میز کے گرد وہ صرف دو ہی آدمی تھے۔

اذان سے پہلے قیمت خان سید کی نازک ٹرے میں ڈاک لے آیا۔

یہ سفید لفافہ پر مشتمل ایک خط تھا۔ اور یہ ہی آج کی ڈاک تھی۔

بیلا نے ایک نظر لفافے کی طرف دیکھا۔ کوئی لفافہ اس کے نام نہیں آتا تھا۔ ایک مدت گزر گئی لیکن یہ عجیب سا لفافہ تھا شاید بھوک کی شدت سے یا روزہ کے کھلنے کے انتظار میں اس کا دل ہلکا ہلکا سا دھڑکا تھا۔

بے بے نے ایک نظر امید سے قیمت خان کی طرف دیکھا۔

"یہ تو دانیال خان کی ڈاک لگتی ہے۔ کون آیا ہے؟"

"جی ہاں۔ یہ قادر خان لایا ہے۔" وہ مودب تھا۔

بیلا کا ہموار انداز میں دھڑکتا دل ایک مرتبہ تو جیسے دھک سے بند ہو گیا۔

مسجد سے موذن کی آواز گونجی۔ اور اس کا رکا ہوا دل دھڑ دھڑ کر کے سینہ توڑنے لگا۔ بے بے لفافہ چاک کر کے کاغذ نکال رہی تھیں۔ پھر انہوں نے تیزی میں لفافہ پھاڑنے کی کوشش کر کے کھجور منہ میں رکھ لی۔

"روزہ کھولو بیلا۔ مکروہ ہو جائے گا۔"

اس نے کھجور اور پانی کا گلاس بیک وقت منہ سے لگا لیا۔

بے بے نے چشمہ لگا کر نہایت اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر خط مزے لے لے کر پڑھنا شروع کر دیا۔ پتا نہیں۔ انہوں نے کتنے دفتر رقم کیے تھے یا بے بے کو ان کی ایک ایک لائن میں کتنے جہاں کے معنی نظر آ رہے تھے۔ کہ نہ انہوں نے خط ختم کیا نہ واپس رکھا۔

کتنی مرتبہ بیلا نے کوشش کی وہ ایک چھچھلتی نظر کاغذ پر ڈال ہی دے۔ پتا نہیں انہوں نے کیا لکھا ہوگا۔ انہوں نے "ختک ہاؤس" میں مستقل رہائش کا منصوبہ بنا لیا ہے۔

یا وہ ختک ہاؤس سے امریکہ چلے گئے ہیں اور اب فی الحال پاکستان واپسی کا کوئی پروگرام نہیں۔ یا یہ بھی کہ وہ جہاں ہیں خیریت سے ہیں ان کے بارے میں فکر کرنے کی کسی کو کوئی ضرورت نہیں۔

اس نے خط میں جھانکنے کی معمولی سی کوشش کتنی مرتبہ کی۔ پانی اٹھاتے پکوڑوں کی ڈش کھسکاتے۔ لیکن وہ اپنی بے تابی کا کوئی مظاہرہ کسی کے سامنے کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ بے بے نے لفافہ واپس ٹوکری میں رکھا تو وہ پکوڑا دانتوں سے کتر رہی تھی۔ ان کا بے رنگ سپاٹ چہرہ کسی بھی اندازے کے راستے میں حائل ہو رہا تھا۔

"آپ کچھ لیں بے بے۔" اس نے کبابوں کی ڈش آگے کی۔ "کیا لکھا ہے انہوں نے؟ وہ فی الحال واپس نہیں آ رہے۔" اس کے لہجے کی بے نیازی اور بے تحاشا لاپروائی اس کی شدید محنت کا ثمر تھی۔

"برعکس اس کے۔" انہوں نے اسی پرسکون سی آواز میں کہا۔ "وہ کل یہاں پہنچ رہے ہیں۔"

"کل۔؟" بے قابو ہوتا دل پسلیوں میں کسی ڈوبنے والی شے کی طرح تیرتا دیواروں سے ٹکریں مارتا جیسے پاگل ہو گیا۔ سارے جسم میں دوڑنے والا خون کتنی دیر اس کے چہرے پر چھلکتا رہا۔

اتنے دن کی شب و روز نصیحتیں۔ اپنی ذات کے ہزار ہزار فضیحتے۔ جیسے بہ طاق رکھے گئے تھے۔ وہ خود سے کیے گئے سارے عہد۔ ساری نصیحتیں بھلا کر پھر سے اپنے دل کو شانت ہو جانے پر سکون رہنے کے لیے ڈپٹنے لگی۔ ہاں اس پاگل دل کو اس بیوقوفی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کتنے دن اس نے اپنی ذات پر صرف کیے تھے صرف یہ سمجھانے کے لیے کہ کیا ہے اس گڑھی کے سردار کا تم سے رشتہ کیا واسطہ ہے کیا مطلب ہے؟

ہاں مگر صرف آقا اور ملازم کا۔ اس سے زیادہ ان کو کیا دلچسپی ہے بی بی بیلا تم سے۔

لیکن دوسرا وقت تھا۔ جیسے ساری نصیحتیں ایک ضدی دل نے ایڑیاں رگڑتے پاؤں مسلتے پھاڑ ڈالی تھیں۔

ایک مگر سکون۔ یا خدا سکون۔

وہ مغرب کی نماز پڑھ کر دعا مانگنے لگی۔ مجھے خود پر قابو پانا سکھا۔ مجھے اتنا نیچے نہ کر کہ اپنے آپ سے شرم آنے لگے۔ عزت نفس کو مجروح نہ کر۔ مجھے مایوس نہ کر۔ مجھے مایوس نہ کر۔

وہ نماز پڑھ کر اٹھی تو اس کے تن من میں ایک نئی طاقت آ گئی تھی۔

روزہ کھول کر بے بے کو البتہ کمزوری سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ کھانا کھانے سے اختلاج قلب کی کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنا خمیرہ کھایا اور چائے کے لیے بیلا کو اپنے کمرے میں ہی بلوا لیا۔

وہ اپنے کمرے میں لیٹی جیسے بیمار سی لگ رہی تھیں۔

"روزہ کھول کر میری یہی کیفیت ہو جاتی ہے بیلا۔ بڑھاپا بری بلا ہے۔ دیکھو عبادت کا اصلی مزا بھی جاتا رہتا ہے۔ ہاں بیلا میں نے تمہیں بلوایا تھا معاف کرنا میں رمضان شریف میں، تمہیں کچھ زیادہ ذمہ داری سونپ رہی ہوں۔"

انہوں نے تکیے کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر خط دوبارہ نکال لیا۔ وہ لمبا سفید لفافہ جو دونوں کو اپنی اپنی جگہ ایک نامعلوم سی خوشی بخشتا تھا۔

انہوں نے اس کی چند سطریں دوبارہ پڑھ کر چھوڑ دیں۔

"انہوں نے اس میں تمہارا نام بھی لکھا ہے۔" بے بے اپنی ذات کی مخصوص لاپروائی سے کہہ رہی تھیں۔ اس کا چھٹا پھڑکتا دل جیسے رک گیا۔

"کیا لکھا ہے؟" حلق کے کسی کونے سے دبی دبی سی مری ہوئی آواز۔ بے بے کے لیے ذرا بھی اہم نہیں تھی۔

"انہوں نے لکھا ہے تم ان کے لیے کچھ کمرے ٹھیک کروا لینا۔ اوپر والی منزل میں۔ اور لائبریری کے پاس ان کو ماسٹر بیڈ چاہئیں۔ کیونکہ ان کے ساتھ کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ اور مہمانوں کے ساتھ ان کے کچھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ذکر بھی ہوں گے۔ وہ وہ کمروں والے حصے خالی کرانا چاہتے ہیں۔ کیا کل تک تم یہ سارا کام کرالوگی؟"

ڈھیر ساری برف نے جیسے اس کے سارے وجود کو ڈھانپ لیا۔ اتنی مدت بعد انہوں نے اس کو پکارا بھی تھا تو اس کام کے رشتے سے۔ اسی ملازمت کے حوالے سے۔ وہ چپ کی سی ہو گئی۔

"یہ ان کا حکم ہے تو میں کرلوں گی۔" اس کے حصے کی ساری برف اس کی آواز میں ڈھل گئی تھی۔ اتنی سرد مہری بھی بے بے کی اپنی گرم جوشی کے سامنے بجھ سی گئی۔

"اس مرتبہ وہ کچھ زیادہ احتیاط کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہیں۔ خدا کرے وہ واقعی کسی فیصلے تک پہنچ ہی جائیں۔ مجھے شاید تمہیں بتانا یاد نہیں رہا بیلا۔ ان کے ساتھ عدیلہ خٹک بھی آرہی ہے۔ جس کا ایک مرتبہ میں نے تم سے ذکر بھی کیا تھا۔ یہ وہی لڑکی ہے ناں جس سے دانیال خان شادی کرنے والے ہیں۔"

وہ اپنے کمرے میں آئی تو اس کے قدم بوجھل تھے لیکن شکست خوردہ نہیں۔

یونہی گزرتے گزرتے اس کی نظر دیوار پر آویزاں قد آدم آئینے پر پڑی اور اس کو اچھا لگا کہ اس کا چہرہ بجھا بجھا اور مایوس مایوس نہیں تھا۔ مایوسی کا خوف صرف اس وقت تک ہوتا ہے جب تک آنے والے وقت کو آنا ہوتا ہے۔ اور جب فیصلے کی گھڑی آپ کے سر پر آجائے اور منصف آپ کا فیصلہ سنا ڈالے تو تکلیف کی شدت میں ایک دم کمی آجاتی ہے۔ حالانکہ وہ فیصلہ آپ کے حق میں نہیں ہوا ہوتا۔

ٹھیک ہے نہ تھی۔

اس نے کھڑکیاں کھول کر تازہ ہوا اور موسمی پھولوں کی خوشبو کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

ستارے، چاندنی، رات کی رانی کی مہک اور آڑو، آلوچوں کی خوشبو پر اگر اس کا اختیار نہیں بھی ہو سکا تو ان کی مہک کا راستہ بند تو نہیں ہو گیا تھا۔ اور ویسے بھی میں مزدور پیشہ لڑکی ہوں۔ (اس نے شیشے میں خود کو دیکھ کر زور سے تنبیہ کی۔)

یہ خواب۔ اور خوابوں میں کھلنے والے شگوفے اور تمام تر خوبصورت الفاظ اور ان کے اچھے اچھے استعمال پر اس کے بجائے واقعی کسی آسودہ حال لڑکی کا حق زیادہ تھا۔ اس کا تو صرف فرض ہے اور وہ یہ کہ لائبریری کے پاس والے اور دوسری منزل پر مہمانوں کے کمروں کی دیکھ بھال کر دی جائے۔ اس میں موجود فرنیچر میں رد و بدل کی ضرورت ہو تو رد و بدل کر دیا جائے۔ اور بس۔

بے بے کے کمرے میں آنے سے پہلے اس نے ایک چکر لائبریری اور اوپر والے کمروں کا لگایا تھا۔

قیمت خان نے سردار کے جانے کے بعد ایک کنجی اسے تھماتے گویا احسان کیا تھا۔

"سردار نے کہا تھا آپ کو لائبریری کی چابی دے دی جائے۔"

غالباً ان کے ذہن میں یہ سب پروگرام اسی وقت موجود تھا۔ ان کا اچانک یہاں سے روانہ ہو کر مرغزار میں خٹک ہاؤس میں قیام کرنا اور مہمانوں کو لے کر آدھمکنا (لیکن اس کو کیا؟)

وحول مٹی کا تو یہاں ذکر ہی کیا۔ بارش بھی تھی تو دھول کروا دیا۔ کمرے صاف ستھرے تھے۔ منتظم کے قرینے نے ان میں مزید اضافے کیے تھے لہٰذا معمولی باتوں کے سوا کسی خاص کام کی طرف توجہ بھی نہیں دینی تھی۔

اس نے لائبریری سے کچھ کتابیں نکالیں اور بظاہر پرسکون ذہن کو مزید سکون دینے کے لیے رات گزاری کا پروگرام بنا ڈالا۔

اس نے شیشے کے سامنے سے خود کو ہٹایا۔ بستر پر تکیوں کے ڈھیر میں غرق ہو کر ایک کتاب کھولی۔ دوسری، پھر تیسری۔ لیکن افسوس اس نے غور کیا تو چنی ہوئی کتابوں میں سے ایک بھی کام کی نہیں تھی۔ پروین شاکر بھی اور اس کا مجموعہ کلام بھی ایک زمانے میں اس کو بہت پسند تھا لیکن اب اس کا ہر شعر بے تکی اور ہر لفظ بے مقصد سا لگا۔

پھر اس نے منیر نیازی اور ناصر کاظمی کو کھولا اور بند کر دیا۔

قصور ان بے چاروں کا نہیں تھا جو گرد پڑی تھی اندر تھی۔

یا شاید اس میں ان تخلیق کاروں جتنا بڑا ظرف نہیں تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے ان کی مہندی سجا سکتی تھی، شدید آندھیاں اور راتوں کو سڑکوں پر ٹہل کر کھولتے ابلتے دماغ کو ٹھنڈا کر سکتی تھی۔

ہاں بس اس کو نوکری کرنی تھی۔

لیکن اس نے آنکھیں بند کیں اور کھول دیں۔ کبھی کسی وقت ہم خود پر سے اختیار بالکل کھو دیتے ہیں۔ رات، خوشبو، کتابیں، نیند۔

شاید کوئی بھی چیز آج کی رات اس کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتی تھی کہ اس کا ذہن بار بار کی ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ کے باوجود پلٹ کر ایک ہی نام کی طرف جاتا تھا۔ وہ لڑکی جو کچھ بھی تھی۔ امیر تھی جو دنیا گھومی تھی۔ ایسی لڑکی کے ساتھ بھلا اس کا کیا مقابلہ؟ وہ جو میپل ہند موتی کی طرح کسی سزا یافتہ مجرم کی مانند ایک چھج میں قید کر دی گئی تھی۔ حالانکہ کسی سے بھی مقابلہ کرنا اچھی بات نہیں۔ اس نے مہذب NUNS کی طرح سنڈے اسکول کے سبق دہرائے۔ ہم اپنی تقدیر کو ہنسی خوشی برداشت کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ کسی کا مقدر دیکھ کر کینہ حسد کرتے ہیں اور وہ سر کیف کہنی نہیں۔

وہ سحری کے لیے اٹھی تو ابھی سوئی نہیں تھی۔ لیکن اس کا کامیاب بہادر پارک اس کے چہرے کے تمام عیب چھپائے جلدی جلدی کھانے میں مشغول تھا۔ رات کے سناٹے میں نیچے بستی کی طرف سے ٹین کے کنستر بجنے اور وقفے وقفے سے گولہ چھوٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ خطیب مسجد میں مسلسل پکچھ کہہ رہے تھے۔

کیا؟ افسوس وہ ہنوز پشتو سے نابلد تھی۔ بڑی خاموشی سے ان دونوں کے درمیان ذرا سے فاصلے سے بیٹھی تھی۔ ختہ خان جلدی جلدی دودھ میں ڈوبی جلیبیاں اور تر تراتے گھی میں تلے پراٹھے لے کر بھاگتا دوڑتا پھرتا تھا۔ کبھی کبھی بے بے کی اجازت سے بڑی ان کے درمیان آکر بیٹھ جاتی۔ ایک طرح سے اس کی حیثیت بیلا سے مستحکم تھی کیونکہ وہ اسٹیٹ کے منیجر کی بیٹی تھی۔ براہ راست گڑھی کی ملازم نہیں تھی۔

آج کی رات بھی وہ سحری کے لیے ان کے درمیان موجود تھی اور بار بار اس کی نگاہ بھٹک کر بیلا کی طرف جاتی تھی۔ بیلا سے اپنے ارد گرد ان لوگوں سے ڈر لگتا تھا جو اس کی رگ رگ سے آگاہ ہونے لگے تھے۔

اگلے دن روزہ بہلانے کے طور پر اس نے سوئیٹ سجائے۔ دو دو کمرے اور ان سے ملحق اٹیچڈ باتھ روم۔ ان میں ضروریات زندگی (یا تعیشات زندگی) کے سامان کی مکمل فراہمی کا بندوبست کیا۔ لیکن خلا پہنچ جانے اور سامان زندگی تیار ہو چکنے کے باوجود قافلے کا پڑاؤ نہیں ہوا۔ اور اس دن جب وہ مہمانوں کی آمد سے بالکل مایوس اپنی کھڑکی سے باہر نظر آنے والے درختوں کے مناظر میں گہری شدید مایوسی کا شکار ہو رہی تھی کہ اچانک مین گیٹ پر مخصوص ہوائی فائر نے اطلاع دی کہ اس وقت وہ افراد گڑھی عیسیٰ خان کے رہائشی علاقے کی طرف داخل ہو رہے ہیں جو ناپسندیدہ نہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یکے بعد دیگرے جب جیپ محل میں اندر داخل ہوئیں تو عمارت میں جیسے ہلچل مچ گئی۔ اس آباد جاہلی اور بھگدڑ میں جیسے کسی کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ بہت ساری جیپیں تھیں، جن میں سے نمبرو جیپ کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔

اور پہچان کا یہی لمحہ تھا جب گھڑی بھر کے لیے اس کا ضدی دل رک سا گیا تھا۔ کپکپاتی یخ سردی کی ایک لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی کے پار بہہ گئی۔ حالانکہ برفباری کا موسم کب کا گزر چکا تھا۔ اور درخت شگوفوں سے لدے پڑے تھے۔ بہت سے افراد گھر سے باہر نکلے۔ بہت سے افراد جیپوں سے اترے۔

اور وہ باقی ماندہ افراد اور سامان کو جیپوں سے اتارنے میں مدد دینے لگے جو چھلانگیں مار کر جیپ سے اتر آئے تھے۔ علاقے کی دلفریبی گردن گھما گھما کر ان کو بے قابو کیے دے رہی تھی۔ وہ بہت سی عورتیں تھیں بہت ہی خوش خرم لڑکیاں تھیں، بچے تھے، مرد تھے۔ اور ان سب میں سب سے جدا سب سے الگ۔

لیکن ان کے بالکل درمیان گھرا وہ شخص جو سفر کی تکان ماتھے سے بال ہٹا کر اتار رہا تھا۔

ایک مدت بعد اس نے انہیں دیکھا تھا لیکن کتنی دور سے۔ اور کتنا دھندلا۔ دھندلا۔ اچانک فضا میں کہیں سے گرد و غبار چھا گیا تھا۔ یا معلوم نہیں آنکھوں میں امنڈتے پانی نے سارے منظر دھندلا دیئے تھے۔

انہوں نے بات کرتے کرتے ایک نظر اٹھا کر اس کے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔

یونہی اس کو شبہ سا ہوا انہوں نے کھڑکی میں کھڑے اس کی طرف دیکھا ہے۔ بے ساختگی میں اس نے سر پیچھے کر لیا۔ حالانکہ اتنی دور سے اور کمرے کے اندھیرے میں کسی کا نظر آنا ناممکن سی بات تھی۔ اور شیشوں کی blinds کے اس طرف وہ کسی کو نظر بھی نہیں آ سکتی تھی۔

ان کی نظریں اس کو تلاش بھی نہیں کر رہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ کیونکہ وہ اپنے مہمانوں کی موجودگی میں اتنے خوش تھے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ قہقہے لگاتے ہنستے مسکراتے ایک ایک مہمان کو علیحدہ علیحدہ توجہ دے رہے تھے ایسے میں اس کے کمرے کی کھڑکی کی طرف سر اٹھا کر دیکھنا ایک اتفاقی عمل ہی ہو سکتا ہے۔

اس تجزیے نے اس کو تھوڑا سا مایوس کر دیا۔

اس نے پھر سر جھکا کر دیکھا۔ علاوہ انسانوں کے جم غفیر کے کچھ کتے بھی ساتھ تھے۔ اسے کتوں کی نسلوں کی پہچان تھی نہ شکلوں کی۔ لیکن اس کو اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ سب خوفناک، خطرناک کتے تھے سامان اور لوگوں کی تقسیم سے پہلے ہی کتے اور ٹرینرز علیحدہ ہو گئے تھے۔

بچے شگوفوں سے لدے باغوں میں ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑنے لگے۔

عورتوں اور لڑکیوں کے عقب میں مرد مہمان آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

پتا نہیں ان سب میں عدیلہ خٹک کون سی ہو گی؟

تھوڑی دیر کے لیے گھر کے پورچ میں جو زندہ اور جاندار ہنگامہ برپا ہوا تھا آہستہ آہستہ ماند پڑ گیا۔

آخری آدمی اور آخری سامان تک وہ کھڑکی کے اندھے شیشوں سے باہر کے مناظر کو جھانکتی اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک پورچ بالکل ہی خالی نہ ہو گیا۔

جیسے ٹرین کے چلے جانے کے بعد پلیٹ فارم۔ مسافر۔ سوار کرانے والے اتارنے والے۔ خوانچے والے محض خالی چھلکے اور ویران کر دینے والے سناٹے میں اکلوتا قلی گھر کا وہ پورچ بھی کسی چھوٹے

اسٹیشن کا پلیٹ فارم لگ رہا تھا۔ خالی اور ویران۔ سارا ہنگامہ ساری رونقیں سمٹ کر کہیں چلی گئی تھیں۔

وہ ایک گہری سانس لے کر کھڑکی سے ہٹ آئی۔

گھر کے باہر جتنا شور تھا گھر کے اندر اتنا ہی سناٹا طاری ہو گیا۔

معلوم نہیں وہ گھر کے کس کونے میں تھے اور کیا کر رہے تھے۔

وہ ان کے بارے میں زیادہ سوچ کر خود کو تھکانا نہیں چاہتی تھی لیکن سوچتے رہنے پر جیسے اس کا اختیار ہی نہیں رہا تھا۔

اس وقت وہ سب گیلری سے گزرے ہوں گے اس وقت وہ لوگ اس مجسمے کے پاس ہوں گے جو غصے اور تناؤ کے سارے رنگ اپنے چہرے پر سمیٹ کر آنے والوں کو خود سے خوف زدہ کروا تا رہتا تھا۔ سب سے پہلے وہ لوگ بے بے کے پاس گئے ہوں گے۔

گو بے بے کے بقول عدیلہ خٹک کو ان کی ذات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لیکن دانیال خان اپنے مہمانوں کو بے بے سے ملوانے ضرور لے گئے ہوں گے۔

تھوڑی دیر کے لیے اس کا بھی دل مچلا' وہ بھی بھاگتی جائے اور ان سب کی ملاقات کا منظر خوش دلی سے دیکھے۔ کاش اس وقت وہ کوئی سلیمانی ٹوپی اوڑھ کر ان کے درمیان جائے۔ وہ سب کو دیکھے لیکن اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ پندرہ بیس منٹ وہ خاموشی سے انتظار کرتی رہی۔

ہاں اب ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہو گا۔

مہمانوں کے داخل ہوتے ہی چائے کا اہتمام تو جوش و خروش سے شروع ہو ہی گیا ہو گا۔ اگر اب تک چائے بن چکی ہوئی تو مہمانوں کو چائے کے لیے بلوایا جائے گا۔

"آپ کو چائے کے لیے بلوا رہے ہیں۔" پری نے دروازہ کھول کر جیسے روانی میں اعلان دیا تھا۔

وہ حیران سی کرسی پر بیٹھی رہ گئی۔ درون دل اس کا مہمانوں سے رابطہ اس قدر واضح تھا۔ اس کو گم صم چپ سادھے دیکھ کر پری کو خیال ہوا شاید اس نے سنا نہیں۔ "میں نے کہا آپ کو۔"

"ہاں پری۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "مہمان کہاں ہیں؟ وہ کیا کرتے رہے ہیں اب تک؟"

"کچھ بھی نہیں۔ آپ کو اطلاع ہوئی؟ وہ ابھی ابھی آئے ہیں۔ سردار پہلے ان کو بے بے کے پاس لے گئے۔ اس دوران چائے کی تیاری ہو گئی ہے۔"

وہ اپنے کشف پر نازاں سی کھڑی ہو گئی۔

"کتنے مہمان ہیں پری؟"

"بہت زیادہ۔ کل بیس پچیس لوگ تو ضرور ہوں گے بی بی۔"

وہ الجھ سی گئی۔ "میرا وہاں جانا ضروری ہے پری؟ اگر میں نہ جاؤں تو کیا ہو؟"

"پتا نہیں۔" وہ رائے دینے سے ہچکچانے لگی۔ "آپ کو بے بے نے کہا تھا پندرہ منٹ تک چائے کے لیے آ جائیں۔"

"یہ کوئی چائے کا وقت بھی تو نہیں۔" وہ سیدھی کھڑی ہو کر شیشے کے سامنے آ گئی۔ اسے کوئی خاص کمپلیکس تو نہیں تھا لیکن اتنے اہتمام سے اتنے سج دھج کر آنے والے لوگوں کے سامنے اسے خوامخواہ اپنی کم مائیگی چبھنے سی لگتی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نے بالوں کو درست کیا۔ پاؤں میں سینڈل کسے۔

"کیا مہمان کمرے میں پہنچ چکے ہیں؟"

"اب تک تو پہنچ چکے ہوں گے جی۔"

وہ ہچکچاتی اس کے ساتھ چلی آئی۔ ابھی ابھی ہال کے اس کونے میں بے بے اور بیلا نے تمہارا روزنہ کھولا تھا۔

اور اب گڑھی کی ساری رونقیں سمٹ کر ہال میں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتی داخل ہوئی تو کمرہ بھرا بھرا سا تھا۔

پھر بھی مہمان ابھی تک کمروں سے آ جا رہے تھے۔ گو موسم اتنا سرد نہیں رہا تھا۔ لیکن بے بے آتش دان سے بہت نزدیک بے شمار لوگوں کے ہجوم میں تنہا اپنے بیمار گھٹنوں کو آگ کی گرمی سے سینک رہی تھیں۔ اس کے اندر کے اجنبی سے خوف نے اسی تنہائی کا شکر منایا۔ وہ تیزی سے چلتی آتش دان کے پاس ہی آ گئی۔ بے بے اس کو دیکھ کر کھل سی اٹھیں اسے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ وہ اسی کی طرح کے سارے ہارے ورجے کے مہمانوں کی پذیرائی کے لیے موجود ہیں۔ وہ جواباً مسکرا دی۔

"آپ کے ہاں تو خوب رونق ہے آج۔"

"ہاں ماشاءاللہ۔" ان کے چہرے پر خوشی کی سرخی دوڑ گئی۔

"آپ ان سب کو جانتی ہیں۔"

"سب کو تو نہیں۔" انہوں نے ایک نظر مجمع پر ڈالی۔ ان ہی کی نگاہ کے تعاقب میں اس نے ہال میں دمکتے چہروں اور چھلکتے لوگوں کو دیکھا۔ لوگ گروہوں میں تقسیم تھے۔ وہ دو چار چار کے جتھے بنا کر وہ سب بہت خوش تھے اور خوشی کا اظہار وہ بلند بلند اور اونچے قہقہوں سے کر رہے تھے۔ اسے بھی ان خوشیوں کا سوا گت کرنا تھا۔ وہ دلچسپی سے اس کمرے کی خوشیوں کو بڑھتے دیکھتی رہی۔ اٹینڈ کرنے والے لوگوں میں سے کسی نے اس کے ہاتھ میں بھی پیالی تھما دی تھی۔

مہمان آہستہ آہستہ کمرے میں آتے اور اپنی پسند کے لوگوں میں شامل ہو رہے تھے۔

لیکن ان سب میں وہ کہیں نہیں تھا۔ چائے کا گھونٹ بھرتے اس کی نگاہ بار بار ہجوم کی طرف اٹھتی لیکن وہ 'وہ لوگ نہیں تھے۔ وہ ان کو پہچانتی بھی نہیں تھی۔ بے بے اپنے خیالوں میں غرق بہت دور پہنچی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں ان میں سے وہ لڑکی کون تھی۔ اسے ہر لڑکی کو دیکھ کر شبہ گزرتا شاید یہی وہ ہو۔ وہ سب ایک جیسی تھیں۔ بہت زیادہ اجلی بنی سنوری اور سجی ہوئی۔

گڑھی عیسٰی خان کا یہ ہال کسی ماڈرن سوسائٹی کے پارٹی ہال سے مختلف نہیں لگ رہا تھا۔ بلند بانگ قہقہے، شور، ہنگامہ، پیالی پرچ کی کھنک، بجتے کانٹوں کا آہنگ، ہال کی تمام آرائشی وغیر آرائشی روشنیوں میں دمکتے ہوئے رنگین چہرے۔ وہ فرداً فرداً ہر شخص کی شکل دیکھتی آنکھ جھکا لیتی۔

پھر اچانک جیسے ہال میں روشن جلتے بلب مدھم ہو گئے۔

اپنے اس تصور کے بچکانہ پن پر خود اس کو بھی ہنسی سی آئی۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔ وہ اپنے دراز قد کے ساتھ مسکراہٹوں سے مزین رات کی اس چائے کے لیے مکمل طور پر تیار تھے۔ رات کی تھکن اور سفر کی گرد کا ان کے سراپا میں کہیں کوئی شائبہ نہیں تھا۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک اچٹتی سی نظر ہال میں موجود مہمانوں پر ڈالی۔ وہ اچٹتی سی نظر بیلا پر بھی پڑی اور گزر گئی۔

ناشنا سا۔ اجنبی۔ نامہرباں نظر۔

جیسے بادل کا سایہ دھوپ میں تپتی بستی پر ایک جیسا عکس پھیلاتا لمحے بھر میں گزرتا نکل جاتا ہے۔

بیلا کا دل بند سا ہو گیا۔ اس کا خیال تھا ان کی گھومتی ڈھونڈتی نگاہ ایک لمحے کے لیے اس پر ضرور رکے گی۔ ان کے چہرے کی سنجیدگی اور آنکھوں کی مسکراہٹ کوئی ایک فقرہ ضرور کہنا چاہے گی۔ خواہ اس فقرے کی طوالت ایک سیکنڈ ہی کی کیوں نہ ہو۔

لیکن انہوں نے جیسے کسی کو ان سب میں کھو جانا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی کسی اور کی تلاش کی تھی۔

حالانکہ وہ اس نظر کے لیے بھی تیار تھی اور اس سے ٹھنڈی نظر کے لیے بھی۔

لیکن پھر بھی جیسے سردی کی ٹھنڈی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی کو کپکپا گئی۔ اس نے چپکے سے بے بے کی طرف دیکھا۔ انہوں نے رد کیے جانے کے اس لمحے میں اس کو پکڑا تو نہیں۔ وہ تو خود بھی غالباً "رد کیے جانے کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔"

وہ چند قدم اٹھا کر ہال کے مرکز میں لٹکتے شینڈلیئر کے نیچے آ گئے۔

پھر جیسے ان کو جس کی تلاش تھی اس کو انہوں نے پا لیا۔

ان کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ وہ ہجوم میں جگہ بناتے مجمع کو چیرتے سیلابی پانی کی طرح بڑھتے جا رہے تھے۔

اور ان کے رکتے قدموں کے تعاقب میں اس کی پلکیں اٹھیں۔

اور ان کے رکتے قدموں کے تعاقب میں جم گئیں۔

واقعی وہ ان سب سے جدا تھی اور ان میں سب سے نمایاں۔

ہنستی مسکراتی۔ موتیوں ایسے لڑی دار دانتوں کی جگمگاہٹ سے جیسے سب کچھ خیرہ ہو گیا۔ خود سپردگی کے سے انداز میں وہ ان کے سامنے رک کر کچھ کہہ رہی تھی۔

اتفاق سے ان کی اس طرف پشت تھی' وہ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ نہ سکنے کے باوجود سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔

اب ہیروں کی طرح جگمگاتی آنکھوں نے کیا سنا تھا جو جھلملا بھی تھیں اور قہقہہ بھی لگا اٹھی تھیں۔

راج ہنس ایسی غرور سے تنی گردن کس وقت اس طرح تن سکتی ہے۔ وہ کون سے رس ٹپکاتے فقرے ہیں جو آپ کے وجود کو یہ اعتماد اور تناؤ بخشتے ہیں۔

پھر جیسے سارا منظر پلٹ گیا۔

کسی نے گرم چائے کی ایک اور پیالی اس کو پیش کی تھی۔ لیکن اس کے پہلے گھونٹ کے بعد ہی وہ ایک دوسرے میں گم ہو چکے تھے۔ وہ دونوں اب اکٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ سب ساتھ آئے تھے لیکن شاید مختلف جگہوں سے ان کا تعلق رہا تھا۔ وہ بہت ساری باتوں پر شدید حیرت کا اظہار کرتے "شدید خوشی کا یا شدید بیزاری کا۔ ان کے انداز میں ہر طرح کی شدت تھی۔

کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اس کی طرح اداس اور رنجیدہ نہیں تھا۔ وہ سب خوشیاں لوٹنے نکلے تھے۔ گڑھی عیسٰی خان میں خوشیاں ڈھونڈنے کی غرض سے آنا اور رونق کمانے کے لیے آنے میں بہت فرق ہے۔

اور یہ سارا نقصان تمہیں اس لیے اٹھانا پڑتا ہے کہ تم بار بار اس فرق کو بھلا دیتی ہو بیلا بی بی۔ اس نے خود کو بروقت ٹوکا۔

"یہ دانیال کے دور پار کے عزیز ہیں۔" بے بے نزدیک سے گزرنے والے گروپ سے اس کا تعارف کرانے لگیں۔

"پہلے ہمارا خیال تھا اس کی بہن کو خان گل کے لیے مانگنے کا۔ وہ جو نیلے کپڑوں والی ہے۔ آہاں۔" بے بے نے تنبیہ کی۔

"گردن گھمائے بغیر دیکھو۔ دانیال خان اس بات پر خفا ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مہمانوں کو چڑیا گھر کے جانوروں کی طرح نہیں دیکھنا چاہیے۔"

"اور یہ گلابی ساڑھی میں کون ہیں؟"

بے بے نے اپنی ہی کی گئی نصیحت بالکل بھلا کر آنکھیں سیکڑ کر اور ماتھے پر ہاتھوں کا چھجا بنا کر غور سے دیکھا۔

"ارے ہاں یہ تو دانیال کے کسی دوست کی بیٹی ہیں۔ دانیال کے تو دوست بھی اس کے باپ کی عمر کے ہوتے ہیں۔ اچھی ہے بے چاری عشیریں کے ساتھ پڑھتی تھی۔ پھر اس کی منگنی ہو گئی اور یہ جو ساڑھی والی ہے نا۔ جس کی کمر کھلی ہوئی ہے۔ یہ عدیلہ کی امی ہیں۔ ساتھ میں عدیلہ کی خالہ ہیں۔ ان کے ساتھ جو آدمی ہے ان کا مجھے نہیں پتا۔ ہمارے ہاں تو قریبی عزیزوں میں بھی پردہ داری ہوتی ہے۔ میں کسی کو کیا پہچانوں؟"

غالباً "آج کی یہ بے پردگی انہوں نے دانیال خان کے اصرار پر کی ہو گی۔

دانیال خان بڑے مہذب مہمان نواز تھے۔ اس بات کا اس محفل سے پہلے کبھی پتا نہ چل سکتا تھا۔ وہ ایک ایک ڈش بڑے اصرار سے مہمانوں کے آگے لیے لیے پھر تے۔ وہ بہت خوش تھے۔ معلوم نہیں کتنی مدت بعد ان کی اس بستی میں یہ رونق اتری تھی۔ اتنے بہت سے اور اتنے بے تحاشا قہقہے اس سے پہلے اس نے نہیں سنے تھے۔

ان کے اٹھنے پھرنے گھومتے رہنے سے باتیں کرنے سے بے تحاشا خوشی ٹپکی پڑ رہی تھی جیسے کسی کے بے حد خوبصورت ساتھ کا احساس آپ کے انگ انگ میں مستی بھر دیتا ہے۔

وہ مدلیہ خٹک کے آگے پیچھے تھے۔

تھوڑی سی توجہ وہ مہمانوں کو دینے کے بعد پھر اس کے گرد منڈلانے لگتے۔

یہ کتنی عجیب سی چیز ہے کہ ایک آدمی کا ساتھ ساری دنیا کی ساتھ سے اچھا لگتا ہے۔ دنیا کتنی حقیر حقیر کتنی بے مزہ کتنی بے معنی سی ہو جاتی ہے۔ اس وقت دانیال خان ان سارے واقعات کی تفسیر لگ رہے تھے ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر۔ محض ایک شخص۔ ایک تعلق۔

کتنی مرتبہ وہ اس کونے کر بیلا کے نزدیک سے گزرے۔ کتنی مرتبہ وہ بیلا کے نزدیک بچھی کسی کرسی پر بیٹھے کسی سے بات کی پھر اٹھ گئے۔ ان کی کبھی غلطی سے بھی نگاہ اس کی طرف نہیں اٹھی۔ وہ غالباً "اس کے وجود سے ہی بے خبر تھے۔

کبھی کبھی انسان اتنے ہجوم میں خود کو کتنا اکیلا اکیلا محسوس کرتا ہے۔ کتنا دکھی دکھی سا۔

کاش کوئی سڑک ایسی ہوتی جو اسے بھگاتے بھگاتے کسی ایسی منزل پر لے جاتی جو اس کی اپنی منزل ہوتی

ہے جہاں اس کا انتظار ہوتا۔ جہاں اس کا احساس ہوتا۔

اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ وہ چاہتی بھی نہیں تھی کہ اپنا مقابلہ ان امیر کبیر خواتین سے کر کے خود کو اذیت دے۔ لیکن پتا نہیں کیوں بار بار اس کو ایسے لوگوں کے مقابل آنا پڑ جاتا تھا جہاں اس کا وجود چھوٹا پڑ جاتا یا حقیر سا ہو جاتا۔

اس نے چپکے سے بے بے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے کسی واقف عزیز سے کسی اور واقف عزیز کی بڑی تفصیلی خیریت دریافت کر رہی تھیں۔

یہی موقع تھا۔

وہ چپکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے بے کی اس بے پناہ مصروفیت میں اس نے دامن بچایا اور مہمانوں کے ڈھیر سے بچتی ہال کے دوسری طرف گئی۔

گو اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی وہ وہاں ٹھہر نہ سکی۔ پتا نہیں کیوں اس کو احساس ہوا وہ تھوڑی دیر بھی ٹھہری تو خود پر قابو نہیں پا سکے گی۔ لیکن پھر بھی اس نے ہال دروازے سے نکلنے کے بجائے کونے سے نکلنے کو ترجیح دی۔ ہال کے مین دروازے سے نکلنے میں پکڑے جانے یا دیکھے جانے کا رسک تھا۔

وہ الٹے قدموں چلتی کونے والے دروازے سے باہر نکلی اور واپسی دروازہ بند کر کے کھلے آسمان کے نیچے آ گئی۔ ہال کا یہ دروازہ پارلی کیو کی غرض سے کھلے آسمان میں نکلتا تھا۔ اپنے کمرے تک جانے کے لیے اس کو دو سیڑھیاں چڑھ کر مین گیٹ کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ لیکن یہ دروازہ اندر کے مقابلے میں باہر سے کم خطرناک تھا۔ اکا دکا نوکروں کے سوا اس طرف کسی کی آمد و رفت بھی نہیں تھی۔ اس وقت جب ہال میں زندگی اتنی جوان اور خوش رنگ تھی کسے فرصت تھی کہ وہ کونوں کھدروں میں چھپ کر بھاگنے والی لڑکی کا تعاقب کرے۔ اس نے قدم اٹھائے کہ سڑک سے بھاگ کر اپنے کمرے کی طرف نکل جائے کہ اس کو احساس ہوا جلد بازی میں کسا ہوا سینڈل ایڑی سے اتر گیا ہے اس نے پاؤں سیڑھی پر رکھ کر کھسکتے ہوئے تسمے کو سرکا کر اپنی جگہ پر کیا۔ احتیاطاً "دوسرا سینڈل کسا۔ ہال کا مین گیٹ کھول کر غالباً "کوئی نوکر باہر آ رہا تھا۔ اس سے قبل کہ کوئی اس سے کسی قسم کی باز پرس کرتا یا لمبے لمبے سوالوں میں الجھاتا اس نے جلدی سے سیدھا ہو کر بھاگنے کی کی۔

لیکن۔

سیدھی ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

وہ اس کے عین سامنے اس کے تمام تر ارادوں کو ملیا میٹ کیے ڈٹے ہوئے تھے۔

بالکل اسی طرح جیسے اس نے انہیں ہال میں دیکھا تھا۔ مسرور 'شاداں' اندر سے پھوٹتی مسرتوں کے بوجھ سے سرشار۔

اس کی اٹھتی جھکتی پلکیں بوجھل سی ہو گئیں۔

"السلام علیکم۔" انہوں نے بڑی شادمانی سے اس کو پکارا۔ "کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔" بڑا سا گولا عین حلق کے درمیان اٹک گیا۔

"تم نے اندر مجھ سے بات کیوں نہیں کی؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ عجیب سے لہجے میں کیا ہوا شکوہ اس کا جی چاہا انہی کو واپس لوٹا دے۔ لیکن ابھی ابھی اس نے خود کو بہت سے درس دیئے تھے۔ اس میں شکوہ اپنی ذات کے لیے کچھ چھوٹا چھوٹا لگا۔

"ہوں۔؟"

"آپ بہت مصروف تھے۔ میں نے سوچا۔۔" وہ پھر اٹک سی گئی۔

"اور؟ اتنے دن کیا کرتی رہیں۔"

"کچھ بھی نہیں۔ بس، روز کی طرح۔"

"روز کی طرح۔ کیا؟ لوگوں سے لڑتی رہیں۔ انقلاب کے لیے جھنڈا اٹھا کر جلوس نکالتی رہیں ؟ اور میرے پیچھے کھانا پینا بند کر دیا تھا فاقے کرتی رہی ہو؟"

بلاشبہ ان کے لہجے کی اپنائیت نے اس کو لرزا سا دیا تھا۔ کتنی دیر وہ ان کے پھینکے ہوئے فقروں کی زد میں خاموش کھڑی رہی۔

"کیا ہوا ہے؟ کچھ اداس ہو؟"

"نہیں تو۔"

"جھوٹ پھر جھوٹ۔ میں نے آخری ملاقات میں جھوٹ کے بارے میں تم سے کیا بات کی تھی؟ بھول گئیں۔ ہیں نا؟"

"اچھا پھر کمرے میں واپس چلو۔ ابھی سب انجوائے کر رہے ہیں۔"

"میں تھک گئی ہوں۔"

"اور افسردہ بھی ہوں۔ کیا ہوا ہے ؟ بتاؤ۔"

"کچھ بھی نہیں۔ افسردہ تو نہیں ہوں۔"

"ہو۔ ہو تم افسردہ۔" انہوں نے اسی کے سے سنگین اور ضد بھرے لہجے میں تحکم سے کہا۔ "صرف میرے سامنے اعتراف کرنا نہیں چاہتیں۔ اور میں یہ اعتراف بھی کروا سکتا ہوں لیکن صرف مجھے یہ خوف ہے کہ جب تم پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہو گی تو کوئی راہ چلتا تمہیں اس حالت میں دیکھ نہ لے اور میں تمہارا یہی بت توڑنا نہیں چاہتا۔ فی الحال جاؤ اور سن لو۔ یہ میری خواہش ہے۔ التجا ہے اور حکم ہے کہ جب تک میرے دوست یہاں موجود ہیں تم ان کی ہر میٹنگ میں شرکت کرو گی۔ ضدی لڑکی" وہ اسی طرح ایڑیوں پر پلٹ کر دوبارہ ہال میں گم ہو گئے۔

وہ پتھر کے کسی بے جان مجسمے کی طرح کتنی دیر ساکت سی کھڑی رہی۔

اندر ہال خوب گرم تھا اور قہقہہ زار۔

باہر کی روش پر ٹھنڈ بھی بڑھتی جا رہی تھی اور ویرانی بھی۔

جب تک ان کے مہمان موجود ہیں اس کے لیے حکم ہے کہ وہ ان کی دلجمعی سے خاطر مدارات کرے گی۔

لیکن فی الحال انہوں نے اس کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔

اور آزادی کیسی نعمت ہے۔ اس نے کھلی فضا میں گہرے گہرے سانس لیے۔ کتنی دیر اس کھلے ہال کے تنگ سے ماحول میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ یہ شاید ہال میں موجود لوگ اس کے لیے تنگی کا باعث

ہو رہے تھے۔

اس نے فردا" فردا" بہت سے لوگوں کے بارے میں سوچا۔

وہ لڑکی جس کو خان گل کے لیے مانگنے کا ارادہ تھا۔ پھر وہ ارادہ ملتوی کیوں ہو گیا۔ اس کے بارے میں بے بے نے نہیں بتایا۔ اور وہ گلابی ساڑھی میں ملبوس بڑی سی عورت جس کی کمر پشت سے ایک بالشت بلاؤز سے باہر تھی اور سلیولیس بازو موٹی موٹی ٹانگوں کی طرح کندھوں سے لٹک رہے تھے۔ وہ خاتون دانیال خان کی ہونے والی ساس تھیں۔ بعض اوقات ہم پابندیوں، بندشوں میں پل کر عجیب سے ہو جاتے ہیں۔ بظاہر ایسا لگتا ہے جیسے ہم نے سوسائٹی کی ان پابندیوں کو خوشی خوشی قبول کر لیا ہے۔ لیکن جس دن ہمیں ان کے خلاف بغاوت کرنے کا موقع ملتا ہے، ہم اس کا بڑا بھونڈا سا اظہار کرتے ہیں۔ دانیال خان نے بھی ان بندشوں کے خلاف خٹک ہاؤس کی خواتین کا ساتھ قبول کر کے بے معنی سا اظہار کیا ہے۔ حالانکہ وہ انقلابی گروپ کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ خود اس کو جھنڈا اٹھانے پر طنز کرنے سے باز نہیں آتے۔

☼ ☼ ☼

اس کے ہاتھ میں پری کی دی ہوئی لسٹ تھی جس میں مہمانوں کے کمروں کی ترتیب کے سلسلے میں خود دانیال خان نے ہدایات جاری کی تھیں۔ کون سے کمرے میں کن لوگوں نے ٹھہرنا ہے۔ ان کے ساتھ کون اٹینڈنٹ ہے اور ضرورت کی کون سی چیز ہر حال میں ان کے کمرے میں موجود ہونی چاہیے۔

وہ لسٹ ہاتھ میں لیے رات ہونے سے پہلے جلدی جلدی ان کے کمروں کو فائنل کرتی پھر رہی تھی۔ مہمان ایک نظر گڑھی دیکھنے کے لیے پیدل نکل گئے۔ چونکہ وہ معزز رئیس مہمان تھے لہذا بستی کے قانون ان پر لاگو نہیں تھے۔ نہ انہوں نے چادریں اوڑھیں نہ علاقائی لباس پہنے۔ وہ جس طرح بیٹھے تھے شور مچاتے اور دھم کرتے پہاڑوں میں نکل گئے۔ اس کو ایک مرتبہ معذرت مل گئی۔

کہ اس کے ہاتھ میں لسٹ تھی اور اس کو بہت جلد ضروری کام نمٹانے تھے۔

"ہاں ہاں واقعی۔" بے بے نے اس کی معذرت کو فراخدلی سے قبول کر لیا۔ "اتنے مہمانوں کا کام نمٹانا آسان تو نہیں اور دانیال خان کو کیا پتا چلے گا کہ اتنے بہت سے لوگوں میں تم ہو کہ نہیں۔"

گویہ فقرہ کچھ خوشگوار طریقے سے کانوں نے نہیں سنا۔ لیکن وہ چپ سی ہو گئی۔

دانیال خان کے آس پاس ان کے مرد دوستوں کے کمرے تھے۔

رہائشی حصوں میں خواتین تھیں اور ان سب کے ساتھ نوکر تھے۔ مدیحہ خٹک کے کمرے میں میوزک کا خاص انتظام تھا کیونکہ وہ رات کو پسندیدہ ٹیپ سنے بغیر سو نہیں سکتی تھی۔ اس کی قیمتی اور میٹھی نیند کے لیے پاور فل امپورٹڈ فائر کا بندوبست تھا۔

وہ جب اپنے کمرے میں سونے کے لیے آئی تو مہمان اس وقت تک واپس نہیں آئے تھے۔ اور وہ رات کو سونے کے لیے لیٹی تو مہمان ٹی وی لاؤنج میں غارت گری مچا رہے تھے۔ خوشی، ہنگامہ، شور شرابہ، گڑھی اتنی جوان، اتنی تازہ دم کبھی نہیں لگی تھی۔ جانے ٹی وی لاؤنج میں اس وقت کون سا ہنگامہ برپا تھا۔ وہ فوری طور پر سو جانا چاہتی تھی ورنہ سحری پر جاگنا دشوار ہو جاتا لیکن جب بھی اس نے آنکھیں بند کیں، راج ہنس ایسی گردن اور ترتیب سے چمکتے ہموار دانت جھلملا کر اس کی نیند تباہ کر دیتے۔ اس کو زندگی میں کبھی کسی سے خوف محسوس نہیں ہوا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ عمر بھر لڑی تھی اور تنہا لڑی تھی۔ اور اب جیسے تنہا لڑتے رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

لیکن تنہائی میں یہ چھوٹے چھوٹے خوف انسان کو جینے بھی نہیں دیتے۔

کیا ہے؟ اس نے تکیے پر چت لیٹ کر سوچا۔ دنیا میں عدیلہ خٹک جیسی حسین اور پر اعتماد لڑکیاں اور بھی موجود ہیں بلکہ کچھ لڑکیاں تو عدیلہ خٹک سے بھی حسین رہی ہوں گی۔ وہ کسی بھی ایسی لڑکی سے حسد میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی تو اجیرن نہیں کر سکتی نا۔

وہ سوئی تو روشنیوں کے مسافر اندھیری گلیوں سے واپس نہیں آئے تھے۔

روشنیوں میں بھٹک کر اندھیروں میں راستہ ملتا ہے۔

یہ شاید وہی لوگ تھے۔ خوشیاں ان کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں اور وہ ہاتھ جھاڑے بے نیازی سے بھاگتے پھرتے ہیں۔

وہ سحری کے لیے آئی تو گڑھی کے ملازمین اور مہمانوں کے ساتھی ملازمین سحری کی ٹرے لیے کمروں کی طرف بھاگتے پھر رہے تھے۔ یہ بھی گڑھی کی روایتوں کا ایک حصہ تھا کہ سحری کے لیے تمام تر تیاری سحری کے وقت کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ چار پانچ قسم کے سالن رات ہی کو تیار ہوتے اور اب تو بہت نازک مزاج مہمان کمروں میں براجمان تھے' جن کو ان کی اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق کھانا مہیا کیا جا رہا تھا۔ سادہ روٹی' پراٹھا' آلو کا پراٹھا' آٹکل کا پراٹھا' گھی کا پراٹھا' خستہ خان ماہر انچارج تھے' ان سے کبھی بھول چوک نہ ہوتی۔

کھانے کے کمرے میں بے بے تنہا اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

بیشتر مہمانوں کا روزے نہ رکھنے والا فعل انہیں سخت ناپسند آ رہا تھا۔ ان کے بقول لوگ گڑھی میں سارا سال بھی روزے رکھیں تو پیاس نہیں ستاتی۔ یہاں بنوں میں۔

وہ ماضی کا کوئی قصہ اداسی سے سناتیں۔

"اور کسی سے کیا کہوں خود دانیال خان روزے رکھنے پر آئیں گے تو روزانہ رکھتے جائیں گے۔ جب دل نہیں چاہے گا تو اوندھے پڑے سوتے رہیں گے۔"

"کون کون رکھ رہا ہے روزہ؟" اس نے بے پروائی سے چائے انڈیلتے پوچھا۔ وہ جانتی تھی یہ بے بے کا پسندیدہ موضوع ہے۔ وہ نماز' حج' زکوٰۃ کسی بھی سلسلے میں کوتاہی پر باز پرس نہیں کرتیں' لیکن ہاں ایک روزہ۔ ان کا بس چلے تو بے روزہ دار کو یہیں جہنم واصل کروا دیں۔

"کیا پتا بچی۔ یہ نیا رواج پڑا ہے۔ کمروں میں چھپ کر سحریاں کھانے کا۔"

"کیا یہ مہمان عید تک ٹھہریں گے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

"ہاں دانیال بتا رہے تھے یہ لوگ گڑھی میں رمضان اور عید کے لیے آئے ہیں۔"

گویا ایک مہینہ تو کم از کم اس کو یوں لٹک کر گزارنا ہوگا۔ وہ مہمانوں کے مستقل قیام سے بوکھلا سی گئی تھی۔ یہ ان کے رتجگے تھے کہ صبح کوئی بھی جلدی نہ اٹھتا۔ ہاں مگر ایک عدیلہ کی ممی۔ وہ ان دنوں وزن گھٹانے کی فکر میں تھیں۔ روزوں کے درمیان ہی وہ ورزش کرتیں۔ کچھ مہمان بے روزہ دار تھے۔ ان کا ناشتا بھی دن چڑھے تیار ہوا پھر وہ کسی پکنک کی تیاری میں نکل کھڑے ہوئے۔

اس نے اپنے کمرے کی ضروری چیزیں سنوارتے دیکھا۔ وہ سب کے سب پورچ میں جمع تھے اور کہیں

جانے کے لیے شد و مد سے بحث کیے جا رہے تھے۔ اور ان میں سب سے الگ تھلگ اور جدا دانیال خان لاپروائی سے بیٹھے گھڑ سواری میں کسی غیر مرئی شے کی کھوج میں ان سب باتوں سے بے نیاز سے تھے۔

ان کے کندھے کے ساتھ لگے دوسرے کندھے پر عدیلہ خٹک کا پرس تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے بھی ایک دوسرے سے کتنے اجنبی' کتنے دور لگ رہے تھے ایک مرتبہ عدیلہ نے پلٹ کر ان سے کوئی بات کی لیکن وہ غالباً متوجہ نہیں تھے۔ ہر مرتبہ چونک کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا پھر بے دھیانی سے وادی میں دیکھتے کچھ سوچتے رہے اسے یہ تجربہ بڑا اچھا لگا۔

وہ کتنی اوپر سے ان سب کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سب کے سب دیکھے جا رہے تھے لیکن اس بات سے بے خبر کہ ان کو اس طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ گروپوں میں تقسیم تھے۔ اپنی پسند اور اپنی مرضی کے لوگوں کے بیچ قہقہے بکھیرتے ہنستے مسکراتے نت نئے پروگرام بناتے اور خوشی خوشی پروگراموں میں شریک ہوتے۔

پھر باری باری جیپیں آ کر کھڑی ہونے لگیں۔ سواریاں اپنی مرضی سے سواری پسند کر کے اگلی پچھلی سیٹوں کو رونق بخش رہی تھیں۔ یہ بڑا پر خطر راستہ تھا۔ یہاں صرف یہیں کے ڈرائیور گاڑی چلاتے تھے۔ اس نے دیکھا آہستہ آہستہ تمام لوگ مختلف جیپوں میں ٹھنس ٹھنس کر بھر چکے تھے۔ ہاں سوائے ایک دانیال خان کے جو رسم مہمان داری نبھانے آخری مہمان تک تنہا اور اکیلے کھڑے رہے لیکن کیسے عجیب میزبان کہ مہمانوں کے وجود سے بے خبر جیسے کسی آنے والی خوش قسمت گھڑی کے انتظار میں وقت کاٹ رہے تھے۔

حالانکہ وہ خوش نصیب گھڑی ان کے نزدیک تھی۔ وہ گردن اٹھائے ان کے نزدیک آئی کوئی بات بھی کی۔ غالباً یہی "تم نہیں بیٹھو گے۔"

انہوں نے مڑ کر کچھ کہا تھا۔ (ہاں تم بیٹھو)

اگلی گاڑیاں آہستہ آہستہ گیٹ کو جانے والے پھاٹک کی طرف چل پڑیں۔ عدیلہ خٹک کی گاڑی سے ہارن دیا جا رہا تھا لیکن وہ اسی طرح کھڑے تھے چپ چاپ اور خاموش۔ پھر جیسے کسی فیصلہ کن گھڑی میں انہوں نے ہاتھ میں پکڑا چھوٹا سا پتھر جھنجلا کر وادی میں پھینکا۔ کتنی دیر سکوت میں اس کو پتھر کے گرنے' گرتے رہنے کی غیر محسوس سی آواز کانوں میں آتی رہی۔ حالانکہ سب سواریاں زور شور سے ہارن دیتی موڑ کاٹتی ارتعاش پیدا کرتی گیٹ سے نکلتی چلی گئیں۔

وہ چپ چاپ اپنی کھڑکی سے دیکھتی رہی۔

کبھی کبھی ہمیں بڑا عجیب سا تصور آتا ہے۔ اس نے ایک لمبا اور گہرا سانس لیا۔

اس کو لگا وہ دانیال خان کے ہاتھ میں پکڑا ایک حقیر سا پتھر تھی جسے وہ اپنی دانست میں حقارت سے وادی میں پھینک کر خوشیوں کی تلاش میں روانہ ہو چکے تھے۔

کتنی دفعہ اس کا جی مچلا۔ وہ دوڑتی جائے اور خوشیاں مناتے اس قافلے میں شامل ہو کر زندگی کے ہنگاموں سے اپنا حق طلب کر لے۔

لیکن زندگی پر اس کا اتنا حق نہیں تھا۔

وہ ان میں سے نہیں تھی۔ ان سب کا رہن سہن' ان کا کلچر' زبان' بیک گراؤنڈ' شاید اب تو کچھ بھی مشابہ نہیں تھا۔ دنیا میں جو ان کو بہترین رفاقت مل سکتی تھی۔ وہ انہوں نے تلاش کر لی تھی۔ اب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنے آپ کو وہ اتنا کم مایہ، اتنا حقیر تو نہیں کر سکتی تھی۔

وہ جہاں کہیں بھی گئے تھے دن بھر کے لیے گئے تھے۔ یہ بات اس کو کسی نے نہیں بتائی لیکن یقینی تھی۔ لیکن جیبوں میں ان کی روانگی اس بات کی مظہر تھی کہ وہ آس پاس نہیں کہیں دور گئے ہیں۔ اب اس کے پاس وافر وقت تھا۔ وہ قیدی کے پاس جاتی تو پکڑے جانے کا رسک تھا۔

کمرے میں بیٹھی رہتی تو اپنی ذات سے وابستہ الجھنیں بڑھتی رہتیں۔

ہاں البتہ ایک شخصیت اس عظیم الشان اور دیو ہیکل عمارت میں ایسی بھی تھی جو اس کی طرح خود کو تنہا، اکیلا اور رد شدہ سمجھ رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ بے بے کے پاس جا بیٹھی۔

"ارے۔" وہ چونک گئیں۔ "تم نہیں گئیں۔ مجھے تو پتا چلا تھا سب جا رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ شاید سب چلے گئے ہیں۔ کوئی خاص کام تو نہیں ؟"

"کام۔ کون سا کام ؟ ارے ایسا کون سا خاص کام ہے ؟ تم ان کے ساتھ گئیں کیوں نہیں؟"

"روزے کی وجہ سے شاید۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"یا شاید مجھے ان کے ساتھ جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں کیا کرتی جا کر؟"

"پتا نہیں کس بات پر دانیال خان سے ذکر نکلا۔ وہ کہہ رہے تھے تم بھی ان کے ساتھ جاؤ گی۔"

"اچھا۔" اس کو جھنجلاہٹ سی ہوئی۔ دانیال خان نے ہمیشہ اس کی طرف سے فیصلہ خود ہی کر لیا اور خود ہی سمجھ لیا کہ اس پر عمل درآمد بھی ہو گا۔ بہر کیف یہ چونکہ اس کی روزگار کی ذمے داریوں میں سے تو نہیں تھی۔ کہ دانیال خان از خود فیصلہ کر لیں۔

بے بے خاموشی سے ہال کے کونے میں اپنی مخصوص مصروفیت کا شکار تھیں۔

وہ چپ چاپ ان کے پاس بیٹھی ہال کے اتار چڑھاؤ پر غور کرتی رہی۔ گزشتہ رات یہاں ایک شور برپا تھا۔ اتنے بڑے ہال کا ایک ایک کونا مصروف اور ایک ایک کنارہ کسی خوشگوار سی مصروفیت میں مگن تھا۔ پھر اچانک یہاں سناٹا چھا گیا۔ اور اس شور مچاتے کودتے ہال کے ایک کونے میں آخر وہی دونوں تھیں۔ خاموش اور سنجیدہ، پتا نہیں خاموشی اور طوفان کے یہ اتار چڑھاؤ اس گھر میں کب تک رہیں گے؟

☆ ☆ ☆

افطاری کے لیے آج کوئی خاص اہتمام ہو رہا تھا کیونکہ مہمانوں میں سے پتا نہیں ایک یا دو آدمیوں کی آج سالگرہ تھی اور سالگرہ کا دن اچانک ان میں سے کسی کو یاد آ گیا تھا۔ افطاری کا اہتمام تو بذات خود ایک سالگرہ کاؤنٹر لگتا تھا جس میں موم بتیوں اور کیک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ختہ خان کے ماہر ہاتھوں نے کئی منزلہ کیک بیک کیا۔ اور لوگ مختلف گروپوں میں بیٹھ کر شام کے پروگرام تشکیل دینے لگے۔

میوزیکل چیئرز۔

پارسل گیم۔

غبارہ پھلائی کا مقابلہ۔

بے بے نے اس کے کمرے میں پیغام بھجوایا تھا کہ کسی مہمان کی آج سالگرہ ہے لہٰذا تم فوراً "ہال میں آ جاؤ۔ معلوم نہیں اس فوری بلاوے سے بے بے کا مقصد کیا تھا۔

وہ وہاں بحیثیت منتظم بلائی جا رہی تھی یا مہمان کی حیثیت سے۔

اس نے اپنی ذات کو ایک مشین کی طرح ڈھال لیا تھا۔ جب تک مہمان ہیں، کبھی بھی کسی وقت بھی اس کا بلاوا آ سکتا ہے۔ اس نے بالوں کو سادگی سے ربڑ بینڈ میں کس کر جو گرز چڑھا لیے ہو سکتا ہے کوئی بہت اہم کام اس کو بھی سرانجام دینا ہو۔ روزہ کھلنے میں گولہ چھٹنے میں بہت تھوڑی سی دیر باقی تھی۔

ہال میں جمع خواتین و حضرات میں بڑا جوش خروش پایا جاتا تھا۔ وہ سب کے سب کسی خاص ٹیم کی تشکیل میں بڑی محنت صرف کر رہے تھے۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ خود تو بے بے کے ایک حکم پر دوڑتی یہاں تک آ گئی تھی لیکن بے بے پتا نہیں کہاں تھیں۔

اس نے ان کو ان کے ہر مخصوص آتش دان کے پاس جھانکا۔

پہلا، دوسرا، تیسرا، پھر وہ رک سی گئی۔

تیسرے آتش دان کے پاس بیٹھے جوڑے کو وہ ہزاروں میں سے پہچان سکتی تھی۔

اٹھے ہوئے پف والے کندھوں کے خوبصورت سفید ہاتھ آتش دان کی گرمی سے گلابی گلابی ہو رہے تھے۔ وہ بے بے کی مخصوص نچلی سیٹی پر خوشدلی سے ہنس رہی تھی۔ جب مخاطب آپ کی ہر بات میں دلچسپی لیتا ہو جب آپ کا کہا ہر لفظ، ہر انداز اس کے لیے پسندیدہ ہو اور آپ کو اس کا علم بھی ہو تو لفظوں کی پھوار خود بخود برستی رہتی ہے۔ اچھے اچھے الفاظ، خوبصورت مذاق، برجستہ جوابات۔

مریلہ خٹک گفتگو کے ہر فن سے مالا مال تھی۔

شاید اسی لیے مخاطب کا دل لوٹے لیے جا رہی تھی۔

وہ بے بے کی کھوج میں نزدیک سے گزری اور رک گئی۔

تھوڑی دیر کے لیے صراحی سے انڈیلے پانی کی طرح اس کا قہقہہ قلقل کرتا گونجا۔ لیکن پھر اچانک اس کے چہرے پر نخوت سی آ گئی۔

"کیا ہم لوگ ان کی سیٹ پر نہیں بیٹھے؟" اس نے آہستگی سے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا تھا۔

بہت دیر سے ہلکے ہلکے مسکراتے اور آگ کے شعلوں پر نظریں جمائے دانیال خان چونک گئے۔

"آں۔" انہوں نے چونک کر مخاطب کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ اور اس کے کھڑے ہونے میں وہ کون سا انداز تھا۔ کون سا رنگ تھا جس نے ایک فاتحانہ سی چمک ان کے چہرے پر بھی پیدا کر دی۔

وہ کون سا میدان جیت آئے تھے۔

کسی کو شکست دے کر حاصل ہونے والی خوشی کا ہر رنگ ان کا چہرہ اجاگر کر رہا تھا۔

انہوں نے شکست دی تھی کون سا میدان جیتا تھا۔ یہ کچھ ان کے چہرے پر تحریر نہ تھا۔

اس کی آنکھوں میں کتنی دیر تک ان کی نگاہوں کی تیزی حائل رہی۔ پھر انہوں نے جس تیزی سے سر اٹھایا تھا اسی تیزی سے واپس کر لیا۔ وہ چہرے پر لکھی تحریریں آسانی سے پڑھنے نہیں دیتے تھے۔

وہ بھی کھلے میدان میں نہیں جیتی تھی۔ اس نے بھی اپنا رخ جہاں بھی ممکن نظر آیا ادھر ہی گھما لیا۔ مہمان خواتین میں سے کسی نے اس کا رخ اپنی طرف گھومتا دیکھ کر روانی سے گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا تھا۔ وہ جانتی تھی، یہ بدماغ بوڑھی بوڑھی خواتین اندر سے بہت بھولی اور بچے کی طرح معصوم ہوتی ہیں۔

"یہ کون ہے دانیال ؟" آتش دان کے پاس سے آتی آواز میں شک کا سانپ سرسرایا تھا۔

اس نے کتنی دیر کان لگا کر سننے کی کوشش کی، دانیال خان کیا جواب دیں گے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہ ہمارے گھر میں ملازمت کرتی ہیں۔ یہ اس گھر کی منتظمہ ہیں۔ یا یہ کہ ان کو بے بے کی دو سراہٹ کے لیے بلایا گیا ہے۔"

وہ بوڑھی خاتون اس سے لاس ویگاس کے بارے میں باتیں کر کے معلومات میں اضافہ کر رہی تھیں۔ لیکن افسوس وہ اپنی عادت کے بالکل برعکس ان کی طرف متوجہ نہیں ہو سکی۔ اس کے کان دانیال خان کے جواب کی طرف لگے تھے۔

"آپ ان کی سیٹ پر کیوں بیٹھ گئے۔ یہاں تو وہ بیٹھی تھیں۔" سرگوشی سے ذرا ہی بلند آواز پھر اونچی ہوتی جواب میں سناٹا ہی رہا۔

"آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

وہ کیسے دیکھ رہے تھے؟ کاش وہ دیکھ سکتی۔

"ہاہ ہاہ۔" بھاگتی دوڑتی ایک لڑکی نے جیسے آتش دان کے پاس کی ساری فضا کا اسرار ملیامیٹ کر دیا۔

"میں نے تیاری کر لی۔" اس کے ہاتھ میں رنگین کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔

"ٹھیک نو بجے پارسل گیم شروع ہو گی۔ ازراہ کرم کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے بہت محنت کی ہے۔" وہ پارسل لہراتی ہال کے اس کونے تک بھاگتی اعلان کرتی گئی۔

"یہ حمرا کیسی چونچلی ہے؟"

"ہاں اس عمر میں لڑکیاں عموماً ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

"اچھا" آپ جاگ گئے۔" قلقل کرتا قہقہہ پھر صراحی ایسی گردن سے آزاد ہوا۔

اسے اس لڑکی کا کھلکھلا کر ہنسنا بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس کا ہر انداز زندگی سے بھرپور اور صاف تھا۔

وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی۔ دانیال خان کی بہت سی باتیں بہت عجیب رنگ لیے ہوتی ہیں کچھ بعید نہیں وہ اس کے وہاں کھڑے رہنے پر باز پرس شروع کر دیں۔

روزہ اور سالگرہ کی رسم ساتھ ہی ہوئی۔

بے بے افطار کے وقت آگئیں۔ بہت تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ نماز کے لیے چلی گئیں۔ پھر ان کی معذرت آگئی۔ وہ اس محفل میں شریک نہیں ہو سکیں گی۔ ان کے سر میں سخت درد ہے۔ ہاں البتہ بیلا کے لیے حکم ہے کہ اگر اس کی طبیعت ٹھیک ہو تو وہ سرِ شام محفل چھوڑ کر نہ اٹھ جائے۔

اس نے سخت ناگواری سے محفل کی طرف دیکھا۔

اس کی طبیعت تو خراب نہیں تھی لیکن اس محفل کو برداشت کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ ہال میں فرشی نشست کے لیے کشن اور تکیے پھینک پھینک کر پھیلا رہے تھے۔

"کیوں پری" آخر بے بے نے یہ کیوں کہا ہے کہ میں اس محفل سے اٹھ کر نہ جاؤں۔"

"وہ کہتی تھیں آپ کو محفل کی رونق میں حصہ لینا چاہیے۔"

اس نے پلٹ کر محفل اور اس کی رونق کو دیکھا۔ لوگ بھاگتے دوڑتے نشستیں سنبھال رہے تھے۔ ہر دم لیے دیے رہنے والا اور جھاڑ جھپٹ کا موڈی شخص بھی اس وقت محفل میں موجود تھا۔ نہ صرف موجود تھا بلکہ میزبان اور رنگ لیڈر کی حیثیت سے اس کو مرکزی نشست ملی تھی۔

"ہر ایک کو سزا پوری کرنا پڑے گی۔ آپ بھی سن لیں دانیال بھائی۔"

"ہم تو پہلے ہی سزا بھگت رہے ہیں جناب۔" ان کے لہجے کی معنی خیزی ہال میں موجود کسی سے چھپی نہ رہی۔

"نماز پڑھ کر آنے والے افراد اپنی نشستیں سنبھال لیں۔"

حمرا کی نصیحت کے باوجود جن لوگوں کو اس محفل سے دلچسپی نہیں تھی' وہ نہیں آئے۔

وہ ایک طرف کھڑی خاموشی سے واپسی کے راستے اپنا رہی تھی۔

ہال میں ہنگامہ عروج پر تھا۔ ہر شخص اپنی بولی بول رہا تھا۔ وہ کسی بھی دروازے سے باہر نکل جائے اس کو کون پوچھے گا؟

چھت سے فرش تک بلند پردوں کے پیچھے چھپی۔ وہ بے بے کی یا پری کی حمرا کی۔ کسی کی بھی نصیحت سننے کے موڈ میں نہ تھی۔

پردوں کے پیچھے چھپا دروازہ اس کے ہاتھ بڑھا کر کھولنے سے پہلے بند ہو گیا۔

"یہ راستہ صحن کی طرف جاتا ہے۔ آپ کے کمرے کو دو دروازہ سوٹ کرے گا۔"

یہ آواز۔ یہ لہجہ۔ بلاشبہ وہ اس کو بھولی تو نہ تھی۔

اس نے بے ساختگی میں پردے چیر کر درمیان سے سر نکال لیا۔

"خان گل۔ تم کب آئے؟ میں نے تو تمہیں دیکھا بھی نہیں۔"

"پری نے آپ کو بے بے کا نہیں میرا ہی پیغام دیا تھا۔ ویسے بھی آپ کی پسند کے لوگ ہال میں موجود ہوں تو ہم نظر ہی کہاں آتے ہیں۔" وہ اپنی طبیعت کے مخصوص انداز میں ہنس رہا تھا۔

بیلا کی پور پور میں خوشی جاگ اٹھی۔ اچانک اس کو لگا یہ اجنبی اجنبی ناواقف اور روکھا روکھا سا ہال اس کا ساتھی بن گیا ہے۔ وہ اس کا ہمدرد دوست' ناخوشگوار لمحوں میں خوشیاں بخشنے والا جانے کہاں سے آیا تھا۔ کہاں سے ٹپکا تھا۔ لیکن اب یہاں تھا اس چھت کے نیچے۔ "آپ کیسی ہیں؟"

"آؤ لوگ پارسل گیم کھیل رہے ہیں۔ تم شرکت کرو گے؟"

اس نے ایک طائرانہ سی نظر مجمع پر ڈالی۔

"اخاہ۔ یہاں تو دانیال خان کے داحوں کا میلہ لگا ہے۔ میرا یہاں کیا کام؟"

"میں بھی یہاں موجود ہوں۔ حالانکہ میں تو دانیال خان کے داحوں میں سے نہیں۔"

"لیکن آپ بھاگ بھی تو رہی ہیں۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "اب نہیں بھاگوں گی۔"

"وعدہ؟" اس نے اپنا لہجہ اور انداز بالکل بدل دیا۔ "ہمیشہ کے لیے۔"

"دیکھو نہیں۔"

"آپ لوگ دروازے پر ہی کھڑے رہیں گے؟" دانیال خان کا سرد سا لہجہ اس کی پشت سے ابھر کر اس کو کپکپا گیا۔ "میں ان کو باہر نکلنے سے روک رہا تھا۔" وہ جواباً ہنس دیا۔

"شاید ان کو روکنا اب مشکل نہ ہو۔" اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مل چکے تھے وہی لاعلم تھی۔ معلوم نہیں اس کو پتا کیوں نہیں چلتا۔ اس گھر میں کیا ہوتا ہے۔ کب ہو جاتا ہے۔

وہ ہنس دی۔ خوامخواہ ہی۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے یونہی ہنستے رہو۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے ان کی معنی خیزی پر غور کیا تھا لیکن پھر بات پلٹ گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خان گل پردوں کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ تو ہجوم نے نعرہ مار کر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اس کو بڑا اچھا لگا۔ اگر آپ کی پسندیدہ شخصیت اوروں کو بھی پسند ہو تو بظاہر تو وہ سیاسی لیڈر سی بن جاتی ہے لیکن بہرکیف اچھی ہوتی ہے۔

"اب تو آپ ٹھہریں گی۔" ان کی مسکراہٹ بڑی شفاف بڑی وسیع تھی لیکن پتا نہیں کیوں اس کو احساس ہوا ان کی آنکھوں سے ہلکا سا زہر اتر رہا ہے۔

"خان شاد گل۔ میری یہ خواہش کبھی نہیں رہی کہ آپ میری مداحوں میں سے ہوں۔ لیکن مجھے یہ غلط فہمی ضرور تھی کہ آپ میری کسی معمولی خواہش کا احترام کریں گی۔ لیکن آپ نے دونوں مرتبہ اسے رد کر کے اچھا کیا۔ میں مغالطے میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ تشریف لے چلیے اب آپ بور نہیں ہوں گی۔" انہوں نے ہاتھ پھیلا کر اسے راستہ دیا۔

ان کے لہجے کی کڑواہٹ نے لمحہ بھر پہلے کی ساری خوشی کرکری کر دی۔ اس کا جی چاہا وہ جھنجھلا کر چیخنے چلائے انہیں برا بھلا سنائے۔ کیا وہ اس کی یہ معمولی سی خوشی بھی برداشت نہیں کر پاتے۔ یہ وہی شخص تھے نا جو اس کو ہجوم میں احکامات دے کر بھول بیٹھا تھا۔

"لیکن آپ تو خوش تھے نا۔ آپ کے پاس آپ کی پسندیدہ ترین شخصیت بیٹھی تھیں۔ اور آپ۔۔" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کا خیال تھا وہ ہاتھ گھما کر اس کو تھپڑ مار دیں گے۔

لیکن ان کے چہرے کے سارے رنگ ایک دم بدل گئے۔

"ہاں۔ خوش تو میں تھا۔" انہوں نے الفاظ چبا چبا کر کہے۔

"میرے ارد گرد میری پسندیدہ شخصیات؟؟" جیسے انہوں نے خود کو بھی یقین دلایا۔ "چلو یہ بھی مان لیا۔ اب آپ اپنی طرف آئیں۔ کیا یہ جائز اور مناسب ہے کہ جب ایک چھت کے نیچے بہت سارے لوگ آپ کے ساتھ کے لیے منتظر ہوں۔ جب وہ خوشیوں کو آپ کے ساتھ بانٹنا چاہتے ہوں تو آپ انہیں قطعی رد کر کے اور مردم بیزاری سے اٹھ کر چلی جائیں؟"

اس نے کوئی تلخ سا جواب دینے کے لیے سر اٹھایا ہی تھا کہ انہوں نے اسی رو میں اس کا فقرہ اسی طرح کاٹ دیا۔

"کبھی کبھی انسان دوسروں کو خوش رکھنے کی خاطر بھی ہنس کر دکھا دیتا ہے۔"

"میرے خوش یا اداس ہونے سے محفل کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" اس نے مدہم سے قنوطی لہجے میں کہا۔ "میں ویسے بھی تھک گئی ہوں اور مجھے سحری کے لیے دوبارہ اٹھنا ہے۔"

وہ اس کے ستے ہوئے مایوس سے چہرے کو ایک نظر دیکھتے رہے۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ یہ تو تین مختلف دلائل ہیں۔ اور آپس میں ملتے بھی نہیں۔ اب کیا مصیبت آئی ہے؟" اس نے خاموشی سے سر نیچے کر لیا۔ کبھی اسے خوف محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی عقاب کی سی تیز نگاہ اس کی آنکھوں سے اتر کر اندر تک چھید کر رہی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے اسرار عام بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"افسوس۔" نے گہرے پچھتاوے سے کہا۔ "تم ہمیشہ ہجوم میں ہونے کا فائدہ اٹھالیتی ہو۔ ورنہ ان مایوس بھرے فقروں اور ٹھنڈے سانسوں کے لیے میں تمہیں مزا چکھا دیتا۔ خیر۔ بہت پہلے تم نے مجھ سے

وعدہ کیا تھا۔ جب تک میرے مہمان یہاں رہیں گے تم ان کو کمپنی ضرور دو گی۔ میری قدر افزائی کے طور سہی۔ ضروری نہیں کہ مہمانوں کو تمہاری ضرورت ہو۔ یہ ضرورت کسی اور کو ہو سکتی ہے، مجھے بھی ہو سکتی ہے یا نہیں ہو سکتی۔"

وہ ایک دم ٹھٹک گئی۔

دانیال خان کشادہ دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے جیسے اس کی بکھری ہوئی متلون طبیعت سے کوئی نیا رنگ کھوج رہے تھے۔ جس ہجوم میں شمولیت کرنے کے لیے انہوں نے سینکڑوں دلائل دیئے تھے بیسیوں التجائیں کی تھیں۔ اس سے قطعی رخ موڑے وہ ایک نہایت غیر اہم ممبر پر اپنا وقت برباد کر رہے تھے۔

"تم بار بار اپنے وعدے توڑ دیتی ہو۔" ان کی آواز میں افسوس کا سا شائبہ تھا جیسے آج وہ اس کو اس کی ساری غلطیوں کا احساس دلا کر ہی رخ پلٹیں گے۔ خواہ ہجوم میں قیامت آ جائے۔

اور ہجوم۔

حمرا کے جوش و خروش سے پھیلائے ہوئے ریشمی دھاگوں میں الجھا بچوں ایسے کھیل کے شروع ہونے کا منتظر تھا۔ وہ سب کے سب اونچی آواز میں چلاتے ایک دوسرے سے الجھتے 'بے ایمانیوں کے الزامات لگاتے مکمل طور پر ایک دوسرے میں گم تھے۔ سوا اس حسین لڑکی کے جس کی گردن کا خوبصورت خم اور ڈائمنڈ کے ٹاپس والے کانوں کی پوری توجہ اس دروازے کی طرف تھی جہاں ایک ہی منظر جیسے رک گیا تھا۔ ہاں وہ اس جیسی تو ہرگز نہیں۔ اس نے لمبا سا سانس کھینچ کر جیسے سینے کا سارا تکدر دھو دیا۔ پھر بے جا مقابلہ بازی انسان کو خود ہی نیچا دکھانے لگتی ہے۔ وہ کسی سے پیچھے رہ جانے میں ڈرتی تو نہیں تھی۔ لیکن اس بے تکے مقابلے میں دانیال خان خواہ مخواہ اس کی دلدہی کی خاطر ڈالتے رہتے تھے۔ وہ ابھی تک اس کے فیصلے کے منتظر تھے۔

وہ اس کو حکم بھی دے سکتے تھے۔ زبردستی بھی کر سکتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان حکم اور زبردستی کے رشتے ہی کیا تھا لیکن وہ ان اختیارات کے استعمال کے بجائے نہایت دوستانہ ڈیل کر رہے تھے۔

"سوری۔" وہ خفیف سی ہو گئی۔

"واقعی۔ میں نے لوگوں کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ آئی ایم سوری۔"

"خیر لوگوں کے بارے میں تو آپ ضرورت سے زیادہ ہی سوچتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم وہ لوگ نہیں۔ ن کی خاطر آپ اعلان بغاوت کریں۔ جنگ چھیڑ دیں۔ چلیے خیر آپ نے احساس تو کیا۔"

اس نے دروازے کے درمیان سے دیکھا۔

خان گل کے داخلے سے ہجوم میں نیا ولولہ آ گیا تھا۔ لوگ اس کو گھیرے شکوے شکایتوں کی لمبی کہانیاں لہ رہے تھے۔ حمرا کے جوش و خروش میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کے درمیان ایک ایسا شخص آ بیٹھا تھا ں نے محفل کا رخ ہی بدل ڈالا تھا۔ بڑوں میں بچوں والا خروش تھا۔ منٹ منٹ پر غصہ ایک دوسرے پر پڑتا۔ حتیٰ کہ جگہ کی پسندیدگی کے لیے لگتا تھا۔ ابھی ایک دو قتل ہوں گے اور لاشیں تڑپتی نظر آئیں گی۔

یہ خان گل کا کمال تھا۔ اس کو لوگوں کی خاطر خوش ہونا آتا ہے۔ وہ لوگوں کو خوش کرنا بھی جانتا ہے۔ اور کتنی اچھی سی سوچ ہے کہ ایسا اچھا آدمی آپ کا دوست ہے۔ اسے آپ کی بہت پرواہ ہے۔

حرا بے تابی سے رنگ برنگے کاغذوں میں لپٹا پارسل یعنی والا بنڈل سینے سے لگائے گھٹنوں کے بل چلتی اور کہنیوں سے ہجوم کو دھکے دیتی قطار کو درست رکھنے کے احکامات جاری کر رہی تھی۔ خان گل اپنی طبیعت کی خاص بے ایمانی میں بار بار اس کی قطار خراب کر کے ساری محفل تتر بتر کر دیتے۔

وہ اس سارے منظر میں ایک خان گل سے ہی شناسا تھی۔ بچوں کی طرح اس نے خان گل کی پناہ میں ہجوم کا ساتھ دینا چاہا۔ خان گل جھگڑالو عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر حرا سے آمادہ جنگ تھا۔

"کیوں بیٹھوں صرف یہاں۔ میں تمہارا منگیتر تو نہیں جہاں تم نے بٹھا دیا۔ بیٹھ گیا۔ جب اٹھا دیا اٹھ گیا۔"

"اللہ کرے کوئی ڈھنگ کی لڑکی تمہاری منگیتر بھی نہ بنے۔" اس نے جل کر بد دعا دی۔

"لالا۔" اس نے چلا کر پروٹیسٹ کیا۔ لالا دروازے پر تصویر کی طرح جمے اس ساری بدمزگی کے رفع ہونے کا انتظار کرتے لگ رہے تھے۔

"آپ آیئے تشریف رکھیے۔" خان گل نے اس کو کھڑا دیکھ کر احتراماً اپنی سیٹ پیش کی۔ واقعی وہ ہنس دی۔

یہ آدمی جون بدلنے میں ماہر ہے۔ ابھی کتنا چھوٹا اور بیوقوف سا بچہ وہ چھوٹی سی لڑکی سے جھگڑ رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم مودب ہو گیا اور سنجیدہ۔ پولیسٹر سے پھولا ہوا سلکی کشن اس کے قدموں کے سامنے گرا۔

"یہاں بیٹھیے" اس نے اپنے سے بالکل نزدیک۔ اس کی جگہ بناتے ہوئے جیسے عوام میں اس کی وقعت اس کی قدر دانی کا احساس اجاگر کیا۔

"آپ یہاں بیٹھیے۔ یہ حرا نہایت بے ایمان ہے۔ آپ اس پر نظر نہیں رکھیں گی تو یہ اس معصوم پر تیر چلا جائے گی۔"

"ہچ۔ اوہو۔ بڑے معصوم۔" حرا کو لڑنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ آپ ادھر بیٹھیں۔ کیا نام ہے بھلا آپ کا؟"

"لیلیٰ۔ اوہ نہیں شاید بیلا۔" خان گل اب دوبارہ بالکل سنجیدہ تھا۔ "اور تمہیں اب تک ان کا نام نہیں آتا۔ کیوں بھئی۔ تم لوگوں کا باقاعدہ تعارف نہیں ہوا ؟"

خان گل نے ایک پھلجھڑی ۔ لیکن کڑی نظر دانیال خان پر ڈالی۔ وہ خود لاکھ غیر ذمے دار سہی۔ لیکن دوسروں کو ان کی ذمے داریوں میں کوتاہی برتنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

دانیال خان اس شیطانی چکر میں اپنے لیے کسی اچھی جگہ کی تلاش میں نگاہ گھما رہے تھے۔ وہ خان گل کے دانستہ دلی زبان میں ادا کیے فقروں سے بے خبر تھے یا بے خبر نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بیلا کو لمحے بھر کے لیے ان پر رشک آیا۔

سب لوگوں نے اپنے گھٹنے سرکائے اور کھسک کر ان کے لیے جگہ کشادہ کی۔

لیکن قرعہ فال عدیلہ خٹک کے نام نکلا۔ اور وہ ان خوش قسمتوں میں سے تھی جن کے قرعے نکلتے ہی رہتے ہیں۔ وہ دونوں اس گول دائرے میں بیٹھے اتفاق سے ان دونوں کے بالکل سامنے آ گئے۔

خان گل ذرا سا لیے دیئے انداز میں بیٹھنے کی کرنے لگا۔ اس کا گمان تھا وہ دروازے سے باہر نکل جائیں گے۔ کیونکہ کسی محفل میں دانیال خان کی موجودگی خوش طبعی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اس نے اپنی

آواز آہستہ کر لی۔ اپنی حرکات پر کنٹرول کر لیا۔ اب زیادہ گفتگو وہ سرگوشی کی صورت میں بیلا کے کانوں میں لنڈا رہا تھا۔

عدیلہ کی آنکھیں اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھیں۔ جگمگاتی اور غرور حسن سے جھلملاتی۔

آپ کے حسن کے غرور میں اس وقت اور اضافہ ہوتا ہے جب اس کو جائز طور پر سراہا جائے۔ اس کو اس کا اصل مقام دیا جائے۔ اور یہ اس کے لیے کوئی معمولی اعزاز نہیں تھا۔ وہ اس کے بالکل نزدیک بیٹھے تھے۔ شاید دانستہ یا نادانستہ طور پر۔ اس کی دلکش ہنسی کا ترنم بڑھ گیا۔ اس نے گردن گھما کر ان سے شکوہ کرتی زبان میں کچھ کہا بھی لیکن اتنی دور سے' بالکل سامنے ہونے اور مکمل توجہ کے باوجود کچھ بھی نہیں سن پائی۔

لیکن پھر خان گل نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ وہ بیلا سے باری باری سب کا تعارف کرا رہا تھا اور غالباً "براہ راست دانیال خان کو ان کی کوتاہی کا احساس دلا رہا تھا۔

لیکن در حقیقت وہ اتنے قصوروار بھی نہیں تھے۔

وہ ان کے بار بار اصرار اور خواہش کے باوجود ان کے درمیان بیٹھی ہی نہیں تھی۔ وہ زیادہ تر مصروف رہتی اور اپنی زندگی الگ تھلگ ہی گزار رہی تھی۔ وہ تو شاید اس وقت بھی یہاں سے ہوا ہو چکی ہوتی اگر خان گل اس کو بروقت پکڑ ہی نہ لیتا۔ اس نے سب کا تفصیل سے تعارف کرایا تھا۔ اس کا اپنا تعارف بھی بڑی وضاحت میں ہوا۔ اس کی تعریف و توصیف میں کچھ اچھے اور کچھ طنزیہ فقرے اس نے اپنی طبیعت کے مخصوص رنگ میں دبے دبے اچھالے بھی۔ وہ ہمیشہ دانیال خان کے سامنے دھیما پڑ جاتا تھا۔ لیکن اس نے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ کون ہے اور یہاں کیوں ہے؟

پروگرام شروع ہوتے ہی رفیق نے اعلان کر دیا۔

"میوزک نہیں بجے گا بلکہ میں خود گاؤں گا۔"

"ہاں۔ کیونکہ یہ پہلا اور آخری موقع ہو گا آپ کی demonstration کا۔"

اس نے خان گل کے فقرے اور لوگوں سے اپنی کمر کر کے دیوار کی طرف توجہ کر لی۔

بیلا کا خیال تھا ابھی پشتو زبان میں وہ مخصوص سا سر بلند کرے گا۔ لیکن اس کے خیال کے بالکل برعکس اس نے پنجابی ماہیا چھیڑ دیا۔

کنگاں دی ڈھیری اے
اک واری مل جاویں
ساڈی جوگی والی پھیری اے

اس کو طفیل نیازی کا انداز چرانے کا شوق زیادہ تھا بہ نسبت اس کے کہ وہ لوگوں کی ٹیم میں دلچسپی لیتا وہ جو خوبصورت سا بنڈل پہنچتے ہی بچھو کی طرح گھبرا کر دوسرے کی طرف اچھال دیتے۔

اسے آج گانے کا موقع مل گیا تھا۔ خان گل کے بقول۔ پھر جانے کب ملے اور ملے تو کوئی سنے بھی کہ نہ۔

وہ نہایت فرصت سے ایک ایک لائن پر بڑا وقت لگا رہا تھا۔ لوک ورثہ کے گلوکاروں کی طرح منہ آسمان کی طرف اٹھا کر اور سر چھت سے بلند کر کے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ درمیان میں کہیں اس کا سُر ٹوٹا یا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ سانس لینے کے لیے رکا تو لوگوں نے پارسل کی دھجیاں بکھیرنی شروع کر دیں۔ پارسل فزا کے ہاتھ میں تھا اور وہ کانپ رہی تھی۔ جیسے فیصلہ پاکستان پینل کوڈ کے مطابق ہونا ہے۔

"یہ بتایئے زندگی میں پہلا تھپڑ آپ نے کس کو مارا؟"

"مجھے مارا ہوگا۔ اور کسے۔" فزا کے کزن نے بڑی بے اعتنائی سے کہا۔

"جھوٹے۔ تم مجھے مارتے تھے کہ میں تمہیں۔"

رفیق نے جھگڑا بڑھتے دیکھ کر پھر سُر اٹھایا۔

بیڑی دا ملاح کوئی نہ
اک واری مل جاویں
جندڑی دا وساہ کوئی نہ

ہنگامے نے شدت اختیار کرلی۔ رفیق کی دیرینہ خواہش اسی کے ساتھ ہی ہنگامے میں دم توڑ گئی۔ وہ اکیلا حلق پھاڑتا رہا۔ اس کی کوئی بھی سننے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ لوگ، لوگوں سے ان کے پسندیدہ اشعار دریافت کر رہے تھے۔ دوستوں کے نام معلوم کر رہے تھے۔ کسی بے نام عزیز کو کوئی پیغام روانہ کر رہے تھے۔

ایک قرعہ دانیال خان کے نام بھی کھلا تھا۔ ان سے پوچھا گیا تھا۔ بھلا بتایئے شعر میں اظہار کیسے کیا جاتا ہے؟ انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سکون سے پڑھا تھا۔

تمہارے بعد میرے زخم نارسائی کو
نہ ہو نصیب کوئی چارہ گر دعا کرنا

عدیلہ نے بے ساختہ سا پہلو بدلا۔ پتا نہیں وہ شرمائی تھی کہ ہچکچا گئی۔ اس نے تیزی میں پلٹ کر دانیال خان کی آنکھوں میں کھوجنا چاہا۔ یہ اظہار کس کے لیے تھا۔ اور یہ اتفاق ہی ہے کہ چونکہ باری ان کی تھی اس لیے جواب کے منتظر سبھی لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان کی نگاہیں بے رنگ، بے معنی تھیں جیسے لب پہ آئی ہے دعا پڑھی تھی اور بیزار ہوگئے تھے۔

کمال ہوگیا بھئی۔" خان گل نے دھیمی سی آواز میں اس کے نزدیک منمنا کر کہا۔

"میاں تو بڑے بڑے رنگ بدلے گئے ہیں۔ آج کل سورج کس طرف سے نکلتا ہے۔ معاف کرنا میں تو سحری کے لیے اٹھتا نہیں۔"

وہ اس کے کان میں کوئی بات کہتا اور بالکل سامنے بیٹھے دانیال خان کی توجہ کھینچ لیتا وہ اتنی دور بھی نہیں تھے کہ خان گل کے وقفے وقفے سے انڈیلے فقروں کے حصے ان کے کانوں میں بالکل ہی نہ پڑ رہے ہوں۔

پھر تھوڑی دیر بعد ماہیا کی بے سری آواز اور لوگوں کی جھنجھناہٹ میں وہ لاتعلقی سے پوچھتا۔

"کیا بات ہے؟ آج عدیلہ خٹک کو بطور خاص بڑی لفٹ مل رہی ہے۔"

"پلیز خان گل۔ یہ تم عورتوں کی طرح اسکینڈل کیسے بنا لیتے ہو؟" اس نے بیزاری سے کہا۔ محفل میں اچانک اس کی عدم دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ آخر وہ کیوں ایک بے ہودہ سا وعدہ کر آئی ہے اور کیوں وعدہ ایفائی کے لیے اپنی زندگی خراب کیے دے رہی ہے۔

"غضب خدا کا۔ یہ اسکینڈل ہے۔ کل کو جو زمانہ کہے گا وہ میں آج کہہ رہا ہوں۔ میں آخر کب تک

خاموش تماشائی بنا بیٹھا رہوں گا۔" پھر اس نے ہیروئن کے رشتے داروں والا لہجہ بدل کر اس کے کان میں صاد کیا۔

"دانیال خان ایک زمانے میں عدیلہ سے شدید نفرت کرتے رہے ہیں۔ بلکہ وہ اس قسم کی عموماً" ہر لڑکی کو ناپسند کرتے ہیں۔"

"دیکھو خان گل پسند ناپسند بدلتے تو دیر نہیں لگتی۔" اس نے چابک دستی سے پارسل آگے سرکایا اور ہنس دی۔ وہ اس کے سامنے ہی بیٹھے تھے اور اتفاق سے ان کی نشست کا انداز ایسا تھا کہ وہ جب بھی خان گل کے دبے دبے فقروں پر دبی دبی ہنسی ہنستی ان کی نگاہوں کی سیدھ میں آجاتی۔ لیکن وہ اپنی خوشی پر قابو نہیں پا سکتی تھی۔ جاتے وقت وہ اس سے روٹھ کر چلا گیا تھا اور آیا تھا ایسے جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی خفگی کی بات، آئی ہی نہیں تھی۔

"اوہ۔" جیسے وہ طویل اور معنی خیز خاموشی کے بعد کسی اہم نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔

"میرے دماغ میں گھنٹی بجی ہے لیلیٰ عربی۔"

"اوفوہ۔ خان گل۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "وہ گھنٹی خوامخواہ بجی ہے۔ ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند کی چیز لے لے۔ اب تم اس کو اسکینڈل کہو یا فیئر کہو۔"

"لیکن میری دوررس نگاہیں کچھ اور سمجھ رہی ہیں۔ کچھ اور دیکھ رہی ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا ہے میرا کچھ اور سمجھنا اور دیکھنا، سمجھا جا چکا ہے۔ اور یہ اس طرح نہیں جس طرح تم سمجھ رہی ہو۔"

"تمہاری اس معنی خیز گفتگو سے میرے پلے تو کچھ بھی نہیں پڑا۔" اس نے اکتائے سے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ یہ تو میں سمجھ ہی گیا ہوں۔ تم اتنی عقلمند نہیں ہو اور یہی تمہاری سب سے بڑی خوبی ہے کہ تم بیوقوف ہو۔"

"میں پروٹیسٹ کر کے اٹھ رہی ہوں۔" اس نے بہانے سے کلائی کی گھڑی دیکھی جیسے اچانک کوئی ضروری کام اسے یاد آگیا تھا۔ اور تیزی سے اٹھ کر چلی گئی۔

بس اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ اس وعدے کی جتنی اہمیت تھی اس نے نبھا دی۔

اب اس کے لیے ان حالات میں محفل مرکز نگاہ بن کر لوگوں کو ہنسانا خوش کرنا اس کے اختیار رات سے باہر تھا۔ یہ ظاہرداریاں، یہ تصنع، فریب کی مسکراہٹیں۔ وہ ان کھینچی ہوئی لکیروں پر بہت دور تک نہیں چل سکتی تھی۔

رات زیادہ ہوگئی تھی اور اسے اس یا اُس بہانے تو اٹھنا ہی تھا۔ گڑھی میں رہتے رہتے اسے بھی گڑھی والوں کی طرح رات کے دس بجے ہی دو بجے کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے ایک نظر بے بے کے کمرے کی طرف جھانکا۔ وہ ابھی تک سوئی نہیں تھیں۔ رمضان کے سلسلے کی طویل عبادتوں میں مصروف۔ اس کی ان سے کوئی خاص بات نہیں ہوسکی۔ مہمانوں کے کمرے بے رونق سے تھے کیونکہ رونقیں تو اس ہال میں جلوہ فگن تھیں۔ جہاں بہت سے احباب اپنی اپنی ذات کے اندر جانے کون کون سی خواہشوں کے جہان چھپائے کون کون سے ارادے رکھتے تھے۔

گڑھی کے یہ مصروف اور ہنگامے سے بھرپور دن دو آدمیوں کے اضافے سے مزید سج گئے۔ شام میں شیریں پہنچی اور اس سے اگلے روز مرجان نثار نے شامل ہو کر محفل لوٹ لی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ سرجن نثار کی شخصیت تھی یا ان کی بے تحاشا مقبولیت کہ ان کے اترتے ہی بوڑھوں کے پرانے مرض جاگ اٹھے اور غیر بوڑھوں کی زندگی میں ایک دم تازگی آگئی۔

حمرا کو بڑی جلدی جوش آجاتا تھا۔ اس نے خان گل اور سرجن نثار کی دلچسپ جوڑی پر نہایت خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرا کو بتایا تھا۔ "میں ان دونوں کو ڈین مارٹن اور جیری لوئیس کہتی ہوں۔ اف یہ دونوں اتنی مزے کی باتیں کرتے ہیں۔"

وہ بے بے کی خدمت میں وحشت بستہ ان کی لایعنی گفتگو میں گم زندگی گزارنے کے انداز پر غور کر رہی تھی کہ اس نے حمرا کے ان فقروں سے سنا کہ سرجن نثار بھی پہنچ گئے ہیں۔

پتا نہیں کیوں پہلے دن سے آج تک اس کو سرجن نثار کا ساتھ باقی تمام لوگوں کی نسبت بے تکلف اور سہل سا لگتا تھا۔ ان کے سامنے بہت زیادہ سوچ کر نہیں بولنا پڑتا۔ وضعداری نہیں نبھانی ہوتی اور اپنی زبان کے مزے الگ۔

اس نے دیکھا حمرا ان کا ہاتھ گھسیٹتی بے بے تک لائی تھی جیسے کسی مجرم کو مظلوم کے سامنے لا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ خاموش تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ مسکراتے 'بے بے کی خیریت دریافت کرتے اور اس کا اپنا تفصیلی حال معلوم کرتے رہے لیکن پیالہ سے یہ چھپا نہیں رہ سکا وہ ہنگامہ جو ان کی آمد کی خوشی میں منعقد ہو رہا ہے شاید ان کو زیادہ پسند نہیں آرہا۔ یہاں گڑھی وہ اکثر سکون کی تلاش میں آتے ہیں۔ گو اس کا اعتراف انہوں نے کسی کے سامنے نہیں کیا لیکن وہ خاموش تکلم میں جو ان دونوں کے درمیان ایک دوستی کی حد میں داخل ہو گیا تھا 'بتا دیتا تھا وہ ہمیشہ پریشانیوں 'الجھنوں سے گھبرا کر اس بستی میں آجاتے ہیں۔ لیکن اس طرح نہیں کہ پریشانی اور الجھنیں آپ سے پہلے بستی میں موجود ہوں۔ چھوٹے نوجوانوں کا گروپ پروگراموں میں ردوبدل کے لیے کمربستہ ہو گیا۔ بے بے کے اعصاب پر یہ شور ناگوار گزرتا تھا لیکن دل شکنی انہیں کبھی گوارا نہیں رہی تھی۔

وہ سرخ قیمتی پتھروں کی تسبیح۔ ہاتھ میں پکڑے آہستہ آہستہ گھماتی ہنگامہ سرد ہونے کا انتظار کرتی رہیں۔ پھر ہنگامہ ٹلا تو وہ دانیال خان سے ملاقات کی غرض سے ان کی اسٹڈی میں چلے گئے۔ شیریں کمرے میں سے نکلی نہیں اور وہ اتنی تنک مزاج ہو رہی تھی کہ کسی کی جرات نہیں ہوئی کہ اسے چھیڑ کر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالے۔

☆ ☆ ☆

اور کتنی پدت سے وہ فارغ ہو گئی تھی۔

اس ماہ کی تنخواہ وصول پاتے ہوئے اسے بڑا عجیب سا احساس ہوا اس پورے مہینے سوائے مہمانداری کے مزے لوٹنے کے اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ عنقریب وہ تمام کام یہاں ختم ہو جائیں گے۔ جس مقصد کے لیے وہ یہاں بلائی گئی تھی اور کوئی شخص آپ کو اتنا اہم تو نہیں سمجھتا کہ محض اپنے گھر ٹھہرانے پر آپ کو تنخواہوں سے نوازتا رہے اور بالفرض وہ یہ احسان کرنے پر آمادہ ہو بھی جائے تو آپ کی عزت نفس کے لیے بھکاریوں والا رویہ کس قدر مضحکہ خیز ہو گا۔

اس نے مہمانوں کے کمرے دیکھنے کی کوشش کی۔ خستہ خان کے معاملے میں دخل اندازی کی۔ اور اسٹڈی میں پیغام بھجوا کر آئندہ کے پروگرام کی ہدایات کا حکم نامہ جاری کرنے کی گزارش کی۔

لیکن کوئی منصوبہ 'کوئی پروگرام جیسے اس کے لیے رہ ہی نہیں گیا تھا۔

وہ شگوفوں سے لدے باغات کے مہک بھرے جنگل میں ان دو سیڑھیوں پر خاموشی سے جا بیٹھی جہاں نیچے چھتوں کا پانی جھاگ اڑاتا تھا۔ اور جو اس کی پسندیدہ ترین جگہ رہی تھی۔ اور اب یقیناً "اسے کوئی فیصلہ کر ہی لینا چاہیے۔ کوئی عارضی جگہ آپ کی منزل نہیں ہوتی۔ اگر آپ ان رسمی ٹھکانوں پر دل ٹکا کر بیٹھ رہیں تو یہ آپ ہی کا قصور ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب آپ کو شدت سے منع کیا جاتا ہے۔ اور دماغ کی پکار کی طرف بار بار دھیان دینے کو کہا جاتا تھا۔ اسے لگا اس ویران جنگل میں کوئی اور ذی روح بھی ہے۔ اسی کی طرح بھٹکتا ہوا۔ اسی کی طرح مایوس۔ منزل کے نشان سے بے خبر۔

وہ جھاگ اڑاتے 'پتھروں سے سر پھوڑتے پانی کے دوسری طرف تھے۔

وہ اس کو دور سے کہیں دیکھ کر اس طرف آئے تھے اور اپنی مخصوص شگفتہ طبیعت میں بھی مسکرا رہے تھے۔

اور ہاں یقیناً "یہ سرجن نثار ہی ہو سکتے تھے۔ وہ مسکراہٹ جو زخم سہتے بھی آتی ہے اور زخم سہتے بھی۔ تجربوں کی بھٹی میں پگھلی اس مسکراہٹ سے گڑھی عیسیٰ خان کے باسی بالکل نابلد ہیں کہ ان کے تو زخم بھی ان کے ذاتی نہیں۔ ادھار 'مانگے کے 'دکھاوے کے۔ ناموس کے۔

وہ جواباً "مسکرا دی۔ بالکل ویسے ہی۔

وہ پتھروں سے گزرتے 'پانی کے چھینٹوں اور اس کے کرنٹ سے خود کو بچاتے آبشار کے دوسرے کنارے آبیٹھے۔

"آپ اداس ہیں پیالی بی بی۔"

"حالانکہ ایسا میں آپ کے لیے سوچ رہی تھی۔" اس نے بے ساختگی میں کہا۔

انہوں نے نہایت سنجیدگی سے آسمان کی چوٹیوں ایسے بلند درختوں کی شاخ پر بیٹھے خوش رنگ پرندے کو بہت غور سے دیکھا۔ پھر جیسے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ میں تو ہوں اداس۔ اور اس لاکھوں کروڑوں مربع میل کی دنیا میں 'میں صرف تم پر اعتبار کر کے کہہ سکتا ہوں کہ میں اداس ہوں۔ بہت زیادہ۔"

وہ چپ ہو گئی۔ دکھوں کو کریدنا اور زخم پر نشتر مارنا دو مختلف باتیں ہیں۔ دوسری چیز آپ کو غم سے نجات دیتی ہے 'لیکن پہلی چیز آپ کو اور بھی پریشان کر دیتی ہے۔ وہ پتا نہیں کیا چاہتے ہیں۔ زخم کھولنا یا سینا۔

"اور آپ مجھ سے پوچھیں گی نہیں؟ وجہ دریافت نہیں کریں گی؟" انہوں نے ایک بے نام سی اداسی کی گرفت میں آتے کہا تھا "ایک مایوس آدمی دوسرے مایوس شخص کو بہت دور سے تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسی لیے شاید میں آپ کو ڈھونڈتا یہاں تک آیا ہوں۔"

آج ان پر تو طبیعت کا موڈ طاری تھا۔ ایسے ایسے کتنے موڈ اس پر بھی طاری ہوتے تھے۔

وہ ہنس دی۔ "آپ اپنی اداسی کی وجہ بتائیں گے یا میری اداسی کی وجہ پوچھیں گے؟"

"باری باری۔" انہوں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"تو چلیے 'پہلے میں پوچھتی ہوں 'کون ہے وہ۔"

"کون 'کون ہے؟" اس حملے پر وہ بوکھلا سے گئے۔ ان کے گمان میں تھا 'وہ اس سادہ سی لڑکی کے ساتھ دو چار الجھی الٹی باتیں کر کے دل کا بوجھ اتار کر چل دیں گے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ براہ راست نشانے پر حملہ کر دے گی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"چلیے چھوڑیے سرجن نثار۔ ان رسمی تمہیدوں اور لمبی تقریروں کے بجائے یہ بتایئے وہ کون ہے؟"

وہ جھینپ سے گئے۔ "مسئلہ یہ نہیں کہ وہ کون ہے۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ 'وہ' کیوں نہیں ہے جو...؟"

"تو وہ شیریں ہے۔" اس نے سکون سے فیصلہ کیا۔

"آپ اس کو کتنی مدت سے جانتے ہیں؟" اس نے ان کو کٹہرے میں کھڑا کر لیا تھا اور اپنی طبیعت کے عین مطابق سوالوں کی یلغار میں ان کو گھیرے دے رہی تھی۔

"ایک مدت ہو گئی اب تو۔"

"اور مسئلہ کیا ہے؟ وہ خود یا کوئی اور؟"

سرجن نثار پرسکون سے ہو گئے۔ کوئی شخص اگر آپ کو لمبی چوڑی کہانی سنانے کے جھنجھٹ سے نکال لے اور ان کہی باتیں آپ کی آنکھوں سے پڑھ پڑھ کر خود ہی ازبر کر لے تو قلب کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ آپ نے ذرا سے آدمی پر بھروسا نہیں کیا۔

"محبت بڑا ذلیل جذبہ ہے بیلا بی بی۔ آپ کتابوں میں اسے پڑھیں تو یہ آپ کو طاقتور لگتا ہے جیسے آپ اس کی مدد سے دنیا کے دھارے بدل ڈالیں گے لیکن جب یہ واردات انسان پر خود گزرتی ہے تو نڈھال کر دیتی ہے۔ بزدل بنا دیتی ہے۔"

"محبت صرف ان لوگوں کو بزدل بناتی ہے جو اس میں تنہا جلتے ہیں۔"

انہوں نے ایک نظر غور سے دریا کے بھاگتے پانی کی طرف دیکھتی لڑکی کو دیکھا۔ "اور آپ یقین کریں محبت میں تنہا کوئی جل ہی نہیں سکتا۔ محبت ہمیشہ ایک سے زیادہ لوگوں کو خاکستر کرتی ہے ہاں مایوس ضرور کرتی ہے اس لیے کہ راستے میں ہمالیہ سے سخت اور آسمان سے بلند پہاڑ ہیں۔ جب آپ ان رکاوٹوں کو پار نہیں کر سکتے تو آپ کا جی چاہتا ہے آپ ان سے اپنا سر پھوڑ لیں۔"

اسے لگا شاید کسی دن سرجن نثار بڑی آسانی سے ان پتھروں میں سے کسی ایک پتھر سے ٹکرا جائیں گے۔ کتنی دیر وہ اپنی جگہ اپنے آپ سے الجھتے رہے۔

"وہ کون سی رکاوٹیں ہیں۔ کون سے پتھر ہیں۔ آپ اس گھر میں کتنے مقبول ہیں۔ کون کون آپ پر جان نہیں دیتا۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ آپ کا استقبال تو یہاں موجود مہمانوں نے بھی کس شدت سے کیا تھا۔"

"یہ جو لوگ جان دیتے ہیں ناں' ایک دن بڑی آسانی سے لے بھی لیتے ہیں۔ ان کا جان دینا غیر مشروط ہے۔ یہ صرف محبت کرتے ہیں اس وقت تک جب تک آپ ان کے کائی زدہ جمے ہوئے پتھروں کو ہاتھ نہ لگائیں لیکن جیسے ہی ان کی روایتوں کا زنگ کھرچا جاتا ہے یہ بلبلا اٹھتے ہیں۔ وہ بھی جو ان روایتوں کا حصہ نہیں بہادری سے کچھ نہیں کرتے۔ صرف ریت میں منہ دے لیتے ہیں۔"

بادلوں سے بھری وادی اچانک مہت بوجھل ہو گئی۔ کہانی کے اس حصے سے وہ بالکل بے خبر تو نہیں تھی۔ یہ الگ بات کہ بیبے کی بات کی پاسداری نبھانے میں اس نے منہ سے بھاپ بھی نہیں نکالی لیکن یہ ایسی ہی ایک دوسری کہانی کا آغاز ہونے والا ہے جس کا انجام چیتوں کا بھوکا پیٹ یا کسی جدید ہتھیار کی پیاس ہو گی۔

"اگر آپ کو اور شیریں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔ کیا شیریں راضی ہے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"پتا نہیں۔" سرجن نثار کے مختصر سے جواب میں شیریں کے لیے جو بے پناہ پردہ داری تھی اس نے اس

کی آنکھوں کو گیلا سا کر دیا۔ ایک چھت کا احساس۔ ایک سائبان کا تصور۔

محبت دراصل اسی احساس کا نام ہے۔ باقی سرجن نثار کا سارا فلسفہ بکواس ہے۔

وہ چپ ہو گئی۔ شاید ایسی ایک الجھی کہانی سے وہ بھی بے خبر نہیں تھے۔

جو بھی اس بستی میں آتا ہے وہ ایک دن اس کہانی کو ضرور سن لیتا ہے اور یہ کہانی ان لوگوں کو تو ضرور سنائی جاتی ہے جن کے لیے عبرت پکڑنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔

"کیا سردار دانیال خان اس بات سے آگاہ ہیں؟"

"اونہہ۔ سردار دانیال۔" انہوں نے اپنے عزیز ترین دوست کو ایک تحقیر سے پر اونہہ سے رد کر دیا۔

وہ اس اونہہ کا کوئی مطلب نہیں نکال سکی۔ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی۔

انہوں نے نہایت معنی خیز لہجے میں ڈرامائی سا وقفہ دے کر کہا تھا۔

"سردار دانیال خان بہادری کا محض سمبل ہے۔ وہ درحقیقت اتنے بہادر نہیں۔ وہ تو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکے' میرے لیے کیا خاک جھک ماریں گے۔"

وہ چپ ہو گئی۔ اس نے تو انہیں ہمیشہ بہادر پایا تھا۔ دلیر' حالات کے سامنے ڈٹ جانے والا 'نڈر۔

"اگر شیریں چاہے تو۔ آپ جانتے ہیں عورت میں بہت طاقت ہے۔"

"اور اس سے بات کرنے کے لیے آپ پشاور جائیں گی؟" وہ طنز کر رہے تھے۔

"ارے آپ کو پتا نہیں' شیریں تو صبح ہی آ گئی تھی۔ لیکن جب سے اپنے کمرے میں بند ہے۔"

"کمال ہے بھئی۔" سرجن نثار کے صحت مند چہرے پر سرخی کی لہر سی آ گئی۔ "اور دیکھو ان بیوقوف ہواؤں نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔"

وہ اپنا مذاق بنا رہے تھے' ہنس رہے تھے۔ وہ بہت کہہ چکے تھے۔ بہت کھل چکے تھے۔ پھر شاید ان کو واپس اپنے خول میں چھپ جانا زیادہ محفوظ لگتا ہو۔

"اس سے بات کرنا بالکل بے کار ہو گا۔" وہ اس لہجے کے فیصلہ کن حصے میں کھڑے ہو گئے۔

"وہ تو کمزور سی بزدل لڑکی ہے۔ جو لالا کے اشارے پر نہایت فرماں برداری سے جان قربان کر سکتی ہے۔ جس کا دنیا میں ایک ہی آئیڈیل ہے۔ ایک ہی رہنما ہے۔ جس کی کسی بات کو وہ کبھی رد نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سے آگے وہ کچھ کرنے سے قاصر ہے۔"

"آپ جانتی ہیں بیلا۔ میں نے یہ ساری باتیں کرنے کے لیے صرف آپ کا چناؤ کیوں کیا؟"

اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ تو کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

"ایک تو اس لیے کہ آپ سے بات کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکتا ہے۔ دوسرے اس لیے کہ میں نے ان روایتوں کے خلاف اگر کسی کو لڑتے دیکھا ہے تو صرف آپ کو۔"

یہ بہت عجیب و غریب قبیلہ ہے بیلا۔ ہم ان کو دقیانوسی اور پتھر کے زمانے کے لوگ سمجھتے ہیں لیکن یہ اپنی زمین میں بہت اندر تک اتر گئے ہیں۔ یہ سرداروں کو پوجتے ہیں۔ ان پر جان دیتے ہیں۔ لیکن سردار بھی ان کی روایات کا بھرم رکھنے کے لیے ایک کٹھ پتلی ہیں۔ جس دن سردار قبیلے کے اصولوں کے خلاف چلے گا۔ اس کا کچلا ہوا قیمہ خود عوام نہیں پہچان سکیں گے۔"

اسے جھرجھری سی آ گئی۔ خوف کی ایک انجانی سی لہر نے اس کو کپکپا دیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہ گڑھی عیسیٰ خان کسی بستی کا نام نہیں، یہ مکڑی کا ایک جالا ہے۔ آپ صرف ایک مرتبہ اس جالے میں پھنس جائیں، پھر آپ نکل نہیں سکتے۔ جکڑے جاتے ہیں، نہ آپ کو واپسی کے راستے دکھائی دیتے ہیں، نہ یہاں آپ کا کوئی ٹھکانہ ہے۔"

"بی بی بیلا۔ اس سے قبل کہ تم اس شکنجے میں کسی جاؤ۔ اس جال کو توڑ کر پھینک دو اور یہاں سے نکل جاؤ۔" اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

وہ ان کی ادھوری باتوں کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ لیکن شاید اپنے بارے میں صفائی دینا اسے اچھا نہیں لگا۔

"آپ مجھے جانتے ہیں سرجن نثار۔" اس نے ٹھوس اور فیصلہ کن آواز میں کہا تھا۔ "لیکن اتنا نہیں، میں مقامات اور جگہیں بار بار بدل چکی ہوں۔ اور مجھے کوئی جالا اتنی آسانی سے جکڑ نہیں سکتا۔ میں نے تو بڑی سہولت سے وہ گھر چھوڑ دیا تھا جہاں میری زندگی کے بائیس تیئیس سال گزرے تھے۔ آپ دیکھیے گا۔ میں سب کچھ چھوڑ کر ایک دن آسانی سے یہاں سے بھی نکل جاؤں گی۔" اس نے اپنے مقابل کھڑے افسردہ سے سرجن نثار کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"لیکن جانے سے پہلے میں اس گھر میں ایک انقلاب لا کر دم لوں گی۔ اگر ہم ان فرسودہ روایات کو توڑ نہیں سکتے سرجن نثار، تو ہمارا اتنا فرض تو بنتا ہی ہے کہ ہم اس میں ایک دراڑ ڈال دیں۔ ہمارے لیے اتنی کامیابی کافی ہوگی۔ باقی کا قرض آنے والی نسلیں اتار لیں گی۔"

وہ اندر آ گئی۔ جہاں زندگی اتنی ہی خوش رنگ اور ہشاش بشاش تھی جیسے کسی اور کی زندگی کے گہرے اداس رنگوں سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ وہ لو دیتی تپتی سلگتی اداسیوں کے نام سے بھی آگاہ نہیں تھے۔ یہ بے حس خود غرض لوگ۔ اسے لمحہ بھر کے لیے ان سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ بے بے، خان گل، دانیال خان۔ اس کا دل نہیں چاہا وہ اس تسبیح کے کسی دانے کو چھیڑے اور خود سے اختیار کھو دے۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آ کر بند ہو گئی۔

یہ گھر اسرار اور انکشافات کا ایک ملغوبہ ہے۔ وہ ہر روز کسی نئے انکشاف کا بوجھ ذہن پر لیے دل کو پژمردہ کرتی رہتی ہے کتنا طویل وقت اس نے کمرے میں اکیلے پڑ کر گزارا۔ حالانکہ ابھی وہ شیریں کو اس بزدلی پر دل ہی دل میں کوس رہی تھی۔ اور خود یوں حالات سے چھپ کر کمرہ بند ہو بیٹھی تھی۔ جیسے حالات ایسے ہی تو تبدیل ہوتے ہیں، انقلابات اسی طرح تو آ جاتے ہیں۔

شام تک وہ کمرے میں بند رہ کر حالات سے جھگڑا اور جھگڑا کرنے کے لیے خود کو حالات کے لیے تیار کرتی جب باہر آئی تو شور شرابا اسی طرح کان پھاڑ رہا تھا۔ جب سے مہمان گھر میں آئے تھے گھر مسلسل ایک ریلیسن پیریڈ بنا ہوا تھا۔

اس نے کوریڈور سے گزرتے دیکھا۔ بلیرڈ روم میں بلیرڈ کھیل جا رہی تھی۔ ہر شاٹ کے بعد ایک ہنگامہ برپا اور ہر شاٹ سے پہلے ایسا موت جیسا سناٹا۔

میز کے ساتھ ساتھ کھڑے۔ سرجن نثار اور دانیال خان ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے اور کون جانے یہ کھیل کل ہی سچ ہو جائے۔

وہ بلیرڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

دونوں کی مقبولیت کا گراف ایک جتنا ہی تھا۔ آدھے لوگ دانیال خان کا ساتھ دے رہے تھے آدھے ان کے خلاف تھے۔ دونوں گروپوں نے اپنی وفاداری کے اظہار کے لیے اس کو اپنی طرف شمولیت کی دعوت دی۔ اسے ہجوم کے پیچھے چھپ کر تالیاں بجانے میں کوئی مزا نہیں آتا تھا اور وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ علی الاعلان وفاداری کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی کہ سرجن نثار نے رضاکارانہ طور پر خود ہی ہتھیار پھینک دیے۔

"آئیے اور آپ بھی تالیاں پیٹیے دانیال خان کے لیے۔" سرجن نثار کے چہرے پر تھوڑی دیر پہلے کی پژمردگی کا اب شائبہ بھی نہ تھا۔ وہ خوشدلی سے مسکراتے، سکون و اطمینان سے اسٹک سے بالز لڑھکاتے پھر رہے تھے۔

"جناب اپنی گلی میں تو فلاں بھی شیر ہوتا ہے۔ آپ کو آج ہجوم نے چار تالیاں پیٹ کر لیڈر بنا دیا تو سر چڑھ گئے۔" وہ اپنے خول میں واپس جا چکے تھے۔ اور اس چھت کے نیچے ان کے حامیوں اور مخالفین میں سے کسی کو رتی برابر شبہ نہیں ہوا کہ وہ کس اذیت سے گزر کر ان مرحلوں تک پہنچے ہیں۔

انہوں نے ایک سیکنڈ کے لیے گیم روک دی۔ "آپ بھی آجائیے اور دیکھیے کہ آپ کے باس کس طرح پرخچے اڑاتے ہیں۔" انہوں نے اینگل درست کرتے بھی اسے مخاطب رکھا۔

"میرے سارے تیروں کا رخ دانیال خان کی طرف ہے۔ یہ سارے نشان تاک کر میں آپ کے دانیال خان کو ہواؤں میں بکھیرتا ہوں۔"

کہیں دور کسی کرسی پر بیٹھی تمکنت سے گردن اٹھائے لڑکی کو یہ سب اچھا نہیں لگا۔ وہ اٹھ کر سامنے آئی۔ دانیال خان زیر لب مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے اتنی دیر میں اپنے لیے کوئی دفاعی بیان دیا تھا نہ اس بے تکلفانہ سی فضا اور لفظوں کے بے دریغ استعمال پر ٹوکا۔ وہ باری باری دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے، بچوں ایسی شفیق لہجے میں "اپنی اسٹک کو بورڈ پر آہستگی سے ہٹ کرتے رہیے۔" بیلا کا دل بھر آیا۔

یہ پہلی دوسری نہیں، پتا نہیں کون سویں مرتبہ ہے کہ اس کے دل میں ان کے خلاف طوفانوں کی یلغار اٹھی بھی ہے اور ٹھنڈی بھی پڑ گئی۔ عدیلہ خٹک کے چہرے پر کسی مسکراہٹ یا خوشگواری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس نے ایک نظر دانیال خان کی آنکھوں کے تعاقب میں دیکھا۔ دوسری مرتبہ بیلا کے اینگل سے ان کی طرف۔ پھر اس کی ساری توجہ ہجوم کے ایک نعرہ تکبیر سے بکھر گئی۔ لال گول گیند جیسے تیرتی ہوئی اپنے سوراخ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"یوں لگتا ہے۔ آپ کا کچھ کھو گیا ہے۔" سرجن نثار نے اسٹک پھینک کر اپنی ساری توجہ کا مرکز اس کو بنا ڈالا۔ "کوئی نشان، کوئی راستہ، کوئی منزل، اگر ہم آپ کی مدد کر سکیں۔"

"بہت بہت شکریہ۔ وہ جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا ان کی مدد کرتا ہے۔" ایک اور نعرے میں اس کی آواز دب گئی۔

دانیال خان کے حامیوں میں سے کسی نے بے ایمانی کی کوشش کی تھی۔

وہ چپ چاپ جا کر تماشبینوں میں شامل ہو گئی۔ وہ کسی کی حامی نہیں تھی۔ اس نے رقت سے دعا کی۔ خدا کرے ان میں سے کوئی نہ ہارے۔ عدیلہ خٹک نے چونک کر دیکھا۔ غالباً "یہی کہ اس بے ضرری اور لور پھرتے والی لڑکی کو ہر دو طرف سے عجیب و غریب قسم کی اہمیت کیوں دی گئی تھی۔ جواب۔ گیم کی طرف متوجہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہونے کے بجائے گود میں رکھے دونوں ہاتھوں کو اس شدت سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے خدا تعالیٰ سے کوئی چیز مانگ رہی ہو۔ اس کا چہرہ رنگ بدلنے لگا۔

کون جانے وہ کسے مانگ لے

اور کب قبولیت کی گھڑی آجائے۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے شیریں۔" اس نے شام سے پہلے ہی اسے اپنے گرم کمرے کے ایک کونے میں سردی سے یا خوف کی شدت سے کانپتے جالیا تھا۔ وہ حیرت سے گنگ رہ گئی۔

اس کا خود ساختہ سا غرور اس کے یوں طنطنے سے مخاطب کرنے سے ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کو چھت تک بلند اور باوقار نظر آئی۔ شیریں کو لگا وہ اس کے سامنے ننھی منی بچی بن گئی ہے۔ مخاطب اس سے بہت بلند۔ بہت برتر۔

اس کے پاس گنوانے کے لیے بہت کچھ ہے اور مخاطب خالی ہاتھ لیکن با اعتماد۔

کتنے دن سے اس کا جی چاہ رہا تھا۔ کوئی آئے اس کا بڑا بنے۔ اس کو راہ دکھائے۔ اس کی نوکیلی پلکوں کے تیز کونے گیلے پڑ گئے۔ اور بے تحاشا سی سفید رنگت شدت ضبط سے ٹماٹر کا سا رنگ دینے لگی۔

"شاید تمہیں میری بات اچھی نہ لگے۔" اس نے اس کے کانپتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں سہار کر کہا تھا۔

"لیکن یہ ضروری ہے۔"

شیریں خوف سے دم بخود اور ساکن تھی۔ اس نے اتنی دیر میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ اس کی یہ جرات بھی نہ ہوئی کہ وہ اپنا غرور سمیٹ کر اس کو جھڑک سکے۔ اس نے آخر یوں بے دریغ اس کے کمرے میں آنے کی جرات کیسے کی۔ لیکن وہ کمزور بچی کی طرح ہلکے ہلکے لرزتی رہی۔

"میں جس دن پہلے دن یہاں آئی تھی تم بے بے کے کمرے میں دنیا کی نعمتوں سے منہ پھیر کر آتش دان کے رخ بیٹھی تھیں۔ جب سے آج تک میں نے تمہیں جشن مناتے۔ خوشیاں مناتے نہیں دیکھا۔"

وہ چپ سی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں دو آنسو تیر گئے۔

"تم بھی تو...!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم بھی تو الگ رہتی ہو۔" کتنے افسوس کی بات ہے۔ وہ اس کے برابر آگئی تھی۔ بلکہ اس سے کم تر ہو گئی تھی۔

"ہاں۔ میرا ایک مسئلہ تو زبان ہے۔ مجھے ان کی زبان سمجھ نہیں آتی۔ علاوہ ازیں میں یہاں ملازم ہوں۔ اس گھر کا فرد نہیں۔ شاید لوگوں کو میری بے تکلفی اچھی نہ لگے۔"

اس کی صاف گوئی نے اسے دنگ کر دیا۔

جیسے بے مول خرید لیا۔

"ایسا کون سوچتا ہے؟ لالا تو ایسے نہیں سوچتے بلکہ کوئی بھی نہیں سوچتا۔"

"چلو اس کا مطلب ہے کم از کم تم نہیں سوچتیں۔ چلو یہ اچھی بات ہے۔ میں نے تو وجہ بتا دی۔ اب تم بتاؤ۔"

"مجھے دنیا اچھی نہیں لگتی۔" اس نے سسکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "حالانکہ لالا اس وقت مجھے کتنی دیر

مناتے رہتے ہیں۔"

"جو چیزیں اچھی نہیں ہوتیں۔ ان سے منہ موڑ کر ہم ان کا کیا نقصان کرتے ہیں۔"

شیریں نے شک سے دیکھا۔ "کیا تمہیں کسی نے میری طرف بھیجا ہے؟"

"ہاں مجھے خوشی ہے کہ تم ذہین بھی ہو اور اب یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ کس نے بھیجا ہے؟"

اس نے گردن جھکالی۔ "میں نے تو ان سے کہہ دیا تھا کہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں پتا نہیں بیلا۔" خوف اس کی شفاف آنکھوں میں کانچ کی طرح ٹوٹنے لگا۔ "تمہیں یہاں کی روایات کا پتا نہیں۔ یہاں قیامت آجائے گی۔"

"آنے دو نا۔" اس نے سکون سے کہا۔

"طوفان برپا ہو جائے گا۔ قتل و غارت۔ خون۔" اس نے سہم کر کہا۔ "اور لالا کی جان۔ لوگ لالا کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ بڑی خود غرضی ہو گی۔ نہیں۔ تم اس کو منع کر دو۔ وہ یہاں مت آیا کرے۔ میں گڑھی کو جس طرح خون میں نہایا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ تم نہیں دیکھ سکتیں۔ میں نے تو لالا کے سامنے زبان نہیں کھولی اور اس کو بھی اجازت نہیں ہے کہ یہ لفظ زبان پر لائے۔ میرا اس طرح جان دے دینا ٹھیک ہے۔ تم جاؤ بے بے سے کہو۔ میں خان قُل سے شادی کر لوں گی۔" اس نے کتنی دیر اسے پھوٹ پھوٹ کر رونے دیا۔

"وہ پٹھان نہیں ہے بیلا! پنجابی ہے اور کتنی سہولت اور بے دردی سے لوگ اس کو قتل کروا لیں گے۔"

"کوئی ضروری تو نہیں شیریں! پندرہ سال پرانی تاریخ اب بھی دہرائی جائے۔ دنیا کا حافظہ اتنا اچھا نہیں۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ پندرہ سال ایک مدت ہوتی ہے۔"

"سب لالا سے ڈرتے ہیں۔ وہ اپنے ارادوں میں بہت پکے ہیں۔"

"میں ان سے نہیں ڈرتی۔" اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر یقین دلایا۔

وہ ساکت رہ گئی۔

یہ بستی بڑی اذیت دہ بستی ہے۔

اس نے بلند چوٹی سے نیچے بکھری آبادی کو دیکھ کر حتمی سا فیصلہ کیا۔ گھروں سے نکلتے بل کھاتے پر سکون دھوئیں میں وہ انسان کے سکون سے بالکل نابلد ہیں۔

آج سے پندرہ سال پہلے ایک شخص نے اس بستی کے خلاف ایک فیصلہ دیا تھا جس کا نتیجہ بستی اور ما کین نے دیکھ ہی لیا۔ پندرہ سال بعد ایک آدمی نیا قدم اٹھانا چاہتا ہے۔ لیکن بزدل ہے۔ اسے شیروں، چیتوں کے آگے ان کا نوالہ بن کر رہنا پسند نہیں۔ لہٰذا اس کا ایک ہی حل ہے کہ وہ دونوں اپنی اپنی بزدلی سے اپنے ارادوں سے دستبردار ہو جائیں۔

لیکن وہ قیامت تک ایسا نہیں ہونے دے گی۔ ہاں یہاں ایک انقلاب آئے گا۔ خون بہے قتل ہو۔ لیکن وہ اس بستی میں یہ دراڑیں ڈال کر دم لے گی۔

☼ ☼ ☼

تازہ دم گھوڑے بستی کے ادھر ادھر مہمانوں کو کمر پر بٹھائے بھاگتے پھر رہے تھے۔ سامنے قیمت خان کا اصطبل تھا۔ اور اس کے قدموں میں زندگی تھی۔ رواں دواں ہنستی مسکراتی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہاں اس نے شیریں سے بھی وعدہ کیا تھا اور سرجن نثار سے بھی۔ اب وہ بھاگنا بھی چاہیں تو وہ ان کو بھاگنے نہیں دے گی یہ دنیا۔ اگر جنگل کے کنارے واقع ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں قانون بھی جنگل کا لاگو ہو۔ وہ اس طاقت کے خلاف ہر حالت میں جنگ کرے گی۔ دانیال خان کا گھوڑا سرپٹ دوڑتا پہاڑی کے چکر کاٹ رہا پھر وہ عدیلہ خٹک کے گھوڑے کے پاس آ کر رکتا۔ ان دنوں وہ رائیڈنگ کے درس لے رہی تھیں۔ زندگی گزارنا اتنا آسان نہیں دانیال خان۔"

اس نے تلخی سے سوچا۔ زمرد اور ہیروں کے ڈھیر میں اپنی عورتوں کو دفن کرنا۔ ان کو ان کے حق دینے سے بالکل مختلف چیز ہے۔ شیریں خواہ اس بستی کی کتنی ہی چہیتی کیوں نہ ہو۔ اس کو یہ حق دلوانے کی ذمہ داری میری ہے۔ وہ عدیلہ کو ٹینس کھیلنا سکھا رہے تھے۔

وہ بڑے اہتمام سے خان گل کے بنوائے بیڈ منٹن کورٹ میں مغرب کی اذان تک ایک تواتر سے ریکٹ گھماتے رہتے۔

وہ صبح اٹھ کر جوگنگ کر رہے تھے۔ ان کی زندگی کے ہر لمحے میں، ہر جگہ۔ ان کی بہترین رفیق عدیلہ خٹک تھی۔ اور جیسے تمام دنیا سے انہوں نے آنکھیں پھیر لی تھیں۔

اور وہ شیریں، خان گل 'بیلا' سے سب جیسے یہ تمام رشتے احباب ذمہ داریاں انہوں نے سر سے جھٹک کر بالکل پھینک دی تھیں۔

جب اس نے ان کی اتنی بے تحاشا مصروفیت اور اس کی طرف، مسلسل عدم دلچسپی کے باوجود پری کے ہاتھ پیغام دیا تو اس کو پورا یقین تھا۔ شدید مایوسی سے رد کر دیا جائے گا۔

پری خاموشی سے گئی اور واپس آ گئی۔

وہ پیغام کے جواب میں پیغام لائی تھی۔

"انہوں نے کہا ہے میں لائبریری میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

پری لاپروائی سے پیغام رسانی کے فرائض نبرد آزما ہو کر ایک طرف ہو گئی تھی۔

لیکن اس کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ کب سے ان سے اس ملاقات کے لیے جدوجہد نہیں کر رہی تھی۔ اور اس کا تو خیال تھا ابھی وہ اس سے ملاقات کرتے کترائیں گے۔ سو سو طرح سے حجت کر کے کہیں آمادہ ہوں گے لیکن ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ پری کا پیغام سن کر لائبریری پہنچ گئے۔ اور اطمینان سے اس کے اعصاب توڑنے پھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

وہ تیز رفتاری میں سرخ قالین کو روندتی آخری سیڑھی تک بھاگتی بھاگتی رک گئی۔

یہی وہ لائبریری تھی یہاں کتنی مرتبہ اس نے ان سے جھڑپیں لی تھی۔ کتنی مرتبہ ان کی تکرار ہوئی۔ کام کے سلسلے میں کتنی تاکیدیں یہاں سے روانہ ہوتیں۔

کتنی ہی مرتبہ وہ یہاں دندناتی گھسی اور بسورتی نکلی۔ لیکن وہ وقت اور تھا اس نے کمرے کے عظیم الشان دروازے کو آہستگی سے چھوا۔

جیسے اچانک یہ لکڑی کا تمام سا دروازہ وزنی اور آہنی ہو گیا ہو دروازے کے عین سامنے ہی کرسی پر دانیال خان براجمان تھے۔ ان کی نشست سیدھی دروازے کے رخ تھی۔ اور وہ گویا بہت دیر سے دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کے فیصلے کے منتظر سے بیٹھے تھے۔ واپس بھاگ جانے اور ارادہ بدل دینے کے اس کے

سارے منصوبے دھرے رہ گئے۔

"آیئے۔" وہ سنجیدگی سے احتراماً کھڑے ہو گئے۔ "تشریف رکھیے۔"

ان کے عین سامنے بچھی نشست غالباً کچھ دیر قبل ہی اس کے لیے وہاں رکھوا دی گئی تھی۔ اسے کیا کہنا تھا۔ وہ کیا کرنے آئی تھی۔ لڑ جھگڑ کر اپنی بات منوانا زیادہ آسان ہے لیکن ان کے سامنے منت کرنا۔ گریہ وزاری کرنا شاید اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

ان کی آنکھیں ایک انجانی مسرت سے لو دے رہی تھیں۔

وہ جانتی تھی کسی بھی طنزیہ گفتگو سے قبل ان کے چہرے پر ایسے بے شمار رنگ آ جاتے ہیں۔ اور خاص طور پر اس سے جھگڑا مول لینے سے قبل وہ ہمیشہ ایسے ہی شاداں و فرحاں لگتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ عام زندگی میں عورت کا بہت احترام کرتے ہیں۔ اور عورت کو نیچا دکھانا۔ ان کی انا کی تسکین کا کبھی مسئلہ نہیں رہا۔

لیکن بڑی حیرت کی بات ہوئی۔ اپنی نشست سنبھالنے کے بعد انہوں نے اسے خود سے الجھنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس طرف سے کوئی زہریلا فقرہ نکلا۔ نہ طنزیہ جملہ نہ تیر کی طرح کھچ سے پیوست ہوتے الفاظ حتیٰ کہ انہوں نے اس کو اپنی کرسی پر تھوڑی دیر یا تھ مسلتے دیکھ کر بھی کوئی بیان جاری نہیں کیا۔

بظاہر وہ اس کو وقت دے کر مناسب الفاظ کی تلاش میں مدد دے رہے تھے۔ لیکن اس طرح وہ خود سے مزید اختیارات کھو رہی تھی۔

"میں واپس جانا چاہتی ہوں۔"

بے ساختگی میں اس کے منہ سے نکلے ایک بے موقع سے فقرے نے ان کو ذرا بھی نہ چونکایا۔

"مجھے یہاں کوئی بھی کام نہیں ہے۔ خوامخواہ میں تنخواہ لیتے رہنا عجیب سی بات لگتی ہے۔

پھر آپ کی شادی ہونے والی ہے۔ اب آپ کو شاید باہر سے کسی معاونہ کی ضرورت بھی نہ پڑے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تھوڑا بہت سے الفاظ کتابوں میں بکثرت ہونے کے باوجود انہیں زبان سے استعمال کرنا کتنا وقت طلب ہو جاتا ہے۔

"کہ۔ آپ کی دلہن کو میری یہاں ملازمت پسند بھی نہ آئے۔ حالات خراب کر کے کوئی نئی نوکری تلاش کرنے سے بہتر ہے۔ اور چونکہ میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" اس نے بے ربط سے انداز میں کہا۔

"اس لیے جانے سے پہلے میں اس گھر کے بارے میں ایک اہم مشورہ 'ایک رائے دینا چاہتی ہوں۔ خواہ آپ مجھے اس کا حق ہی نہ دیں۔"

وہ اٹک کر رک کر بے ہنگم طریق سے بولتی ایک دم چپ ہو گئی تھی۔

انہوں نے تھوڑی سی دیر کے لیے کچھ ڈرامائی وقفہ دیا۔ کہ شاید پھر کچھ بولے۔ پھر کچھ کہے۔

"بس۔؟" انہوں نے شرارت سے پوچھا۔ "یا کچھ اور۔؟"

وہ چپ سی ہو گئی۔ ان کتابوں کے پیچھے اس کا ہمیشہ تمسخر ہی بنتا آیا ہے۔

"ابھی یہ تو آپ متضاد سی باتیں کر رہی تھیں اور ان موضوعات میں تنوع بھی بہت ہے۔ مثلاً" آپ جا رہی ہیں نمبر ایک۔ نمبر دو یہ آپ کو کوئی کام نہیں ہے۔ نمبر تین آپ کو تنخواہ لینا اچھا نہیں لگتا۔ اور نمبر چار۔ ہاں یہ کہ میں شادی کر رہا ہوں اور سب سے آخری اور آپ کے بقول سب سے اہم بات اس گھر کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بارے میں۔ لیکن یہ تو بے شمار موضوعات ہیں۔ بیلا بی بی اور ان کے لیے بڑا طویل وقت چاہیے۔ جبکہ آپ تو جا رہی ہیں۔"

وہ خجل سی ہو گئی۔ انہوں نے اس کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اس کی کوئی بات کبھی رد بھی نہیں کی گئی تھی اس نے معذرت کے سے انداز میں کہا۔

"سوری۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ کے پاس وقت نہیں تھا۔ اور آپ بہت مصروف بھی تھے لیکن میں نے سوچا۔"

"نہیں میں ہرگز مصروف نہیں تھا۔ اور آپ کے لیے میرے پاس وافر وقت ہے۔ فرمایئے پہلے کس موضوع کو چھیڑنا ہے۔ آپ کی روانگی؟"

"نہیں" اس نے ذرا سا بُرا مان کر کہا۔ "یہ ایک غیر ضروری بات ہے۔ اور ہرگز اہم نہیں۔"

"آپ ظلم کر رہی ہیں۔ کیا آپ کا یہاں سے چلا جانا گڑھی کے لیے قطعی غیر اہم اور غیر ضروری ہو سکتا ہے۔ اور کیا آپ جا سکتی ہیں۔"

"مجھے کون روک سکتا ہے۔" قابو پانے کے باوجود اس کو لگا اس کی آواز میں بدتمیزی کا عنصر آ گیا تھا۔

"میں جو بات کہنے والی ہوں اس سے کہیں اہم اور کہیں ضروری ہے اور بڑی بات بھی ہے۔ چونکہ میں گڑھی میں ملازمت کرتی ہوں۔ اس لیے ہو سکتا ہے یہ مناسب بھی نہ ہو۔ پھر بھی میں نے سوچا ہے۔"

"بھئی واہ۔" وہ بے ساختہ اس کی بات کاٹ کر ہنس دیے۔

"کیا لحاظ روا رکھا ہے آپ نے ملازمت کا۔ وہ کون سا زہریلا فقرہ ہے۔ وہ کون سی کڑوی بات ہے اور کون سا ایسا دل جلانے والا واقعہ نہیں ہے۔ جو آپ نے اب تک میری ذات سے منسوب نہیں کیا۔ اب اگر ملازمت کا نام لے کر معذرت کر کے۔ تو یقیناً" آج آپ میرے قتل کے ارادے سے آئی ہیں۔"

"میں چاہتی ہوں، سرجن نثار اور شیریں کی شادی ہو جائے۔" اس نے خاموشی سے ایک دھماکا کر دیا تھا۔

ان کا چونچال سا موڈ غیر سنجیدہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا وہ اچھل پڑیں گے۔ لیکن نہ انہوں نے حیرت کا اظہار کیا نہ غصے کا صرف شوخی سے تمسخر کے میدان میں اتر آئے۔

"یہ آپ چاہتی ہیں اور آپ کے چاہنے سے کس کس کی شادی رکے گی اور کس کس کی ہوگی۔ دیکھو بی بی! وہ گل پری ہے اور نہ میں قیمت خان ہوں۔"

"میں بالکل سنجیدہ ہوں۔" اس نے ان کے طنز میں ان کا ذرا سا بھی ساتھ نہیں دیا۔ اس کی آواز میں سختی تھی۔

"اور یہ مذاق ہو بھی نہیں سکتا۔ یہ دو زندگیوں کا سوال ہے۔"

وہ لمحہ بھر کے لیے جیسے گونگے ہو گئے۔ ہاں یہ کچھ مختلف بات تھی۔

یہ پری اور بوڑھے کی شادی کا قصہ نہیں تھا۔ یہ اسکول ماسٹر کو نوکری سے نکال بھگانے والی کہانی نہیں تھی۔ یہ عورتوں اور بچوں کو زبردستی پڑھانے والی شکایت نہیں تھی۔ خان گل کی جلاوطنی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ بغاوت، انقلاب اور روایات توڑنے کی بار بار کوشش بھی نہیں تھی۔

یہ بہت سنگین ضد تھی۔ یہ ایک خونچکاں داستان تھی۔

اور وہ گڑھی کے دیواروں سے پھر خون ابلتا دیکھ رہے تھے۔

کتنی دیر وہ اپنے گال کو دائیں ہاتھ سے سہارے لکیروں کے جال میں الجھتے رہے۔

"اور اس کے لیے کس نے آپ کو چنا ہے۔ شیریں نے یا نثار نے۔"

"یہ میں بالکل نہیں بتاؤں گی۔" اس نے وفاداری نبھائی۔

"نہ بتائیں۔" وہ اسی سوئے ہوئے موڈ میں بولے۔ کتنی دیر وہ قالین کے نیل بوٹوں میں جیسے کسی کو کھوجتے رہے۔ بھنوؤں کے درمیان دو تین موٹے موٹے بلوں سے الجھتے جیسے وہ اس پزل میں باہر کی راہ تلاش کرتے رہے پھر ان کے منہ سے کچھ نکلا تھا۔ لیکن شاید وہ کسی سے مخاطب نہیں تھے۔

"ایک مدت بعد اس گڑھی کی دیواروں سے امن و سکون ٹپکنا شروع ہوا۔ دل چاہتا تھا آپ اس بستی میں ٹھہر جائیں۔ رک جائیں۔

اور یہ بھی غنیمت ہوا کہ اس خون کے دھارے کو میں نے اپنی خواہش کے لیے نہیں بہایا۔" انہوں نے ویسے ہی سوئے سوئے بیلا کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں یہاں پھر خون دیکھ رہا ہوں بیلا اور اپنوں کا خون بہانا مذاق نہیں، کم از کم میرے جیسے بزدل آدمی کے لیے اب یہ ناممکن ہے۔ میں نے تو اپنی راہ بدل لی تھی بیلا۔ مجھے ان دیواروں سے باسی خون کی بو آ رہی تھی۔ لیکن شاید اس گھر کی آبیاری خون سے ہی ہو سکتی ہے۔

ہاں! ان دونوں کو کہنا یہ شادی بہت مشکل ہے۔ بہت ناممکن ہے۔

لیکن اس گڑھی کا سردار میں ہوں۔ تمام روایات کی پاسداری میری ذمے داری ہے۔ وہ مجھے قتل کر دیں اگر میں غیر پٹھان قبیلے کی لڑکی سے شادی کر لوں۔ لیکن میرا سارا کنبہ، میری ساری برادری ان کی نام نہاد روایات پر بھینٹ نہیں چڑھ سکتی۔

ہاں یہ شادی ہوگی ہر قیمت پر ہوگی۔

جاؤ ان دونوں کو خبر دو کہ عید کے جشن کے ساتھ یہاں دو اور جشن بھی منعقد ہوں گے۔

بستی والے اپنے قبیلے کی لڑکی کے ساتھ میری شادی کریں گے۔ اور میں شیریں کی خواہش کا احترام۔ بستی والوں کا دست تبر صرف میں ہوں۔ میں ان کی ذمہ داری ہوں۔ میں ان کی آن ہوں۔ میں ان کا بھرم ہوں۔ وہ میرے ساتھ کھیلیں۔

ہاں میں ہر طرح تیار ہوں۔"

جشن یہ بستی منائے گی اور اس بستی کے لوگ۔

وہ تو یہ جشن دیکھنے کے لیے ہرگز ہرگز اس جگہ نہیں ٹھہر سکتی۔

اس نے حیرت سے ایک سانس بولتے دانیال خان کی طرف دیکھا۔ اتنی دیر جیسے وہ کسی سے بھی مخاطب نہیں تھے۔ وہ خود کو کچھ بتا رہے تھے۔ پتا نہیں اس کے کانوں نے جو سنا اس میں کتنی حقیقت تھی۔ یا یہ بھی دانیال خان کا تضحیک اڑانے کا ایک انداز۔ ابھی وہ بھنویں چڑھا کر طنزیہ انداز میں اس کے پرخچے اڑائیں گے۔ ان کی آنکھیں ہنس رہی ہوں گی۔ لیکن فقروں سے طنز کی بو آتی۔

مگر بعض اوقات وہ سب کچھ نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں۔

کیا وہ اس کو محض ایک مٹی سے بنا توڑہ ہی سمجھتے رہے ہیں۔ کتنے سکون سے انہوں نے اس کے جمیل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیسے پرسکون انداز میں ایک ایک کرکے کنکر ماری تھی۔ اور ہلچل مچا ڈالی تھی۔ وہ خاموش اور پرسکون بیٹھی ان کی روئیداد سنتی سنتی اٹھی تو اس کو لگا اس کے پیروں میں جیسے منوں وزنی پتھروں نے بوجھ ڈال دیا ہے۔ جیسے وہ ساری زندگی یہاں سے نکل ہی نہیں سکتی۔

لیکن اس کو ملنا تھا' کبھی کبھی انسان کی زندگی کی تاریخ اپنا بدترین باب تحریر کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی ہی کہانی لکھی گئی تھی جو سیاہی سے بہتے پانی پر تحریر ہوتی تھی۔

کہاں سے لائے وہ اتنا اعلیٰ ظرف کہاں سے پیدا کرے وہ دل میں اتنی وسعت۔

ہاں وہ ان عظیم الشان ہستیوں میں سے نہیں تھی جو ہنس ہنس کر ختم ہو جاتے ہیں۔

وہ اعلیٰ کرداروں میں سے نہیں تھی جو جان کی قربانی دے کر دوسروں کی زندگیاں محفوظ رکھتے ہیں۔ جو اپنے دل کے چیختے چلاتے نالوں کو اپنے کردار کی اعلیٰ ظرفی سے مٹا ڈالتے ہیں۔

پھر بھی اس کو تقدیر کے اس فیصلے کو بخوشی تسلیم کرنا تھا۔

کیونکہ دل کے ساتھ ساتھ اس سے عظیم تر۔ اس سے بھی فوری تر ایک اور جذبہ پلتا رہتا ہے جس کی ہم جی جان سے پرورش کرتے ہیں۔ وہ ہر چیز توڑ سکتی تھی۔ ہر جذبہ مٹا سکتی تھی لیکن اپنی انا کو یوں سستے داموں رسوا نہیں کر سکتی تھی۔

وہ بڑی استقامت سے اٹھی تھی اور عزم سے چلی تھی۔

مخاطب اس کے سامنے اسی طرح تھا بکم صم۔ چپ اور ساکت۔ اس کے ہونٹوں نے اس کے اٹھتے قدموں کے ساتھ جیسے ایک گہرے سانس کے ساتھ زیر لب کسی کو آواز بھی دی تھی۔

لیکن اس کو پلٹ کر نہیں دیکھنا تھا۔ اگر وہ پلٹ کر دیکھ لیتی تو پتھر کی مورت بن کر ساری زندگی اس چھت کے نیچے گڑی کھڑی رہ جاتی۔

"میلا۔" انہوں نے اسے دوبارہ آواز دی تھی۔ اس کا جواب نہ پا کر وہ اس کے برابر آ گئے۔

"فی الحال ان دونوں سے کہنا اس بات کو عام نہ کریں۔ میں مہمانوں کے جانے کے بعد خود کسی دن۔۔۔" پھر جیسے بات کو مکمل کرنا بالکل بے معنی لگا۔

"مہمان ایک دو روز میں رخصت ہونے کو ہیں۔" انہوں نے اسے یقین دلایا۔

"بہتر ٹھیک ہے۔" اس نے جیسے سکون سے گردن گھما کر ان کی آنکھوں میں اس رازداری کا یقین دلایا۔ صرف لمحہ بھر کو وہ سوچتی ڈوبتی گہری آنکھیں جھپکتی پلکوں کے پیچھے جھلملاتی آنکھوں سے ٹکرائیں۔

لیکن صرف لمحہ بھر کو۔

پھر وہ سکون سے مسکرا دی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔

کوئی دکھ عمر بھر کے لیے نہیں آتا۔ کوئی روگ ساری عمر کے لیے نہیں لگتا۔ اس کی ذات نے بہت بڑے بڑے روگ بڑی ہنسی خوشی سہے تھے۔ اس نے بہتے پانی کے ساتھ نیچے وادی میں نظریں دوڑاتے سوچا۔ جھکے ہوئے بادلوں سے بھری ہوئی وادی کا سارا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ ساری خوب صورتی جھاگ ہو گئی تھی۔

اس نے قدموں میں بکھری اس حسین وادی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔

ہاں اسے وادی کے جال میں نہیں الجھنا۔ اسے سرجن نثار کی بالکل اسی جگہ کی ہوئی نصیحت از بر تھی۔

اسے لوگوں کے سامنے بکھر کر دکھانا نہیں تھا۔ وہ طلسماتی کمرے کے اسرار و رموز سے بچ کر ہنستی مسکراتی باہر تو آ گئی تھی۔ اپنے اندر کی توڑ پھوڑ کو مخاطب سے چھپا کر مکمل کی۔

"آپ تو خوش ہیں۔ ہیں ناں؟" دانیال خان نے چہرے پر بکھرے سب رنگ سب اسرار سمیٹ کر سنگین سنجیدگی سے اسے چھیڑا تھا' پتا نہیں وہ اس سے کس جواب کی توقع کر رہے تھے۔

"ہاں بہت بہت شکریہ۔"

اس کے خشک سے لہجے نے جیسے ان کو مایوس کر دیا تھکا ڈالا۔

کتنے لوگوں کے آنسو اس نے اپنے کندھوں پر خشک کیے تھے۔ ابھی چند دن پہلے یہاں اس وادی میں سرجن نثار نے اس کو رازداری کے لیے چن کر اس پر ایک بڑا ظلم کیا تھا۔ لیکن وہ یہ ظلم کسی اور پر نہیں توڑ سکتی تھی۔

سرجن نثار نہیں ہیں' پری گل' وہ کس سے کہتی' کس کو بتاتی۔

ہر انسان کا ایک کنواں ہوتا ہے جہاں وہ ساری کثافتیں انڈیل کر صاف ستھرا ہو جاتا ہے۔

اس کے پاس ایسا کوئی ٹھکانہ نہیں۔

کتنی شدت سے اس کا دل چاہا وہ واپس پلٹ جائے۔ یہیں سے ناکام و مایوس۔ گوشی کے پاس چلی جائے یا کہیں اور نکل جائے۔

اپنے لیے منتخب خود ساختہ جلاوطنی کے جتنے دن وہ پورے کر سکتی تھی۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں تھی۔

اب آئے کوئی شخص اس کی بہادری کا امتحان لینے۔

ہاں ہاں وہ بہادر نہیں۔ وہ باہمت نہیں' کون ہے اس پر تمغات لٹانے والا۔

اب وہ میدان سے بھاگ کر دکھا دے گی کہ اتنی بڑی کائنات میں گڑھی عیسیٰ خان جیسا ننھا سا کونا اس کے لیے مکڑی کا وہ جالا ثابت نہیں ہو سکتا' وہ کونے کھدروں کی پجاری نہیں۔ دنیا اس ہر شخص کے لیے کھلی ہوئی ہے جو اس میں سمانا چاہتا ہے چوہے کے بل سے دیکھا جائے تو دنیا بہت ڈراؤنی لگتی ہے۔

اس نے واپسی کے دبے ارادے کے باوجود اپنی منصوبہ بندی ترک نہیں کی۔ وہ اسی طرح عورتوں کو درس دیتی اور بچوں کو جماعت میں پڑھاتے سوچتی رہتی۔ بس یہ آخری' آخری دن ہیں پھر وہ ان سب سے رخصت ہو جائے گی۔ گو رخصت ہونے کا تصور اس کی روح تک کھینچ لیتا تھا۔

اس بستی میں اس نے قدم قدم پر ظلم ہی ظلم دیکھا تھا۔ لیکن پتا نہیں اس بستی میں وہ کون سی کشش تھی اور کہاں تھی۔ جو انسان کو بے دم کیے دیتی۔ لیکن ہاں اگر بستی کے۔ ان لوگوں کے دلوں میں ایک بیج بھی بویا اور اس میں سے ایک کونپل بھی پھوٹ نکلی تو یہ بڑی کامیابی ہوگی۔

اس نے بچوں کے اسکول میں وہی روز کا آموختہ دہرایا۔ جس کو سن سن کر ان کے کان پک گئے تھے اور اس کو دہراتے دہراتے اس کی زبان گھس گئی تھی۔

"خدا کی زمین پر ساری مخلوق ایک جیسی ہے۔ ہم میں سے کوئی کسی سے برتر نہیں ہے۔"

"کیا پٹھان بھی نہیں؟" بچی حیرت سے پوچھتی۔ وہ ہر روز حیرت زدہ ہو جاتی ہے۔

کوئی دوسرے سے برا نہیں پٹھان' پنجابی سب ایک ہی ملک میں رہتے ہیں۔ ہم سب ایک جیسے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہی آموختہ اس نے عورتوں کے درمیان بیٹھ کر دہرایا تھا۔

ہاں وہ تو چلی جائے گی۔ لیکن ایک داستان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دہرانے کو چھوڑ جائے گی۔ اگر اس کا سکھایا ایک سبق بھی اگلی نسل نے دہرایا تو سمجھو سرجن نثار سے کیا ہوا وعدہ اس نے پورا کیا۔ اور اب آنے والی نسلیں یہ قرض چکاتی رہیں گی۔

کبھی کبھی انسان دنیا بدلنے نکلتا ہے اور خود کو کسی افلاطون سے کم نہیں سمجھتا۔

لیکن زندگی سے تھک ہار کر مایوس ہو کر اسے پتا چلتا ہے۔ یہ سب مذاق نہیں تھا۔ زندگی تو بہت سخت ہے۔ کروڑوں سالوں نے اس کو اس حال میں پہنچایا ہے۔ بدلنے والے اسے دنوں میں نہیں بدل سکتے۔

پتا نہیں اسے اتنی مایوسی کس بات سے ہوئی تھی۔ وہ اپنی کمزوری کا سہولت سے اعتراف کر کے خود بھی افسردہ ہو گئی تھی۔ اتنی مدت سے وہ کام کاج میں نالائق سی ہو رہی تھی۔ لیکن اب تو اسے ایسا لگتا۔ جیسے کسی فالج زدہ مریض کی طرح وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتی۔

وہ اتنی پاگل تو نہیں تھی۔

لیکن پتا نہیں کیوں زندگی نے اس کو اتنی بڑی پٹخنی دی تھی کہ اس کو سہارنا بھی آسان نہیں رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن وہ یونہی کھانے کی میز پر کتنی دیر اکیلی بیٹھی رہ گئی۔

کھانا کھایا بھی گیا اور اٹھایا بھی۔ لیکن جیسے وہ بے دم یونہی عادتاً میز سے غیر مرئی ذرات سمیٹتی وقت کو سست روی سے گزرنے دیتی رہی۔ بہت دیر تک اس کی کاہلی کا ساتھ دینے والے بھی پھر وہ اٹھ گئیں۔ جب سے مہمان رخصت ہوئے تھے۔ ان کی اپنی زندگی ان کو واپس مل گئی تھی۔ وہ فرصت سے عبادتیں کرتی نوکروں کی دیکھ بھال اور رختہ خان کے ساتھ میں ان کو پھر سے مزا آنے لگا تھا۔ وہ انھیں اور شیریں جیسے آن کر نکل گئی۔ کتنی دیر شیریں سے گھبراہٹ میں گرائے پانی سے وہ مختلف کارٹون بناتی رہی۔

اس کی وہ سراہٹ کی غرض سے ایک اکیلا بیٹھا آدمی اس کو اپنے آپ سے الجھتے دیکھ کر مزا لیتا رہا۔

"خبر گرم ہے کہ آپ واپس جا رہی ہیں۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں بات کے وزن کو ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔

"ہاں گل خان۔" اس نے خلاف توقع بڑی رسانیت سے کہا۔ "میں تم سے اس موضوع پر تفصیل سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن...!"

"لیکن بات تو میں نے کی ہے۔ اب آپ نمبر بنا رہی ہیں۔"

"میرا مطلب جانے سے پہلے میں سب سے بات کر کے ہر حساب صاف کر کے ہی جاتی۔"

"اور اب میرا حساب بے باق ہو رہا ہے۔ کیا روز محشر آ گیا؟"

"میں نے تمہارا اور تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔ پھر غریب روز محشر کا کیا چکر ہے۔"

"ہو سکتا ہو میں نے آپ کا کچھ نہ بگاڑا ہو۔ لیکن آپ نے تو میرا بہت بگاڑا ہے۔" وہ ہنس دیا۔

"لیلیٰ علی میں تمہیں اس قدر تو بزدل نہیں سمجھتا تھا۔ آخر کس سے ڈر کر بھاگ رہی ہو۔ اور کیا بھاگ جانے سے مسئلے پیچھے پیچھے نہیں آتے۔"

"احمق ہو تم۔" اس نے اکتاہٹ سے کہا۔ "میں کہیں بھاگ واگ نہیں رہی۔ میرا دانہ پانی اب یہاں

سے اٹھ گیا ہے۔ بس۔ اور میں یہاں رہ کر کروں گی بھی کیا۔"

"لیکن آپ جائیں گی کہاں۔" اس کی فکرمندی اسے بہت اچھی لگی۔ وہ مسکرا دی۔ کبھی ہمیں پتا ہی نہیں چلتا اور کوئی ہمارے لیے کتنا فکرمند ہو رہا ہوتا ہے۔

"خدا کی زمین کے بارے میں وہی فارسی والا محاورہ بولوں؟"

"اس زمین پر میں بھی بہت گھوما ہوں لیلیٰ علی۔ لیکن جس خیال کو بھلانے کے لیے انسان مارا مارا پھرتا ہے وہ وہیں دماغ میں اسی طرح جاگزیں رہتا ہے۔"

وہ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش ہو گئے۔

"تم سے ایک بات پوچھوں خان گل!" اس نے قنوطی سے لہجے میں گردن جھکائے جھکائے کہا۔ خان گل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کی طرف سے اس کو ہر سوال ہر جواب کی ازخود اجازت تھی۔

"تم نے عید کے جشن پر دانیال خان کا فیصلہ سنا تھا؟"

"سن لیا تھا اور میں تب ہی سمجھ گیا تھا۔ اب تم یہاں نہیں رکنے والی۔"

"ظاہر ہے خان گل۔" اس نے اس کے لہجے کی معنی خیزی کو نظرانداز کر دیا۔ "میری یہاں نوکری کا مقصد ہی اس دن ختم ہو جائے گا۔ لیکن میں تم سے کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اگر..." وہ اٹک اٹک کر رک گئی۔ "اگر بستی والے سرجن نثار اور شیریں کو قبول نہ کریں تو تم شیریں کو اپنا لینا۔ خان گل اعلیٰ ظرفی کے ساتھ بغیر کوئی احسان جتائے۔"

وہ حیرت سے اس کو دیکھتا رہا۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے بیلا۔ میں خود کو ہمیشہ دانیال خان سے بہتر انسان سمجھتا رہا ہوں۔ اور ایسا سمجھنے کی وجہ صرف یہ نہیں کہ میں سمجھتا ہوں اپنے میں۔ نہیں دیکھو بیلا' دانیال خان اس بستی کے بلاشرکت غیرے مالک ہیں' ان میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو کسی بھی لڑکی کے خوابوں کے شہزادے میں ہو سکتی ہیں۔ اتنی بڑی جاگیر' مردانہ وجاہت' ان کی تنہائی اور اوپر سے ان کا غرور مجھے ہر گام پر' ہر اقدام پر ان سے مقابلہ کرنا پڑا ہے لیکن اتفاق سے ہی مجھے Approval ان کے مقابلے میں زیادہ ملا ہے۔

کیا ہی اچھا ہوتا اگر... اگر تم یہ مطالبہ شیریں کے حق میں نہ کرتیں۔ بیلا اس بات کو پی جاتیں' چھوڑ دیتیں' مجھے' مجھے رد ہونے کا اتنا احساس نہ ہوتا۔ میں محبت کے معاملے میں شدت پرست ہوں۔ مکمل ہو اور بھرپور جس کے دماغ اور دل پر کوئی اور ہو اور اس کے جسم کو اپنی ملکیت بنا کر میری جاگیر میں کیا اضافہ ہو گا؟ ہاں اگر مجھے اس سے محبت ہوتی تو میں..."

"میں نے سوچا تھا خان گل...!"

"میں بات ادھوری نہیں چھوڑ سکتا۔" اس نے بے تابی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "ورنہ مجھے ساری عمر افسوس رہتا کہ میں نے تم سے کہا کیوں نہیں۔ کیا تم مجھ سے شادی کرسکو گی بیلا' شاید یہ بات کہنے میں میں نے دیر کر دی اور عید پر مجھے احساس ہوا کہ کوئی اور بازی لے گیا۔ لیکن اگر کوئی اور نہیں تو کیا میں بھی نہیں؟"

"تم یقیناً پاگل ہو گئے ہو خان گل۔" اس نے نخوت سے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہارے خیال میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں اس بستی میں اس لیے داخل ہوئی تھی کہ کسی سے عشق کر کے ہی نکلوں۔ کوئی اور بقول تمہارے کوئی اور نہیں تو تم اور تم نہیں تو۔۔۔؟" اس نے سوالیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔ "قیمت خان کرختہ خان؟"

"تمہیں غلط فہمی ہے خان گل۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔ میں اس حد تک تمہارا دل بھی نہیں توڑنا چاہتی۔ لیکن تمہیں کوئی آس بھی نہیں دلانا چاہتی۔ میں جھوٹی بات نہیں کہہ سکتی۔ اس لیے تمہیں صاف صاف کہہ دوں۔ میں اگر کسی شخص کو پسند کرتی بھی تو وہ تم نہ ہوتے۔"

اس کو اپنی ہتک کا شدید احساس ہوا۔ لحہ بھر کے لیے اس کا دل چاہا وہ نیفے میں بھری پستول نکال کر اس کا سینہ داغ دے۔ لیکن پھر اس نے صبر کر لیا۔

"یہ اچھی صاف گوئی ہے۔ جس نے انسان کو چھلنی چھلنی کر دیا۔"

"تم مجھ سے وعدہ کرو نا۔ تم شیریں کو عزت اور پیار ضرور دو گے۔"

وہ جھنجھلا گیا "اور تمہارا کیا خیال ہے میں جان ہتھیلی پر رکھ کر تم سے وعدہ کر ہی لوں گا اور تم سے عشق کرتے ہوئے زندگی اس کے ساتھ گزاروں گا اور آخری قصے پر تمہیں پتا چلے گا کہ آہ! یہ تو مجھ پہ مرتا تھا۔ یہ زندگی ہے بیلا بی بی! کوئی محبت بھرا ناول نہیں۔ جس کو پڑھ کر دل بھڑک اٹھے اور آنکھیں چھلک اٹھیں۔ بہرکیف مجھے خوشی ہے بیلا! تم نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ ہاں دنیا میں تم سے اچھے لوگ بھی ہیں۔ لیکن وہ تم نہیں۔ میں تمہاری خوشیوں کے لیے دعا گو ہوں اور خواہش کرتا ہوں کہ تم مجھے بالکل ہی بھلا نہ دینا۔ مجھے لگتا ہے میں نے تمہارے جانے کے فیصلے کو مزید مستحکم کر دیا ہے۔ اور مزید قریب بھی۔"

"نہیں۔ یہ تو پہلے مستحکم تھا۔ ہاں وقت سے پہلے کچھ ممکن نہیں! میری ضرورت نوکری ہے۔ میں نوکری کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔"

"اسکول میں پڑھالو۔"

"اسکول میں ہی پڑھاؤں گی۔ لیکن یہاں نہیں۔"

"یہاں کیوں نہیں۔ ہم لوگ تو یہاں ٹھہرتے ہی نہیں۔"

"پچھلے دنوں دانیال خان بتا رہے تھے کسی اسکول ماسٹر کی تقرری ہو گئی ہے۔ وہ آنے والا ہے۔"

"بات سنو بیلا۔" اس نے اسے جاتے جاتے روکا۔ "تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ واقعی بہت اچھی ہو۔ جس آدمی سے شادی کرو گی مجھے ضرور بتانا اور ضرور بلانا میں اس شخص کو دیکھوں گا اور سلوٹ کروں گا۔ وہ واقعی اس قابل ہوگا کہ تمہارا اعتماد جیت سکے۔"

"تم برا نہ منانا خان گل!" اس نے منمنا کر کہا۔ "میں یہ کہے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔"

"میں نے قطعی برا نہیں منایا اور میں تو بہت خوش ہوں۔" وہ الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے مایوس اور شکست خوردہ سی لٹی لٹی بیٹھی رہی۔ انسان کا اپنی زندگی پر اس سے زیادہ اختیار نہیں۔ بعض اوقات وہ دوسروں کو خوشیاں دینے نکلتا ہے اس میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اپنے مقدر میں کوئی خوشی نہیں ہوتی۔

کاش وہ سرجن نثار کو سرا باندھ کر اس بستی میں آتا دیکھنے کی سعادت حاصل کر سکتی۔ لیکن اسے یہاں سے ہر حال میں چلے جانا تھا۔ وہ یہاں ٹھہر ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ اپنے ارادے میں اتنی سخت اور اتنی اٹل تھی کہ اس نے ان تمام لوگوں کا ساتھ بالکل ہی چھوڑ دیا جو اس کے ارادے کو کمزور بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔

بے بے اسے پیغام بھیج بھیج کر بلاتی رہتیں لیکن وہ منہ سر لپیٹے جیسے بہری بنی رہتی۔ جاتی تو رسمی سی گفتگو سے اپنا پلہ چھڑا لیتی۔ وہ حیران پریشان سی تھیں۔ بیلا نے ایسی انوکھی حرکتیں تو کبھی کی نہیں تھیں۔ اور یہ بھی وہ ان لوگوں سے سن رہی تھیں کہ وہ عنقریب جانے والی ہے۔ کیا وہ واقعی چلی جائے گی۔ یا شاید مہمانوں کی موجودگی نے اس کو اس قدر چڑچڑا کر دیا تھا۔ لیکن اب تو وہ جا چکے تھے۔ اور کوئی رکاوٹ کوئی وجہ جھنجلاہٹ ان کے سامنے تھی بھی نہیں۔

وہ خان گل کا سامنا کرنے سے کتراتی اگر مجبوراً ہی اس کو ان لوگوں کی محفل میں بیٹھنا پڑ جاتا تو جیسے رستے تڑانے کی کوشش میں لگی رہتی۔

شیریں چھٹی گزار کر واپس چلی گئی۔ مہمان رونق ساتھ لے گئے (ساتھ ہی دل کا سکون بھی) اور وہ اپنی جگہ ویسے کی ویسے تھی۔ یہ عجیب لوگ ہیں جو ایک لڑکی کو گھر سے دور دراز ایک یونیورسٹی میں پڑھنے کی اجازت تو دے دیتے ہیں۔ اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کو شادی میں اپنی مرضی کا اختیار نہیں دیتے۔

پھر بے بے سوچتیں۔ اگر اس نے واقعی جانے کا سوچ ہی لیا ہے تو یہ جاتی کیوں نہیں۔ کون سی بات کون سی وجہ اس کے لیے رکاوٹ بن گئی ہے۔

بے شک وہ جا ہی نہیں سکتی تھی۔ تاوقتیکہ وہ اس سے مل نہ لے۔

وہ دن ہی شاید بستی میں اس کا آخری دن ہو۔

اور اس دن نے آنے میں بہت دن نہیں لگائے۔ اگلے ہی روز اس کو پتا چلا بستی میں کوئی ہیجان آگیا ہے۔ دانیال خان نے جرگے کو شیریں کی شادی کے مسئلے پر اکٹھا کیا تھا۔ اپنی رائے پیش کی تھی اور ان کی رائے لینے کے لیے وہ بے قابو ہجوم کو ہموار ہی کر رہے تھے کہ قیمت خان نے کوئی اطلاع دی اور مجمع تتر بتر ہو گیا۔

پری نے سب سے پہلے اسے بتایا تھا "مجمع دانیال خان کے کہنے پر تتر بتر ہو گیا لیکن پتا نہیں خان نے کیا بات کی کہ ہجوم غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ ابھی بات بڑھ ہی رہی تھی کہ بابا کوئی اطلاع لایا۔" اس کے بعد بابا شہر سے باہر چلا گیا۔ خان بھی شاید کیا آپ سچ مچ چلی جائیں گی ہم سب کو چھوڑ کر؟"

☆ ☆ ☆

گھوڑا تیار رہتا ہمیشہ کی طرح اور وہ بھی چابکدستی سے سوار ہو گئی۔ ہمیشہ کی طرح۔

اگر قیمت خان سیدو شریف بھی چلا گیا اور اس نے صرف آنا جانا ہی کیا تو بھی چھ سات گھنٹے سے کم کا فاصلہ ہی نہیں۔ یہ دن یقیناً بستی میں آخری دن تھا اس کو فیصلہ کرنے میں بھی سہولت ہو گئی۔

اس نے گھوڑا مخصوص جگہ روکا تو اس کو لگا۔ اس کے گھر میں آج نمایاں تبدیلی ہے۔

گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا ہے جیسے رہنے والے نے کسی کے انتظار میں عمر بھر کے لیے وا کر دیا ہو۔ پردہ غیر مسلسل چلنے والی ہوا سے کبھی کبھی لہرا کر باہر آتا تھا۔ وہ بغیر رکے دوڑتی دوڑتی اندر چلی گئی۔ یہ وہی کمرہ تھا

جہاں بہت سے دکھ درد آسانی سے جھاڑ کر باہر آئی تھی۔

وہ اس کا کچھ بھی نہیں تھا اور سب کچھ تھا۔

اس قسم کے ناتے کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ ان کو کوئی نام دینا کتنا دشوار ہے لیکن یہاں آ کر آپ ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں خوش باش۔

وہ کھلے دروازے سے سکون سے اندر آ گئی۔

پہلا کمرہ ہی اس کا تھا۔ وہ تکیوں کے سہارے مسہری کی پشت سے ٹیک لگائے جیسے شدید بیمار تھا۔ وہ آئی بھی اتنی مدت بعد تھی۔ معلوم نہیں بے چارہ کب سے بیمار تھا۔ اچانک ہی اس کے سر اور داڑھی کے بالوں میں بہت سفید بال آ گئے تھے۔ چہرے کی رنگت اور آنکھوں کی نقاہت بتاتی تھی۔ اس نے کوئی بھی سخت سی تکلیف جھیلی ہے۔ یہ کیسی عجیب مفاہمت ہے۔ وہ اچھے برے وقت میں اس کے کام نہیں آ سکتی لیکن اپنے لیے وہ ہمیشہ سے بھاگتی دوڑتی چلی آتی ہے۔

اس نے ایک نظر ہانپتی سی بیلا کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ صحت مند توانا مسکراہٹ۔

کیونکہ بیماری جسم کو آتی ہے۔ جذبے نحیف نہیں ہوتے۔

"تو یہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ میں اس وقت اللہ سے تمہارے آنے کی دعا مانگ رہا تھا لڑکی!"

"آپ کچھ اور مانگ لیتے۔" وہ تاسف سے اس کے بستر کے نزدیک پڑی آرام دہ کرسی پر دراز ہو گئی۔

"مثلاً؟"

"مثلاً رہائی کی دعا۔"

"نہیں بھئی اب رہائی ملی بھی تو مر مرا جائیں گے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے صیاد سے، چارہ گر سے اور جانے کس کس سے مانوس ہو گئے ہیں۔ کیسی ہو؟"

"آپ کیسے ہیں؟" اس نے الٹ کر پوچھ لیا۔ "بیمار ہیں۔"

"تھا بیمار۔" وہ مسکرا دیا۔ "اب تو نہیں ہوں، مجھے یقین تھا تم آؤ گی تو میں اچھا ہو جاؤں گا۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو، سچی دوست۔" اس نے نقاہت سے کہا۔ "اگر تم آس پاس نہ رہیں تو میرا کیا بنے گا۔" وہ سخت بیمار تھا لیکن۔۔۔

"اگر دوست اس قابل ہوتی تو تم پہلے ہی اس کے پاس ٹھہرتیں۔"

"پہلے وہاں نہ ٹھہرنے کی ایک جذباتی سی وجہ تھی لیکن اس ایک سال نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ اب کوئی وجہ نہیں اب میں سب کا سامنا کر سکتی ہوں۔"

وہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اس نے ایک گہری نظر اس کی طرف دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم سچ مچ چلی جاؤ گی۔ کیا ایسی ہی کوئی جذباتی وجہ یہاں سے تو نہیں لے جا رہی ہے۔"

وہ گنگ رہ گئی۔ وہ ہمیشہ اس جن سے ڈرتی تھی۔ اسے انسانوں کو چھلنی میں چھان کر دانہ دانہ علیحدہ کر دینے کا ہنر آتا تھا۔

وہ ساری دنیا سے منہ پھیرے کتنا انسان شناس تھا۔

مسکراتا تھا محض دوسروں کی دلجوئی کی خاطر۔

اس بستی میں ہر جگہ خلوص کی فراوانی تھی اور اس فراوانی نے معاشیات کی رو سے خلوص جیسی چیز کو بے مایہ کر دیا تھا۔

اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"آپ کو ہوا کیا ہے؟"

"میں تو بیمار تھا لیکن تمہیں کیا ہوا ہے؟"

وہ جھینپ گئی۔ وہ اپنے تیز نیجے سیدھے دماغ میں گھونپ دیتا تھا۔ اس سے چھپنا، رازداری برتنا یا پردوں میں رہنا سخت عذاب، وہ دیر تک اس کے چہرے پر اپنی بیمار نظریں گاڑے کچھ سوچتا رہا۔

"افسردہ ہو۔"

"نہیں تو میں تو دراصل یہ بتانے آئی تھی کہ میں یہ بستی چھوڑ کر جا رہی ہوں۔"

"اور بستی چھوڑی نہیں جاتی۔ دیکھ لو یہ کیسی منحوس جگہ ہے۔"

"لیکن میں تو چھوڑ رہی ہوں۔"

"ہاں پر خوشی خوشی نہیں۔ ورنہ چھوڑ چکی ہوتیں۔"

"میں نے صرف آپ کو خدا حافظ کہنے کے انتظار میں اتنا وقت لگایا ہے۔" اس کی سادہ سچائیاں ہمیشہ اس کی جان جلاتی تھیں۔

"اب مل چکی ہوں تو چلی جاؤں گی۔"

وہ تھوڑا سا متفکر ہو گیا۔ "میں تمہارے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتا تم کون ہو۔ کہاں سے آئی ہو اور اتنی دور تک کیسے پہنچ گئیں۔ اب معلوم نہیں تم کہاں پہنچ رہی ہو، وہاں میرے تصور کی رسائی ہے بھی۔"

وہ خاموش سی رہ گئی۔ وہ تو یہ دعویٰ کرنے سے بھی قاصر تھی کہ یہ بستی چھوڑ دینے کے بعد اس کے تصور کی رسائی یہاں تک ہو گی کہ نہیں۔

"میں تو لاہور سے آئی تھی۔" اس نے اس کی بات کا کیو لے کر کہنا شروع کیا۔ "وہاں میرا گھر تھا۔"

"ارے تو کیا تم گھر سے بھاگ کر آئی تھیں۔" اس نے انتہائی دلچسپی سے پوچھا۔

"جی نہیں، میرا گھر مجھ سے چھن گیا تھا اور ماں باپ فوت ہو گئے تھے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ بعض باتیں سنگین نوعیت کی سنجیدگی میں داخل ہو جاتی ہیں۔ ان سے مذاق کرنا بھونڈا پن ہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا جیسے اس کی بہادری کو خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔

"افسوس ہے بعض سوالات پہلے دن میں نے غیر ضروری اور رسمی سمجھ کر ترک کر دیے تھے۔ حالانکہ کر لینے چاہیے تھے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"شاید میری طرح تم بھی روایت شکن ہو۔ میں تمہیں ابھی سے ڈراتا ہوں لڑکی۔ روایات توڑنے کی پاداش میں لمحہ لمحہ سنگسار ہونا پڑتا ہے۔ ہر قدم پر ٹھوکر، ہر لحظہ دکھ، وہ کسی شاعر کا کیا اچھا شعر ہے۔ وہ جو تم کتابیں چھوڑ کر گئی تھیں۔ میں نے اس میں پڑھا تھا۔

روایتا" بھی نہ دیکھے ہماری سمت کہ ہم
ہزار مصلحتیں شمار کرتے ہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آپ شاید نہ ہوں۔" اس نے افسردہ دلی سے کہا۔ "لیکن میں اپنی روایات کا ایک حصہ ہوں۔"

"یہاں سے اٹھو گی تو پھر کہاں جاؤ گی۔" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"میری ایک دوست ہے۔"

"میں نے جذباتیت ترک کر دی ہے۔" اس نے چور سے لہجے میں کہا۔

"سوچ لو۔ بعض اوقات واپسی کے راستے بند تو نہیں تنگ ضرور ہو جاتے ہیں۔"

"نہ سہی واپسی۔ انسان آگے بھی تو نکل سکتا ہے۔"

"آگے تو جنگل ہے۔ اور مشہور ہے کہ جنگل میں درندے ہوتے ہیں۔"

"ضروری تو نہیں کہ جو بات مشہور ہو وہ صحیح بھی ہو۔ یہ بھی تو مشہور تھا اس گھر میں ایک خوف ناک چیتا رہتا ہے۔"

"میں ایک چیتا ہی ہوں۔ خوفناک' خونخوار' چیر پھاڑ کر کھا جانے والا' جاؤ لڑکی۔" اس نے اپنا لہجہ بدل کر مایوسی سے کہا۔

"گو میں چاہتا تھا میری زندگی میں تم یہیں ٹھہرو۔ لیکن میں تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بننا چاہتا۔ مگر میں سوچتا ہوں' انسان جہاں رہتا ہے وہاں کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ تم ان سب چیزوں کو کیسے چھوڑو گی۔ یہاں بہت سی اور رکاوٹیں ہیں۔ یہ بستی ہے' بستی کے لوگ ہیں' اور دانیال خان ہے' ہو سکتا ہے تم ان کو سہولت سے چھوڑ دو' اور وہ تمہیں چھوڑ بھی نہ سکیں۔"

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

کتنے دن سے ضبط کرتے' پہرے بٹھاتے' بند ھن باندھتے آنسو۔

اس نے بے پروائی سے اس اجنبی آدمی کے سامنے بے دریغ بہا ڈالے۔

"ان میں سے کسی کو بھی میری پروا نہیں ہے۔"

اس نے سوچا بھی نہیں تھا ایک دن اس پر یوں بچوں کی طرح رقت طاری ہو گی وہ اپنے سارے دکھڑے ایک ایسے شخص کے سامنے کھول بیٹھے گی۔ جس کو وہ ڈھنگ سے جانتی بھی نہیں۔

وہ اس کے رونے سے گھبرا گیا' کمبل سے پاؤں لٹکا کر وہ بستر پر بیٹھتے ہراساں سا ہو گیا۔

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا' میں جانتا ہوں دانیال خان کو تمہاری کتنی پروا ہے۔ تمہارا کتنا خیال ہے۔ اور تم سے کتنا پیار ہے۔"

"اور شاید اسی لیے وہ عدیلہ خٹک سے شادی کر رہے ہیں۔"

اس نے خاموشی سے اس کا سر اپنے کندھوں پر رکھ لیا' اس ویرانے میں ایک اجنبی دوست کے کندھے پر سر رکھ کر کسی دوسرے اجنبی کے لیے رونا اس کو بہت عجیب لیکن بہت اچھا لگا' بہت دیر وہ فرصت سے اس کے کندھے سے لگی آنسو بہاتی رہی۔ وہ خاموشی سے اس کو غبار نکلنے کا موقع دے کر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ شاید لفظوں کی ثنائی اور فقروں کی کاریگری ساری دھری رہ گئی۔

اور بولنے کو ایک بھی معقول لفظ نہیں بچا۔

اس نے اس کے آنسو پونچھے تھے نہ رونے سے منع کیا تھا۔ جس شدت سے اس کے آنسو گرے تھے

اسی ریلے میں رک گئے۔

وہ قید میں تھا اور بیمار بھی۔ بجائے اس کا حال پوچھنے کے وہ اپنے دکھڑے لے بیٹھی۔ وہ بڑی خاموشی سے پیار سے اس کی پیٹھ تھپکتا جیسے اس کو دلاسا دینے کے خاموش حربے آزماتا رہا۔

اس نے آنکھیں خشک کر لیں۔

"آپ نے کچھ کھایا بھی؟ آپ تو بیمار ہیں۔ آج آپ کا کھانا کون بنائے گا۔" جیسے اس نے گال رگڑ کر ایک نیا فیصلہ کر لیا۔

"میں آپ کے لیے سوپ بنا کر لاتی ہوں۔" وہ اس کے منع کرنے کے باوجود اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

خالص گرہستن کی طرح وہ دروازے میں سے سر نکال نکال کر اس سے گپ لگاتی رہی۔

"کیا بیماری ہے جو آپ کو؟ جس کا علاج نہیں ہو رہا۔ کیا یہ لوگ آپ کو مار دینا چاہتے ہیں؟"

وہ مسکرا دیا۔ وہ اپنی بہادری میں حالیہ بزدلی کے رونے کو چھپانے کے سارے جتن کر رہی تھی۔

"زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے لڑکی۔"

"اور انسان کے ہاتھ میں کیا ہے۔ تدبیر نہیں؟"

چولہے پر رکھا ہڈیوں کا عرق چھن چھن کر کے ابلا۔ وہ دروازے میں سے اپنا مسلسل گپ لگاتا سر ہٹا کر چولہے کی طرف دوڑی۔

"مجھے پورا یقین ہے۔" اس نے باورچی خانے میں کھڑے کھڑے اپنی آواز کے یقین کو بلند کیا "کہ دانیال خان ہرگز نہیں جانتے آپ قید ہیں۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ وہ کسی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔"

آگ ہلکی کر کے وہ باورچی خانے کے دروازے سے باہر آئی۔ اور خوف سے اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی۔

سرجن نثار اور دانیال خان اس کے بستر کے بالکل نزدیک خاموشی سے کھڑے تھے۔ انہوں نے باورچی خانے سے بلند ہوتی آوازیں بھی سنی تھیں۔ اور دروازے سے نکلنے کے بجائے اپنی جگہ گم صم اسے دیکھا بھی تھا۔ لیکن انہوں نے اس کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی۔ وہ پانی کی روانی سے بستر کی طرف لپکے۔

وہ ہنس دیا۔

"ابھی ابھی یہ لڑکی تمہارے خلاف بہت بول رہی تھی دانیال خان۔ میں گواہ ہوں' عینی شاہد۔" ان کی آواز میں کمزوری کا غلبہ تھا۔

دانیال خان نے پلٹ کر پھر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔

کتنی دیر وہ حیرت سے پتھر کی مورتی بنی اپنی جگہ گڑی رہی۔ دانیال خان نہ صرف یہاں آتے جاتے ہیں۔ بلکہ ان کی قیدی سے گفتگو میں ان کا والہانہ پن بھی نمایاں تھا۔

جیسے وہ ایک دوسرے سے خوب آگاہ ہوں۔

انہوں نے بیلا کو اس طرح باورچی خانے کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر بھی کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اعتراض تو در کنار انہوں نے معمولی سی حیرت کا اظہار بھی نہیں کیا' دانیال خان اس کے بستر پر بیٹھے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کے بیمار چہرے پر جھکے اپنی زبان میں جانے کون سی کہاوتیں کہہ رہے تھے۔

اور ان کے بستر کے بالکل نزدیک ہاتھ میں اپنا میڈیکل ایڈ بکس پکڑے سرجن نثار خاموش اور سنجیدہ لیکن قطعی لاتعلق‘ پتا نہیں یہ سکون اور ٹھہراؤ کا تعلق لاتعلقی کا یہ انداز اور کتنی دیر ہے جانے کب دانیال خان اپنا چولا اتاریں اور پھٹ پڑیں۔ سرجن نثار۔ اس نے کن انکھیوں سے سرجن نثار کی طرف دیکھا‘ سرجن نثار کو روایات توڑنا برا لگتا ہے شاید وہ بھی اس کا ساتھ نہ دیں یا شاید سرجن نثار کی وجہ سے اس کی گلو خلاصی ہو سکے یا وہ قیدی‘ وہ آسانی سے اس کا تماشا نہیں بننے دے گا۔ اس میں نقاہت کے باوجود اس کی حفاظت کا جذبہ موجود ہے۔

ان دونوں کے درمیان جو مذاکرات تھے غالباً ”کسی مرحلے پر پہنچ کر اختتام پذیر ہوئے۔ سرجن نثار اپنا بکس کھولنے لگے۔ دانیال خان پہلی مرتبہ اس کی طرف پلٹے۔

”ذرا دیکھنا‘ باورچی خانے میں گرم پانی ہوگا۔“ جیسے وہ روزانہ ہی اس سے یہاں ملاقات کے عادی تھے۔ سرجن انجکشن کی تیاری میں تیز دھار سے ڈسٹلڈ واٹر کی شیشی کا گلا کاٹنے لگے۔

”اور ایک گلاس دودھ لاؤ گرم گرم‘ مہربانی کر کے۔“

وہ خاموشی سے ان کے احکامات کی تعمیل کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔

”یہ مہربانی کر کے۔“ لفظ پورے فقرے میں جیسے ٹھونسا ہوا لگ رہا تھا‘ وہ کٹوری اٹھا کر ابلتا ہوا پانی لیے سرجن نثار کی طرف چلی آئی۔

”لڑکی تم بھی ان کے ساتھ مل گئی ہو؟“ وہ بیماری میں ہنسنے کی کوشش کرتے بولا۔

”یہ سرجن نثار نے تو میرے بازو چھلنی کر دیے ہیں۔“ اس نے قمیص کی آستین رول کر کے اوپر چڑھائی۔

”افسوس ہے۔ لیکن بہت ضروری ہے۔“ اس کو بہت عجیب لگا‘ ہر وقت مذاق کے موڈ میں رہنے والے سرجن نثار بالکل سنجیدہ‘ بالکل خاموش تھے۔

”میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے دانیال خان‘ اس دن بھی میں نے گولی چلائی تھی تو تم نے ہاتھ مار کر اپنی ٹانگ زخمی کر لی تھی۔“

غیر شعوری طور پر دانیال خان کی نظریں لڑکھڑا کر بیلا سے ٹکرائیں۔ پھر انھوں نے بدل لیں۔

”علاج اس طرح نہیں ہوتے۔“ انھوں نے اسی کی سی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”آپ ابھی ہمارے ساتھ اسپتال چلیں گے اسی وقت۔“

”میں یہ گڑھی چھوڑ کر چلا جاؤں۔“ انھوں نے جھنجلا کر روہی زبان میں کہا۔

”اب اس وقت اگر میرا یہ آخری وقت ہے تو مجھے یہیں ختم ہونے دو۔“

دانیال خان کتنی دیر بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھا اور نہایت ضدی۔ سرجن نثار تھوڑا سا اس کی طرف جھکے۔ اسی طرح مودب اور اسی طرح سنجیدہ۔

”ہم آپ کو واپس لے آئیں گے۔ جونہی آپ ٹھیک ہوئے‘ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔“

وہ ہٹیلے لہجے میں سر کو زور زور سے نفی میں ہلاتا رہا۔

سرجن نثار ایک قدم پیچھے ہٹے۔ بستر کی طرف چپ چاپ کھڑی بیلا کو انھوں نے ہلکا سا اشارہ کیا۔ وہ اس

کو اکسا رہے تھے۔ بیلا نے حلق سے تھوک نگلا۔ اس کو کیا کہنا چاہیے۔

”میری عمر بھر کی ریاضت برباد نہ کرو۔“ وہ اپنے فیصلے پر اسی طرح قائم تھا۔

اور اب وہ کیا کہے‘ کیا کرے‘ کون سے دلائل دے‘ کس قسم کی باتوں سے قائل کرے۔ وہ کچھ بھی آگاہ نہیں تھی۔ پھر وہ خاموشی سے آگے بڑھی‘ سرجن نثار کسی کے لیے غلط فیصلے نہیں کر سکتے۔ اس نے حتمی لہجے میں سوچا۔ پھر اس نے ان زرد بیمار ہاتھوں کو آہستگی سے اپنے ہاتھوں میں تھپکتے ہوئے کہا۔

”پلیز اپنے اوپر رحم کریں‘ ہم سب کی خاطر۔“

اس نے مہربان لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا اور ہنس دیا۔ ”یہ شہروں کی وبا اس گڑھی تک آ گئی ہے۔ سفارش‘ کس طرح جاتا ہے؟ کیا بندوبست ہے؟“ وہ نیم رضامندی سے ادھر ادھر دیکھتے بولا۔

”آپ دودھ پی لیں‘ بندوبست سب ہے۔“

وہ چپ چاپ گرم دودھ کے گھونٹ بھرتا رہا‘ پھر اس نے خالی مگ بیلا کو پکڑا دیا۔

انجکشن کے زیر اثر وہ آہستہ آہستہ غفلت کی سی نیند میں جا رہا تھا‘ وہ آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑایا بھی‘ پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔

”ذرا یہ دوسرے کمرے سے تکیے لا دینا۔“ دانیال خان اس کو سہارا دیتے لٹاتے ہوئے بولے۔

”ان کو پھر اٹھانا پڑے گا‘ کیا بہتر نہیں ایک مرتبہ ہی ان کو گاڑی میں بٹھا کر...“

”ازراہ کرم۔“ انھوں نے سختی سے اپنی آواز دباتے ہوئے کہا۔ ”بہتر نہیں ہوگا کہ آپ مجھے نصیحت کرنے کے بجائے میری بات مان لیں۔“

وہ بے ساختگی میں لپکی‘ ملحقہ دروازہ کھول کر وہ تیزی سے اندر داخل ہو گئی‘ صرف ایک لمحے نے اس کو چونکا سا دیا۔ سارا کمرہ مختلف مجسموں سے اٹا پڑا تھا‘ حتیٰ کہ وہ ظالم چہرے والا مجسمہ جو گیلری کے عین سامنے اس کو خوف زدہ کرتا رہتا تھا‘ یہاں بے حساب تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کر فرصت سے مجسموں کی تاریخ پر بحث نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے وارڈ روب کھول کر تکیے نکالے اور تیز رفتاری سے نکل گئی۔

انھوں نے نیم غنودگی میں مدہوش اس کے سر کے اور پیروں کے نیچے تکیوں سے سہارا دے دیا۔

”یہاں سے ہلنا نہیں بیلا۔“ انھوں نے بنا کسی کو مخاطب کیے وثوق سے کہا ”بیٹھی رہنا۔“

اسے بیٹھنا ہی تھا‘ وہ چپ بیٹھی رہی‘ دانیال خان تیزی میں نکل گئے۔ سرجن نثار وقفے وقفے سے مریض کی ناک اور نبض چیک کرتے رہے‘ وہ سہمی ہوئی خاموش کھڑی رہی۔

زندگی کتنی عجیب چیز ہے۔ ابھی وہ ہنس بول رہا تھا‘ ابھی اس کی جان پر بن گئی۔ شاید اسے معلوم بھی نہیں تھا تھوڑی دیر تک وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جائے گا‘ اور کیا معلوم وہ جانتا ہی ہو۔ اس کی جادوگری سے کوئی بعید نہیں۔ اس کی ہمت نہیں پڑی مریض کی صحت کے بارے میں سرجن نثار سے کوئی سوال کرے۔ پتا نہیں سرجن نثار اس کو کیا کہہ دیں اور کیا نہیں۔

باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ سرجن نثار تیر کی سی تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔ اسی تیزی میں قیمت خان بہت سے لوگوں اور بہت سے آلات کے ساتھ آیا تھا‘ وہ لوگ سرجن نثار سے کچھ تفصیلات پوچھنے لگے۔ پھر انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اس کو ایمبولینس میں ڈالا اور سارا منظر لمحہ بھر میں صاف ہو گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ بت کی بت اور خاموش کی خاموش۔

اس نے بچپن میں ایک ڈوبتے جہاز کی کہانی پڑھی تھی۔ اس میں چھوٹے بچے کے باپ نے اس کو وہیں کھڑے رہنے کا حکم دیا تھا اور وہ وہیں کھڑے کھڑے ڈوب گیا تھا۔ اس کو بھی شاید ڈوبنے کا انتظار تھا۔

یا اگلے فیصلے کا' وہ ڈوبتے ڈوبتے پوچھ رہا تھا' بابا میرے لیے کیا حکم ہے؟

وہ خاموش اسی طرح ساکت کھڑی ڈوبنے کی منتظر تھی کہ اچانک قیمت خان پلٹ آیا' اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ' سرد اور سنگین تھا۔

"خان کا حکم ہے آپ کو گھر پہنچا دیا جائے۔" اس نے دیکھا' مودب لہجے میں بھی وہ کس قدر گستاخ تھا۔

"جلدی کیجئے۔" اس نے اس کو خاموش دیکھ کر ٹوکا۔ "ابھی مجھے اسپتال پہنچنا ہے۔"

باہر دانیال خان کی جیپ کا کھلا دروازہ اس کا منتظر تھا۔ وہ چپ چاپ اس میں جا بیٹھی۔

پیچھے پلٹ کر اس نے ایک نظر سفید گھر کی طرف دیکھا۔ اداس اور ویران معلوم نہیں وہ اس گھر کو پھر کب دیکھ پائے گی۔ اس گھر نے بہت مرتبہ اس کی اشک شوئی کی تھی حتیٰ کہ ایسے کڑے وقت میں بھی وہ اس کے ساتھ تھا۔

"جلدی کریں جی۔" اس نے اس کے اکھڑ لہجے کو سنا۔ وہ کس قدر بے زاری سے اس سے مخاطب تھا۔ اکتایا اور تنگ تنگ۔

یونہی پیلا کا جی چاہا اس کی دم پر پیر رکھے۔

"کیوں قیمت خان' تم نے مجھے یہاں دیکھا' اور گولی نہیں چلائی۔"

"آپ کی یہاں موجودگی سے ہم میں سے کوئی بھی کبھی لاعلم نہیں رہا۔" اس نے گاڑی گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہم نہایت ہی نامعقول پہرے دار ہوں گے۔ اگر آپ کی ان سرگرمیوں سے لاعلم رہیں۔ ہم ایسے ہوتے تو راتوں رات ہماری بستی کوئی اکھاڑ کرلے جائے اور ہمیں علم نہ ہو سکے۔ یہ تو سردار دانیال خان تھے جن کے حکم پر ہم چپ رہے۔" اس کا لہجہ ویسا ہی لاتعلق تھا۔

وہ اپنا سامنے لے کر پیچھے بھاگتے درختوں کی گنتی کرنے لگی۔ راستہ ناہموار تھا اور جیپ بے تحاشا ہچکولے کھا رہی تھی' منزل غالباً "کہیں دور" تھی جب وہ اس کو گھر کے سامنے اتار کر تیزی میں دوڑا۔

عجیب و غریب وقت گزر ہی جائے گا' وہ رات تک خود کو مختلف چیزوں میں الجھائے رہی۔ اسے یہاں سے بہر کیف جانا تھا' لیکن اب تو جانا جیسے بالکل ہی واجب ہو گیا تھا۔

دانیال خان کتنی مرتبہ اس کی نظروں سے گرے اور اٹھے تھے۔

لیکن یہ ایک عجیب حادثہ تھا' وہ ایک آدمی کو قید کر کے اس کی جان سے کھیل گئے۔ وہ قاتلوں کے اس کھیل میں لمحہ بھر کے لیے بھی شریک نہیں ہو سکتی۔ خواہ اس بستی کو چھوڑنے کی اس کو کوئی بھی قیمت کیوں نہ دینی پڑے۔

لیکن چوروں کی طرح چھپتے چھپاتے بھاگنے کے بجائے وہ علم کھلا اعلان کر کے جائے گی۔ وہ دشمنوں پر ان کے سارے راز عام کر کے جائے گی۔ اس بستی میں جس میں قدم قدم پر اتنی پستی ہے۔ وہ سرجن نثار اور شیریں کو شادی کرنے سے روکنے والے کون ہوتے ہیں۔

اس نے اشتعال میں اپنا لاہور سے لایا بیگ گھسیٹا۔ اور وہاں سے لائی چیزیں سمیٹ کر جلدی جلدی

بیگ میں گرانے لگی۔

رات گئے اسے پتا چلا دانیال خان اپنی لائبریری میں کسی بڑی مصروفیت میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس نے رسمی اجازت نامے بالائے طاق رکھ کر تیزی میں وہ دو تین سیڑھیاں عبور کر لیں۔

وہ پرانی بوسیدہ فائلوں سے کچھ تلاش کر رہے تھے' اس کو وہاں دیکھ کر لمحے بھر کے لیے ان کے چہرے پر روشنی کوندی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے لپکتے عزائم ذرا بھی ڈھکے چھپے نہیں تھے۔

"آؤ پیلا۔" انہوں نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔

وہ کچھ دیر چپ چاپ دروازے کے پاس لگی خاموش کھڑی رہی۔ بھلا دو لفظوں کی سادہ سچائی بیان کرنے کے لیے اندر آکر صوفوں میں جم جانے کی کیا مصیبت تھی۔

"تم جانے کون کون سی باتوں پر مجھ سے خفا ہو پیلا۔" وہ فائلیں وہیں گرا کر خاموشی سے اپنے مخصوص آرام دہ صوفے پر آگرے۔

"اور تم واپس بھی جا رہی ہو۔ میں تمہاری ساری خفگیاں تو دور نہیں کر سکتا۔ لیکن نثار کی شادی کے لیے تم سے کیے وعدے پر میں قائم ہوں۔ تم اس شادی میں تو شرکت کر لو۔ بے بے کو تو اس ناراضگی کی وجہ بتا ڈالو۔ وہ بہت بوڑھی ہیں اور بہت مایوس۔ ان سے شاید یہ صدمہ برداشت نہ ہو۔ اور شیریں خان کل کیا تم نے سوچ لیا ہے' تم کسی کی خوشی کے لیے چند دن بھی نہیں ٹھہرو گی۔" ان کی آواز منت کے سے لہجے سے شروع ہو کر جھنجلاہٹ میں داخل ہو گئی تھی۔

"تم بہت خود غرض ہو پیلا۔ میرا خیال ہے میں جو کچھ آج تک تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں' مجھے اس سلسلے میں اپنی رائے بدل لینی چاہیے۔ تمہیں تو اس شخص کا بھی احساس نہیں جو اس وقت بار بار زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے۔"

"اور بے غرض آدمی تو آپ ہی ہیں۔ جو اس کو اپنی جنگ میں جھونک کر یہاں مزے سے اپنی جاگیر میں اضافے کے۔۔۔؟"

"مگر مجھے تمہیں اس کی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے اس کی بات کاٹ کر خفگی سے کہا۔ "لیکن یہ اسی کی ضرورت کے چند مطلوبہ دستاویزات ہیں جن کو میں تلاش کر رہا ہوں تاکہ زندگی کو اس کے لیے چند دن اور ڈھونڈ سکوں۔"

"وہ بچ تو جائیں گے نا؟" اس کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔

"وہ بچ کر کریں گے بھی کیا؟"

"دانیال خان۔" اس نے پہلی مرتبہ ان کو فیصلہ کن لہجے میں ان کے نام سے پکارا تھا۔ اور وہ بھی اس انداز میں کہ جس نے دانیال خان کو چونکا دیا۔

"آپ نے ایک شخص کو اپنی ذاتی وجہ سے قید کر دیا' آپ نے ان کو بیمار کر دیا۔ ساری زندگی وہ علاج سے محروم رہے۔ حتیٰ کہ وہ موت کے منہ میں جا پہنچے۔ اب آپ ان کے لیے زندگی ڈھونڈ رہے ہیں۔

میں تو اس بستی سے چلی ہی جاؤں گی۔ لیکن مجھے میری خود غرضی یاد دلانے سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ کی اس شخص سے کیا دشمنی تھی۔ کیا بگاڑا تھا اس نے آپ کا؟"

"دشمنی۔۔۔!" انہوں نے حیرت سے دہرایا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"تو تم کچھ نہیں جانتیں نیلا؟" وہ اس کے برابر آ کھڑے ہوئے۔ "وہ میرا سگا بھائی ہے۔ سگا میں نے اسے جیتوں کے آگے نہیں ڈالا۔ بستی والوں کے خوف سے چھپا دیا۔"

☆ ☆ ☆

کسی بہت ہی اوق زبان میں بولے گئے ان لفظوں کے جیسے وہ معنی سے آگاہ نہیں تھی۔
کبھی غلطی سے بھی اس کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ کیا وہ اتنی ہی کند ذہن' ایسی ہی کم عقل تھی۔
وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مخاطب کے اس انکشاف پر یقین کر لینے یا نہ کر لینے کی سی کیفیت سے دوچار پریشان ہو رہی تھی۔ یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ اور حیرت اس قیدی کے ضبط پر ہے جس نے اتنی معمولی بات کو اتنا بڑا راز بنا کر کبھی زبان نہیں کھولی۔ حالانکہ وہ اس سے کتنا پیار کرتی تھی۔ کتنا احترام کرتی تھی۔ لیکن اس نے اپنی زندگی کے اس معمولی سے سبق میں بھی اس کو شامل کرنا پسند نہیں کیا گویا وہ اس کا بھی شمار بستی کے ظالموں میں سے کرتا تھا۔ اس کو اچانک جھنجلاہٹ سی ہونے لگی۔
کیا اس کا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ اس پر بھروسہ کرتا اور اپنی کہانی سنا ڈالتا۔ وہ اس کا پیارا اور بے غرض سا دوست جیسے بالکل روکھا اور اجنبی اجنبی ہو چکا تھا' وہ غالباً "اس کو بھی بستی کے چند ظالموں میں سے سمجھتا تھا۔ دل اور ذہن کے سارے رشتے اس کے نزدیک بے ہودہ' بے کار اور رسمی ہی ہوئے۔ اس میں اور قیمت خان میں کیا فرق ہوا' دانیال خان کے بھائی نے غالباً "اس کو بھی قیمت خان سمجھ لیا تھا' محض بستی کا خیر خواہ' ایک مشین' ایک جیتا رہنے والا پرزہ' جس کی پسلیوں کے پیچھے نہ دل ہے' نہ کھوپڑی کی ہڈی میں بھیجہ۔ لہٰذا نیلا بی بی چونکہ تم گڑھی کی ایک ادنیٰ ملازمہ ہو لہٰذا تمہیں وہ مرتبہ دیا ہی نہیں جا سکتا جو گھر اور اس کے مکینوں کو حاصل ہوتا ہے۔
جسم سے سارا خون یک لخت جمع ہو کر اس کے چہرے پر آ گیا۔
اس نے سوچا وہ بیمار ہے۔ لہٰذا ایسے کٹھن وقت میں ندو رنجی ترک کر کے اس کو حقیقت کا سامنا کرنا ہو گا۔ وہ ایک گولہ سا اس کے سر پر پھاڑ کر چپ ہو گئے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنا چاہا' لیکن اچانک سر جیسے بہت وزنی ہو گیا۔
بعض اوقات انسان شناسی کے دعوے کس قدر ناکارہ ثابت ہوتے ہیں' اسے خود انسان کے اندر تک اتر جانے کا جو گمان تھا' وہ کتنا بودا ثابت ہوا' وہ آج تک مخاطب کو ظالم و جابر اور جانے کیا کیا سمجھتی تھی۔ کبھی کبھی خود بخود بہروپ بدل جاتے ہیں۔ جو ہمیں ظالم لگتے تھے' وہ ایک دن مظلوم ہو جاتے ہیں اور در حقیقت جو ظلم ڈھاتا ہے وہ معصوم دکھائی دیتا ہے۔
کون جانے ہر ایسے ظالم کے اندر دکھ کے کتنے الاؤ سلگ رہے ہوں؟ وہ اندر سے کتنا بزدل' کتنا سادہ اور کتنا خالص ہو۔ اس نے اسی خاموشی کو طول دیے سر جھکائے رکھا' اس میں سر اٹھانے اور مقابل کی نظروں کا سامنا کرنے کی تاب بھی نہیں تھی۔
گڑھی عیسیٰ خان کے اس قیام میں اس نے قدم قدم پر دانیال خان سے ٹکر لی تھی۔ ان کو برا بھلا کہا تھا' ان کی توہین کی تھی اور اپنے تضحیک آمیز رویے میں انہیں کبھی ایسا موقع نہیں دیا کہ وہ وضاحتیں دیتے۔ کبھی ہم دوسروں کو گراتے گراتے خود گر جاتے ہیں۔
"سوری" جیسا بے کار اور حقیر سا لفظ اس کو اپنی ندامت کے سامنے بے معنی لگا۔ وہ پچھتاووں کی رحم

اتنے روایتی انداز میں نبھا ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ خاموش کھڑی اپنے سے چند انچ مقابل کھڑے پیروں پر نظریں جمائے خود سے الجھتی رہی۔
"لیکن افسوس ہے نیلا بی بی! کہ آپ نے کبھی انسانوں کو سراہا ہی نہیں۔ کسی کو کچھ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ نہ کبھی کسی کا اعتبار کیا' نہ کسی کو اعتماد دیا' آپ کے نزدیک ہر شخص کمینہ اور بد خصلت ہے۔ ہر شخص ظالم ہے' عیار ہے' آپ سب سے نفرت کرتی ہیں۔ خواہ وہ میرا بھائی ہو۔ بے بے ہوں' خان گل ہوں' اور میرا تو کوئی مرتبہ ہی نہیں۔
آپ کے نزدیک ہم محض پٹھان ہیں' اور آپ محض پنجابی' ہمارا آپ کا رشتہ سرحدوں کے حساب سے تعین کیا جاتا ہے۔ جہاں آپ کا علاقہ ختم ہوتا ہے' وہاں سے رشتے داریاں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ آپ کو تو سرزمین شمار سے بھی کوئی دلچسپی نہ ہوتی' اگر وہ آپ کے صوبے سے نہ ہوتے۔ اور شاید انھی کے طفیل شیریں کو آپ کا رستہ شفقت حاصل ہے۔"
انہوں نے کچھ دیر رک کر اپنی باتوں کا رد عمل اس کے چہرے پر جھانکا۔ گہرے سرخ رنگ کے ساتھ وہ چہرہ جھکائے مسلسل ان کے بوٹوں کی چمکتی نوک پر نظریں جمائے' سب کچھ چھپائے ہوئے تھی۔
انہوں نے اس کے سر کو اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں جکڑ کر اونچا کر دیا۔ کتنی دیر وہ اس کی آنکھوں کے چمکتے رنگ پر نظریں جمائے اس کے تیزی سے حرکت کرتے ڈھیلوں کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے رہے۔
"محبت' پیار' قلبی تعلق' یہ سب چیزیں تو آپ کے لیے قطعی بے کار اور بے معنی ہیں۔ ان کا نہ کوئی مفہوم ہے نہ مقصد۔ کیونکہ آپ نے خود کسی سے پیار کیا ہے نہ کسی کو اس قابل سمجھا ہے کہ وہ آپ کو چاہ سکے۔" انہوں نے رک کر ملامت سے کہا تھا۔
"اور آپ کے نزدیک تو ایک مرتے ہوئے آدمی کے لیے پندرہ سال پرانے نکاح نامے کی تلاش بھی بے مصرف ہے کیونکہ اس سے اس کی زندگی میں گھنٹوں کا نہیں تو لمحوں کا ہی اضافہ ہو سکتا ہے۔"
اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر ان کی جھنجلائی گرفت سے آزاد کر لیا۔
"ہاں' آپ جائیے واپس' ہم سب آپ کے لیے زنگ آلود پرزے ہیں۔ ہماری آپ کو ضرورت ہی کیا ہے؟ کون ہے یہاں جس کے کہے میں آپ ٹھہر جائیں' کس کی خاطر؟ اور کیوں؟" آپ کے لیے تو وہ شخص بھی بے معنی ہے۔ جس سے ملنے کے لیے آپ اچھے برے موسموں میں چوری چوری گھوڑا دوڑاتی بے تابی سے جاتی تھیں۔ آپ نے کبھی اس کا حال نہیں جانا' کبھی اس کے دل کی جلن بھی معلوم نہیں کی' کبھی یہ بھی نہیں پوچھا وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟"
اس کا جی چاہا وہ جھنجلا کر چیخ پڑے۔
وہ کون تھا کسی اور شخص کے بارے میں اس سے باز پرس کرنے والا۔
وہ اس کا کیا لگتا تھا۔ اور کس حد تک عزیز تھا' اس بات کی وضاحتیں اور توجیہات اس کو دنیا بھر میں کسی کے سامنے نہیں کرنی تھیں۔ وہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں تھی۔ وہ اسی طرح چپ رہی۔ ضروری نہیں وہ جو سوالات کرتے جائیں' ان کے جوابات بھی ان کو مہیا کیے جائیں۔
پھر وہ اس کی مسلسل خاموشی سے چڑ گئے۔ انہوں نے اس کی دونوں کہنیاں مضبوطی سے پکڑ کر جھنجھوڑ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈالیں۔

"تمہیں کوئی حادثہ' کوئی واقعہ نہیں چونکا سکتا بیلا' وہ کسی کی موت ہو یا شادی' جاؤ جا کر جشن مناؤ' جاؤ واپس اس ان پڑھ لوگوں کی بستی سے' اپنے شہر میں جا کر لوگوں کو داستانیں سنانا کہ تم وہاں بہت سے تڑپتے دل سسکنے کے لیے چھوڑ آئی ہو' اور تم اتنی انا پرست اور خوددار ہو کہ ان میں سے ایک سے بھی تمہارا دل نہیں پسیجا۔ کوئی تمہیں رام نہیں کر سکا۔ تم سب کو نیچا دکھا کے آگئی ہو۔ جاؤ۔"

انہوں نے اپنی آہنی گرفت میں جھنجھوڑتے جھنجھوڑتے اسے ایک دم چھوڑ دیا۔

وہ جھونکا سا کھا کر گرتے گرتے سنبھلی۔

اس کے بازوؤں پر جہاں ابھی اس ظالم شخص کی مضبوط گرفت تھی' سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔

لیکن اس نے خلاف عادت کوئی غل نہیں مچایا۔

پلٹ پلٹ کر کھرے کھرے جواب نہیں دیے۔ جھگڑتے ہوئے اس شخص کی حسب عادت تضحیک نہیں کی۔ کیونکہ بہر کیف وہ خطاوار تھی۔

وہ مجرم تھی اور خاموشی سے اپنے اوپر عائد فرد جرم سلسلہ وار اور ترتیب وار سن رہی تھی۔ یہ اس کے اپنے ظلموں کی داستان تھی جس کی تاریخ اس گڑھی میں لوگ جانے کب سے لکھ رہے تھے۔

انہوں نے اس کو جھنجھوڑ ڈالا تھا' اور شاید وہ اسے دھکا دے کر گرا بھی دینا چاہتے تھے لیکن اس کے مسلسل سکوت نے ان کو جامد سا کر دیا۔ شکست خوردہ نڈھال سے دانیال خان اپنی آرام کرسی پر گرنے والے انداز میں جا بیٹھے وہ نہایت خاموشی سے مصنوعی لکڑیوں کی دہکتی آگ سے لپکتے شعلوں پر نظریں جمائے لمحے بھر کے لیے ساکن ہو گئے۔ پتا نہیں یہ سلگتے شعلے کہاں کہاں بھڑک رہے تھے۔ ان کے اردگرد بھی' ان کے اندر بھی۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ اس کو ننھے بچے کی طرح معصوم اور سچے لگے جو ایڑیاں بھی رگڑتا ہے' جھنجھلا جھنجھلا کر اپنے کھلونے بھی پٹختا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کی ہر ضد پوری بھی نہیں کی جاتی۔

اس کے پاس معذرت کے الفاظ کا تمام ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ ان سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ معافیاں اور کوتاہیاں' اپنی گستاخیوں کی معذرت' اپنے رویے کی تلافی۔

"آئی ایم سوری۔" بہت دیر بعد ان کی غیر معمولی طور پر بھاری اور بوجھل سی آواز ابھری۔ انہوں نے اپنی گردن کا رخ بہت زیادہ آتش دان کی طرف کر رکھا تھا۔ جیسے وہ اس سے دیر تک کچھ چھپاتے رہے تھے۔

"آپ کچھ خیال نہ کیجیے گا۔ میں کچھ الجھ گیا ہوں۔" وہ دانستہ طور پر خود کو چھپا۔۔۔ کر آگ کو دکھا رہے تھے۔

وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ بول پائی۔ جیسے بڑی فراخ دلی سے اس نے ان کی معذرت قبول کر لی ہو۔

یہ وہ موقع تھا جب بیان دانی کے بڑے بڑے دعوے جھوٹے پڑ جاتے ہیں' وہ ان سے اس وقت کچھ بھی کہتی تو ایسے لگتا جیسے ان پر رحم کھایا جا رہا ہے۔ ان پر کسی کو ترس آگیا ہے۔

ہاں وہ مظلوم تھے لیکن اپنے اوپر ترس کھلوانا بھی ان کو پسند نہیں تھا۔

رحم ان کے لیے کچھ پسندیدہ فعل نہ ہو تا کہ وہ رحم اور ترس بانٹتے آئے ہیں۔

ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر قیمت خان اندر آیا۔

اس کے عین سامنے وہ خاموش اور ساکن کھڑی تھی۔

صاحب مختلف انداز میں اس لڑکی سے رخ پھیرے جیسے کسی کیفیت سے گزر رہے تھے۔

ان کے کرب کا سبب یہ لڑکی ہو' وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اس صورتحال میں اچانک اندر چلا آیا لیکن اس نے کوئی معذرت نہیں کی۔ شاید اس کے پاس وقت نہیں تھا' اس نے ایک کڑی نظر بیلا پر ڈالی۔ وہ اس لڑکی سے اکتا چکا تھا۔ جب بھی جہاں بھی فساد ہوتا ہے' وہاں یہ لڑکی ضرور موجود ہوتی ہے۔

"وقت کم ہے صاحب۔ بھاگتے بھی چلیں تو تین گھنٹے تو کم کیا لگیں گے۔"

"ہاں۔" انہوں نے چونک کر کلاک کی طرف دیکھا۔

"واقعی بہت دیر ہو گئی۔"

وہ تیزی میں پلٹے تو ان کا چہرہ شدت سے سرخ ہو رہا تھا' آنکھیں جیسے شدت برداشت سے لال ہو گئی تھیں۔ وہ اس کو نظر انداز کیے اس کے برابر سے گزر گئے۔

"گاڑی تیار ہے؟ ٹائر بدلا گیا؟"

"صاحب۔"

وہ دونوں آناً فاناً تیز قدموں سے دروازے کی طرف چل پڑے۔

"میں بھی ساتھ چلوں؟" تیز تیز قدم اس کی مدھم پڑتی آواز کے سامنے ایک دم رک گئے۔

ان دونوں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ بلاشبہ ان دونوں کا تاثر ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف تھا۔ قیمت خان کے بس میں ہوتا تو ایسے انتہائی نجی معاملے میں اس کی مداخلت برداشت بھی نہ کرتا۔ لیکن جانے وہ اسے کب سے برداشت کر رہا تھا۔ اس نے ایک برہم سی نظر اس پر ڈالی اور صاحب کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے وہی نظر صاحب پر بھی پھینکی تھی اور گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ صاحب کو وقت کی ہلاکت خیزی سے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں۔ ضرور۔" وہ سرد سے لہجے میں کہہ کر آگے نکل گئے۔

اس نے ان کے روکھے لہجے سے کوئی مطلب اخذ کرنے کے بجائے ان کے پیچھے بھاگنا مناسب سمجھا۔

"بے بے کو بتا دوں؟" اس نے اجازت لینے والے انداز میں دوڑتے دوڑتے پوچھا۔ وہ اس ظالم شخص کے سر کے بھتیجے کے پاس رک گئے۔ وہ ہمیشہ ان بھنچے لبوں والے شخص کو ظالم سمجھتی تھی۔ لیکن اب تو اس کے ظلم کی داستان اس پر بھی عیاں ہو چکی تھی۔ یہ سردار دانیال خان اور سردار بندے آل خان کا باپ ہی تھا نا۔

"کیا بتا دوں؟" انہوں نے دبے لہجے میں دانت بھینچ کر پوچھا کہ بندے آل کو ہم نے قتل کرنے کے بجائے آج پندرہ سال بعد اسپتال میں داخل کروایا ہے۔"

وہ تامل سی کرتی رہی۔ "اگر ان کے علم میں آیا تو میں کیا جواب دوں گی۔"

"آپ کہہ دیجیے گا کہ آپ۔۔۔ آپ کچھ بھی کہہ دیجیے گا' میں سنبھال لوں گا۔"

انہوں نے جیپ کی پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لیے اگلی نشست کی بیک گرائی۔ اور جلدی جلدی اپنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیٹیں سنبھال لیں۔

گاڑی قیمت خان چلا رہا تھا۔ اور رات بالکل تاریک تھی۔

"آپ نے گرم کپڑے تو مناسب پہن رکھے ہیں نا؟"

وہ جانتی تھی وہ اس وقت وضع داری نبھا رہے ہیں۔

"جی ہاں۔"

"یہ تقریباً تین ساڑھے تین گھنٹے کا سفر ہے۔ پیچھے کشن رکھے ہوں گے۔"

"اچھا جی۔"

پھر دونوں طرف خاموشی چھائی۔ یہ ایک خاموش رات کی ویران سڑک تھی۔ گہری کھائیوں اور دیو قامت پہاڑوں کے بھوت کے سوا سڑک پر کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جیپ بار بار موڑ کاٹتی تھی قیمت خان اپنے ماہر ہاتھ مضبوطی سے اسٹیرنگ پر رکھے بڑی سہولت سے جیپ بھگا رہا تھا۔ تیز روشنی کا ہالہ سڑک پر دور تک پھیلا ہوا تھا اور وہ اس روشنی کے پیچھے پیچھے دوڑتا جیسے نور کی تلاش میں تھا۔ قیمت خان کو جیپ کے اندر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا سارا دھیان باہر کی طرف تھا۔ اندر کیا ہو رہا تھا۔ اس کی بلا سے۔

اس نے ایک اچٹتی سی نظر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے شخص پر ڈالی۔ ان کی پٹھانوں ایسی سرخ و سفید گردن پر سلیقے سے کترے ہوئے بال کالر کے نزدیک آ رہے تھے۔ ان کی اپنی شخصیت کی طرح اجلا اجلا اور اکڑا اکڑا کالر۔ اس نے مدتوں میں یوں ان کو نزدیک سے دیکھا تھا۔ اور فرصت سے دیکھا تھا۔ کیونکہ اس وقت یوں اس کا تفصیل سے جائزہ لیتا پکڑا نہیں جا سکتا تھا کہ ان کی آنکھیں پیچھے کی طرف نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

پتا نہیں یہ شخص ظالم تھا یا مظلوم؟ ہر روز اس کی کتاب سے ایک نیا ورق کھل جاتا۔ اور ایک نئی الجھن نیا مسئلہ سامنے رکھ دیتی۔

کسی دن اور بھی فرصت سے اس شخص کا اس دنیا میں مرتبہ اور مقام کھوجنا تھا۔

لیکن اب کیا کیجیے؟

اٹھے ہوئے چوڑے شانوں کے اوپر وقار سے سجا ہوا سر۔ کسی بھی ظالم انسان کا نہیں ہو سکتا۔ اپنی ذات پر یہ اعتماد اور سکون انسان کو صرف ضمیر کے آئینے میں ملتا ہے۔ وہ آج تک اس پر جو دو بڑے بڑے بہتان باندھتی رہی تھی وہ ان ہی سے مبرا تھا۔

نہ اس نے کسی کو قتل کیا تھا' نہ قید کر رکھا تھا۔ اس کے دونوں بہتان ایک ہی کڑی کے دو سرے تھے۔

اب وہ اس پر الزام لگانے تو گیا۔ اور الزامات کی تلافی چاہے تو کیسے۔

بے ساختگی میں اس کی نگاہ شیشے کی طرف اٹھی۔ وہ اس کو بغور دیکھتا' دیکھ رہے تھے۔ وہ خجل سی ہو گئی۔ ایسی باتوں کی وضاحت کے لیے معذرت کے کوئی طریقے بھی ایجاد نہیں ہوئے۔

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ رات کی تاریکی اور سیاہ ہو گئی تھی۔ راکی کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب جیپ ایک ویران سی آبادی کے قدرے بارونق ہسپتال میں داخل ہوئی۔ بہت مدت بعد اس نے شہری آبادی کے اثرات دیکھے۔ رات تاریک تھی لیکن مریضوں کے

لواحقین برآمدوں اور پارکوں میں گھومتے دکھائی دے رہے تھے۔ اسپرٹ اور فنائل کی تیز بو کے بھبکے دماغ میں اترے تو اسے محسوس ہوا وہ ہسپتال میں آ پہنچی ہے۔ یہ سوات کے کسی سابق شہزادے کا ہسپتال تھا۔ اس کا نام اور تاریخ تعمیر ہسپتال کی پیشانی پر نمایاں طور پر آویزاں تھی اور برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی اپنے نام کو ہر وقت روشن دیکھنے کی شدید خواہش نے کم از کم ایک نیکی تو کروا ہی ڈالی۔

ہسپتال کے فرش جگمگا رہے تھے۔ گاڑی پارکنگ ایریا میں کھڑی کر کے قیمت خان باہر آیا تو دانیال خان پہلے ہی ہسپتال کے ریسپشن تک پہنچ چکے تھے۔ قیمت خان اس کی ہمراہی کے لیے تھوڑا سا ست پڑ گیا۔ چھت پر نصب نیم گول بلبوں میں فرش پر ان کے سائے پانی میں لہراتے عکس کی طرح ڈول رہے تھے۔ جیسے وکوئین آف شیبا تھی۔ حالانکہ یہ محل اس کا نہیں تھا۔

قیمت خان نے تھوڑا سا مودب ہو کر دروازہ کھولا اور اس کے اندر داخل ہونے کا انتظار کرنے لگا تینوں آگے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔

رات کے اس آخری پہر میں بھی وہ جاگ رہا تھا۔

اور منتظر تھا۔؟

منتظر تھا کہ اس کی آنکھیں دروازے کی سمت گڑی ہوئی تھیں۔ ان تینوں کو تیزی سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کے بے رونق چہرے پر ہلکا سا ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ نڈھال تھا۔ دنوں کے بجائے جیسے برسوں کا مریض لگ رہا تھا۔ شیو بڑھ کر داڑھی بن گئی تھی۔ آنکھوں کے حلقے میں گڑھے اور نمایاں اور سیاہ ہو چکے تھے۔ متحرک ناچتے ہنستے ڈھیلے جیسی زندگی سے بالکل محروم ہو چکے تھے۔ آنکھوں سے برستی مردنی نے اس کا دل دھک سے کر دیا۔ اس نے کچھ دیر پہلے اس کو اتنا نحیف اتنا نڈھال تو نہیں دیکھا تھا۔

"مل گیا۔" اس کی نگاہ کسی پر نہیں پڑی سوائے دانیال کے۔ اس کی آواز کی بے تابی بیلا سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اسے جس چیز کی ضرورت تھی اس آس نے واقعی اس کو بقول دانیال کے مزید زندگی دی تھی۔

"مل گیا۔" انہوں نے ایک بوسیدہ سا چار حصوں میں تقسیم کاغذ موی لفافے میں لپٹا اس کو تھما دیا۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے ہاتھوں کی لرزش اور رعشہ بہت نمایاں تھا۔

دانیال خان نے جیسے اسے خود ہی الجھنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ شاید اسی میں ان کے لیے کوئی مصلحت ہو۔ تاکہ وہ اپنی خوشی کو آہستہ آہستہ بانٹیں۔ یا شاید اس لیے کہ ان کالیوں خالی پڑے موت کی راہ دیکھنے سے کسی کام میں مصروف رہنا بہت بہتر تھا۔

لیکن اس سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے سکون سے لفافے کی تہیں کھولیں۔ بندے آل کی نظر پہلی مرتبہ اس پر پڑی تھی۔

اس کو مصروف عمل دیکھ کر اس کی مردہ آنکھوں میں زندگی کی ہلکی سی لہر دوڑی۔

"بیلا بہت اچھی لڑکی ہے دانیال۔" اس نے دانیال کے چہرے پر کچھ ڈھونڈ ڈھونڈ کر کہا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ قطعیت سے کہہ کر خاموش ہو گئے۔

ان دونوں کی طرف سے بے دریغ لٹائے گئے ان سرٹیفکٹس میں کہاں خلوص تھا اور کہاں رواداری۔ اس سے پوشیدہ نہیں رہا۔ قیمت خان نے ایک خاموش نظر چاروں طرف ڈالی۔ پھر خاموشی سے دروازہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھول کر باہر نکل گیا۔

اس نے کھلا ہوا۔ عدالتی کاغذ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک نا امیدی سی نظر ان پر ڈالی۔ جیسے اسے یقین ہو گیا کہ اس سے جھوٹ نہیں بولا گیا۔ اسے بہلایا نہیں گیا۔

"ہاں۔ یہی۔ بالکل یہی۔" کتنی دیر جیسے وہ اس کی ایک ایک سطر ازبر کرتا رہا۔ الفاظ دہراتا رہا۔ رقوم بلند آواز میں پڑھتے پڑھتے وہ ایکدم جیسے بجھ گیا۔

"جو عذاب میں نے برداشت کیے ہیں وہ تم نہیں کرنا۔"

اس نے تہدیدی انداز میں جیسے انہیں کچھ جتانا چاہا تھا۔ دانیال خان نے اس کی نصیحت کو لاپروائی سے سنا جیسے وہ اپنی شدید بیماری میں کچھ اول فول ہی بول رہے تھے۔

"تم نے سنا دانیال۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

"میں نے سن لیا۔ آپ جانتے ہیں آپ کی سب باتیں میں دھیان سے سنتا ہوں۔ آپ ابھی تک سوئے نہیں۔ کیسے ہیں۔؟" انہوں نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے گرمجوش ہاتھوں میں دبا لیے۔

"پتا نہیں۔ مجھے لگتا تھا یہ کاغذ مجھے مل گیا تو زندگی مل جائے گی۔ لیکن زندگی کا ملنا شاید آسان نہیں۔" اور معنی خیز انداز میں ہنس دیئے۔

"سنا تم نے دانیال۔ زندگی ایک مرتبہ ملتی ہے۔ بزدل مت بننا۔ یہ بستی چھوڑ دینا۔ دنیا چھوڑ دینا لیکن۔"

"آپ نے دوا پی لی۔" انہوں نے بوکھلا کر ان کی بات کاٹ دی۔ وہ بھائی کا فقرہ مکمل سننے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ بیلا کو لگا جیسے وہ خود ان دونوں کی گفتگو میں رکاوٹ کا سبب ہے۔ وہ ان کے ہاتھ چھوڑ کر دوا کی شیشی دیکھنے لگے۔

"میں نے پی لی تھی شاید۔ نرس کچھ دے کر تو گئی تھی۔ اس ہسپتال میں دیکھ بھال اچھی ہوتی ہے۔ یہ تو مہنگا بھی بہت ہوگا دانیال۔"

وہ ان کا دھیان پلٹانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

"اب اتنا بھی مہنگا نہیں کہ آپ سے مہنگا ہو۔"

ان کے ان فقروں میں محبت کے علاوہ اظہار پر زیادہ زور تھا۔ اور شاید اس وقت ان کو کھلے اظہار کی شدید ضرورت تھی۔

"تم نے اپنی کر لی۔ مجھے لے آئے۔ چلو کر دیکھو۔" ان کے فقروں میں زندگی سے مایوسی کی شدید بو آتی تھی۔ "اور یہ لڑکی کیوں کھڑی ہے جب سے؟۔ اس کو کس بات کی سزا مل رہی ہے۔"

دانیال خان نے ایک نظر اس کے اداس اور خاموش چہرے کو دیکھا۔ کمرے میں اضافی پلنگ کے علاوہ کرسیاں تھیں۔ لیکن شاید وہ وہاں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ انہوں نے خاموشی سے ان کے پاس کی جگہ خالی کر دی۔

وہ دانیال خان کی چھوڑی ہوئی جگہ پر خاموشی سے ان کے بیڈ کے بالکل پاس ان کے نزدیک آ بیٹھی۔ انہوں نے اپنا بیمار لرزتا ہوا بوڑھا سا ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔

"آپ اچھے ہو جائیں گے۔" اس نے پیار سے کہا تھا۔

"جھوٹ بولنا گناہ ہے لڑکی۔" انہوں نے اپنی پرانی چونچال آواز بحال کرنے کی کوشش کی۔ "اور مایوس ہونا اس سے بھی بڑا۔"

وہ ایکدم ہنس دیئے۔ "اب یہ سچ کہہ رہی ہے۔ دانیال۔ اور تم نے اپنا وعدہ نبھا دیا ؟"

"کون سا؟"

"یہاں سے نہ جانے کا۔" وہ سرخ پڑ گئی۔ لیکن اس موضوع پر بات چھیڑنا بے کار ہی سمجھا۔ وہ چپکی رہی۔ بغیر کسی موضوع پر کوئی بحث کیے۔

دانیال خان نے کھڑے کھڑے ہی چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔

"آپ دونوں اپنی معنی خیز گفتگو جاری رکھیے۔ میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔"

بیلا کو لگا وہ دانستہ وہاں سے چلے گئے تھے۔

شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ بدے آل خان اپنے ذہن کو ہلکا پھلکا کر لیں۔ اپنا بوجھ کسی اور کے سر پر ڈال کر۔

"آپ کا دل چاہے تو مجھے آواز دے لیں۔ میں ڈاکٹرز روم میں ہوں۔"

پھر وہ چلے گئے۔ اور وہ دونوں خاموش سے ہو گئے۔ اس کا جی چاہا وہ ان سے اسی طرح باتیں کرے۔ ان کو چھیڑے۔ ان سے جھڑپ مول لے۔ شاید اسی طرح مرض کی شدت میں کمی آ جائے۔ شاید اس طرح دکھ کم ہو جائیں۔ لیکن یہ وقت بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔

اسی لیے غالباً" دانیال خان اس کمرے کو چھوڑ گئے ہیں۔ وہ بھی سچائی کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہیں۔ وہ اپنی نگاہ ادھر ادھر گھمانے لگی۔ اب کون سا موضوع چھیڑے۔ کون سی بات کرے؟۔

لیکن وہ بزدل نہیں تھے۔ وہ ہلکے سے مسکرائے اور انہوں نے بڑے سکون سے بال اپنے رنگ میں کر لی۔ "اگر تم اس سے ملتیں تو خوش ہو جاتیں۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی بیلا۔"

"وہ کہاں گئی ؟" بیلا نے مری سی آواز میں پوچھا تھا۔

"اس زمین کے نیچے جہاں آخر کار ہم سب کو جانا ہے۔" انہوں نے خاموشی سے جیسے کہیں اور جاتے کہا تھا۔

"وہ تمہارے جیسی تھی بیلا۔ وقت نے اس کو مہلت نہیں دی۔ ورنہ تم دیکھتیں۔ یہ قسمت بھی عجیب چیز ہے بیلا۔ وہ ہمارے دشمن کی بیٹی تھی۔ اور تم یقین کرو گی وہ پہلی مرتبہ ہمارے گاؤں میں کیوں آئی تھی۔؟" وہ واقعے کی شدت سے مزا لینے لگے۔

دراصل ان کے گاؤں میں آگ لگانے والے اور لوگ تھے۔ اور انہوں نے سمجھ لیا یہ آگ ہم نے لگائی ہے۔ ہمارے ہاں سب سے بہادر وہ ہے جو سب سے بڑا انتقام لے سکتا ہے۔ سو وہ ہم سے انتقام لینے آئی تھی۔ ہماری روایت یہ بھی ہے کہ ہم عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ اس کا خیال تھا وہ آگ لگا کر چپ چاپ چلی جائے گی اور کسی کو گمان بھی نہیں گزرے گا کہ ایک لڑکی ایسا دلیرانہ قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔

مجھے ان دنوں بھی راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ میں یونہی جنگلوں میں گھومتا رہتا۔ اپنے لیے کوئی لینڈ اسکیپ پسند کرتا۔ شاعری کرتا۔ اور بانسری بجایا کرتا تھا۔ اس دن میں نے دیکھا۔ ایک آدمی کمبل میں لپٹا ہاتھ میں ایک کنستر پکڑے چلا آ رہا ہے۔ اور اس نے مجھے دیکھ بھی لیا ہے۔ چاند پورا تھا۔ جنگل نور میں نہایا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوا تھا اور مجھے اس پر کوئی شبہ بھی نہیں تھا۔ وہ خوامخواہ ہی بھاگا۔ اور میں نے اس کو دو چھلانگوں میں جالیا۔ میں حیران رہ گیا کہ وہ کوئی آدمی نہیں ایک معمولی سی لڑکی تھی۔

معمولی لڑکی بیلا۔ لیکن بالکل غیر معمولی۔ اس نے مجھ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔

اس نے مجھ سے سب کہانی کہہ سنائی۔

اس نے آگ بھی نہیں لگائی۔ لیکن لگادی۔

میں نے بھی اس سے بدلہ لے لیا۔ اسے گرفتار کرلیا۔ عمر بھر کے لیے۔ وہ اس وقت وہاں سے چلی گئی لیکن پھر ہر روز رات کو ہم پتا نہیں کیسے بس اسی جگہ ملتے رہے۔

حتی کہ طوفان آگیا۔ قیامت برپا ہوگئی۔

بابا بہت ظالم تھے بیلا۔ حالانکہ ہم ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔ بڑی عزت کرتے تھے لیکن جانے کیوں بابا اور میرے بیچ ایک دیوار آگئی۔ ان خیال تھا کہ میں دھوکا کروں۔ دشمن کی لڑکی کو دھوکے سے لے آؤں۔ اور انتقام کی بھینٹ چڑھاؤں۔

اس کے علاقے کے لوگ بھی میرے خون کے پیاسے تھے لیکن ہم آخر بھاگ ہی گئے۔

بیلا۔ وہ کم ظالم تھے اور ہم بڑے۔ وہ بس آج تک جنگلوں کو آگ لگاتے رہے۔ ہمارے محافظوں پر فائر کرتے رہے اور بس۔

پھر اس دن قیامت آگئی۔ اگر دانیال خان اور قیمت خان پہاڑ بن کر راستے میں حائل نہ ہو جاتے تو لوگ میری آنکھوں کے سامنے اس کی تکا بوٹی کر دیتے۔

انہوں نے ہم کو شادی کے بعد دیکھا۔ اور طوفان مچا دیا۔ وہ میرے اپنے لوگ تھے اور ایک اس واقعہ سے پہلے مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ مجھے ان سے کوئی نفرت نہیں۔ وہ بھی ٹھیک کہتے تھے وہ ہمارے جدی پشتی دشمن کی بیٹی تھی۔ پتا نہیں مجھے کیوں اچھی لگ گئی۔

وہ باتیں بھی تمہاری طرح کرتی تھی بیلا۔ پاگلوں جیسی' ہر ایک سے لڑ پڑنا' ہر اک سے بھڑ جانا۔ ایک دم خفا ہو جانا۔ ایک دم من جانا۔"

وہ چپکی رہ گئی۔ اس کی اتنی عادتوں سے بھلا اتنی آگاہی اسے کس نے دی تھی۔ وہ تو اس کے سامنے نہ کبھی لڑی تھی' نہ منی۔

"اور خوامخواہی یہ سمجھ لینا کہ دنیا غلط ہے۔ اور میں اس کو بدل دوں گی۔ اور جیسے یہ چٹکیوں کا کام ہے۔ اور تم نے دیکھا' دنیا نے اس کو اس جنگ میں ہرا دیا۔ اس کا نشان ہی مٹا دیا۔ پھر اس رات بابا نے مجھے چیتوں کے آگے ڈالنے کا حکم دیا۔ ان کے خیال میں' میں نے دشمن کی بیٹی سے شادی کر کے ان کی ہدایات کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ ان کے حکم کے مطابق دانیال مجھے لے کر چلا تو اس کا دل پھٹ گیا بس وہ وہیں ساکت رہ گئی میرے دیکھتے دیکھتے ختم بھی ہو گئی۔ ٹھنڈی بھی پڑ گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس پر مٹی ڈال دی۔ نہ ڈالتا تو شاید کسی اور پر بھروسہ نہ کرتا۔ اس کو دانیال نے اسی زمین پر دفن کیا۔ بابا بھی مجھے مار کر جی نہ سکے' اور میں خاموشی سے اسی زمین پر آگیا جہاں وہ دفن تھی۔ اسی لیے میں وہ گھر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔"

وہ ساکت کی ساکت خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ زندگی کیسی عجیب کہانی ہے۔

"آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ بہت رات ہو گئی ہے۔"

انہوں نے تابعداری سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور کتنی دیر بند رکھیں۔ شاید وہ سو بھی گئے تھے۔ نرس رات کے اس پہر میں ان کو دوا دینے آئی تھی لیکن ان کو ڈسٹرب کرنے کے خیال سے پلٹ گئی۔ اس نے احتیاطاً گولی بیلا کے ہاتھ میں تھما دی۔ "جب یہ جاگ جائیں تو گولی کھلا دیجئے گا جی۔"

ہتھیلی پر دھری ایک سفید رنگ کی ٹکیہ اس کے دماغ اور دل کی لکیر کے درمیان رکھی اس کو جذبات اور وقت کی نزاکت کی کشمکش سے ڈرا رہی تھی۔

یہ وہ لوگ ہیں جو محبت میں کاروبار نہیں کرتے۔ جو زندگی میں کسی قسم کا بھی کوئی سودا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ جو عشق اور محبت کے لیے جان سے گزر جاتے ہیں۔ ایک لمبی قید اور ایک لمبا بن باس کاٹ کر یہ شخص پندرہ سال بعد پہلی مرتبہ گڑھی کے اس علاقے سے باہر نکلا تھا۔ اس نے وہ جرم کیا جو دفعات پاکستان میں کہیں درج نہیں۔ جو شریعت کی کسی کتاب میں پرسش زدنی نہیں۔ لیکن اس کی پاداش میں اسے عمر بھر کی سزا کاٹی ہے۔ اس کو اپنی زندگی کے برباد ہو جانے کا کوئی پچھتاوا نہیں' کوئی ملال بھی نہیں۔ پتا نہیں اس نے عمر کا وہ ایک برس کتنا خوبصورت بسر کیا تھا کہ وہ عمر بھر تاوان دینے پر آمادہ تھا۔

اس وقت جب دانیال خان نے ان کو بے تحاشا باتیں کرتا سن کر کمرے کا دروازہ کھولا تھا تو بندے آل خان کہہ رہے تھے۔ "محبت میں عمر بسر کرنا مصیبت ہے بیلا۔ اور میں جانتا ہوں دانیال خان کس عذاب سے گزر رہا ہے۔ لیکن اس میں راحت بھی ہے۔ اس نے سارے عذاب چکھ لیے ہیں اور راحتیں ترک کر دی ہیں۔"

"کیا عدلیہ خٹک ان سے اتنا عشق نہیں کرتی۔؟" بظاہر اس نے بڑی لاپروائی سے پوچھا تھا۔ لیکن انہوں نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"کون عدلیہ خٹک؟ میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔ اس نے تمہاری کتنی ہی باتیں مجھ سے کی ہیں۔ وہ سارا دن تمہارے قصے بیان کرتا ہے۔ لیکن وہ ڈرتا ہے۔ وہ تمہیں بستی والوں کے سپرد نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کر بھی نہیں سکتا۔ وہ اپنی موت سے نہیں' تمہاری موت سے ڈرتا ہے۔"

وہ ساکت کی ساکت اور خاموش کی خاموش رہ گئی۔ یہ انکشاف اس پر بہت بھاری پڑا تھا۔

"آپ کو اتنی باتیں نہیں کرنی چاہئیں لالا۔" دانیال خان نے دروازہ کھول کر تنبیہ کی تھی۔

"کرنے دو دانیال۔" انہوں نے منت سے کہا تھا۔ "کیا پتا میں کب چپ ہو جاؤں۔" وہ بہت دیر سے چپ پڑا تھا۔ اور دوا کی سفید رنگ کی گولی اس کی ہتھیلی پر دھری تھی۔

پتا نہیں کیا وقت ہوا ہے۔ دوا کا وقت گزرنا نہیں چاہیے۔

وہ بے تابی سے اٹھ کر بیٹھی۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا اور اسے اس طویل خاموشی سے خوف آ رہا تھا۔ وہ جب تک بولتا رہا وہ خوفزدہ رہی تھی۔ اب وہ چپ ہو گیا اور چپ ہو کر اسے اور ڈرا گیا تھا۔

اس نے آہستگی سے پلنگ پر جھک کر ان کو پکارا۔

"بندے آل۔ بھائی۔ لالا۔"

سرگوشی نے خوف زدہ بلند آواز کی شکل اختیار کی۔ پھر اس نے گھبرا کر اونچی آواز سے کہا۔ "لالا" رات کے اس پہر میں جب سارا ہسپتال ایک خاموش سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دل دہلا دینے والی ایک چیخ اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حلق سے برآمد ہوئی۔

"دان۔یال"

ہسپتال کا اسٹاف' نرسیں' ڈاکٹرز اور دانیال خان آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔ اچانک ہی ایمرجنسی ہو گئی۔ انہوں نے آکسیجن کا ماسک چڑھایا۔ ڈرپ دینے کی کوشش کی۔ رگیں کاٹیں۔ پھر انہوں نے مریض کے چہرے پر چادر ڈال دی۔

اب ان کے اور مریض کے درمیان کا رشتہ ختم ہو گیا۔

انہوں نے باری باری کمرہ چھوڑ دیا۔ دوا دینے آنا۔ ڈرپ چیک کرنا' مریض کا حال پوچھنا' جیسے انہوں نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ اور قطعی غیر دلچسپی سے ان کے کمرے کے سامنے سے ٹک ٹک کرتے کسی اور کمرے میں گھس جاتے۔

اس نے ہمیشہ اس شخص کو بستر یا بستر کے آس پاس ہی دیکھا تھا لیکن اتنا خاموش' اتنا ساکن۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں وحشت سی اتر رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کے اعصاب ناکارہ ہو چکے ہیں کتنی دفعہ اس کو لگا وہ چادر ہٹا کر دیکھے گی تو اس کے چہرے کے ساتھ اور کتنے چہرے ہوں گے۔ اس کی ماں کا چہرہ' باپ کا چہرہ۔

کتنی دفعہ اس کو لگا اس کی چادر کے نیچے اس کے سینے میں حرکت ہے۔

پتا نہیں سب لوگ کہاں چلے گئے تھے۔ بس ایک گھور اندھیرا اور خاموشی۔ وہ کرسی پر ساکن بیٹھی بیٹھی بے تابی سے کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے نہ صرف حرکت کی تھی بلکہ اس کو پکارا بھی تھا۔ لڑکی۔

"وہ سانس لے رہے ہیں۔ وہ زندہ ہیں۔" اس نے بلند آواز سے پکارا۔

کسی نے پیچھے سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دانیال خان تھے۔ انہوں نے اس کا سر آہستگی سے اپنے کالر پر ٹکا لیا۔

وہ زار و قطار رونے لگی۔ ہسٹریک عورتوں کی طرح بلند سسکیوں کو ہونٹوں میں گھونٹ گھونٹ جیسے سارے جھٹکے ان کے سینے میں اتارتی رہی۔ وہ خاموشی سے اس کی کمر تھپکتے رہے۔ آہستہ اور آہستہ۔ حتیٰ کہ وہ پرسکون ہو گئی۔

تھک کر اور نڈھال ہو کر وہ جیسے کرسی پر گر گئی۔

☼ ☼ ☼

دانیال خان بردباری سے حالات کو سنبھالتے اور وقت کی نزاکت کو دیکھتے پھر رہے تھے۔

وہ ان کی قیمتی چیزوں کو سمیٹتے۔ ان کی نشانیوں کی حفاظت کرتے۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ کا حصول اور ایمبولینس کی بازیابی۔

"قیمت خان۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم بی بی کو گھر لے چلو۔"

"میں مالک کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔" اس نے گستاخی سے نفرت کا اظہار کیا۔

"ہمیں دیر ہو جائے گی قیمت خان۔" انہوں نے اسی تحمل سے کہا۔ "سرجن نثار ایمبولینس ڈیپارٹمنٹ والوں کی طرف ہیں۔"

"میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔" قیمت خان جھنجلایا ہوا تھا۔ اور اس نے اس طرح کی حکم عدولی بھی کبھی

نہیں کی تھی۔

"مان جاؤ قیمت خان۔" وہ دانیال خان کی آواز کے ٹھہراؤ اور چہرے کے ضبط پر حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ کہیں سے بھی نروس اور گھبراہٹ کا شکار نہیں لگ رہے تھے۔

"ان کا ایمبولینس میں جانا کسی صورت بھی ٹھیک نہیں۔" پھر وہ اس کو پشتو میں سمجھانے لگے۔ غالباً یہی کہ اس کو ایک لاش کے ساتھ سفر نہیں کرنا چاہیے۔ شاید وہ اس کو دنیا بھر کے خلاف کمزور دل اور کچا سمجھنے لگے تھے کہ روتی بسورتی اور بین کرتی لاش کے ساتھ سفر کرے گی۔

اس کو بہادری کے تمغے بے دریغ لٹائے گئے اور ہمیشہ اس نے تمغوں کا بجا استعمال کیا تھا لیکن اس وقت اس کو ایک ناجائز بہادری کے پہاڑ تلے دبنے سے بچا لیا گیا تھا۔

اب گفتگو دیار غیر کی بولی میں ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ قطعی ناواقف رہی کہ آخری فیصلہ کیا ہو پایا۔ دانیال خان کا استحکام اور قیمت خان کی ہٹ دھرمی اپنی اپنی جگہ قائم تھی۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھی سفید رنگت کی چادر میں ساکت لیٹے شخص کو سوچتی رہی۔ وہ کیا کیا نہیں بولا تھا۔ اور بولتے بولتے چپ ہو گیا تھا۔

"میں آخری وقت میں بڑے مالک کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ سرجن نثار سے التجا کرنے لگا۔

"میں ساری زندگی ایک منٹ کے لیے ان سے غافل نہیں ہوا۔"

پھر معاملہ پشتو کی سپرداری میں چلا گیا۔

البتہ جب وہ نکلیں چلیں تو قیمت خان نے راکی کا اگلا دروازہ اس کے لیے کھولا اور اس کے بیٹھ جانے کے بعد غائب ہو گیا۔

ایمبولینس میں سرجن نثار اور قیمت خان تھے۔

اور وہ پیارا اور مہربان شخص جس کی بدولت گڑھی میں اس کا ہر دن ایک نئے عزم اور حوصلے سے بسر ہوتا تھا۔ خاموش اور ساکت ہسپتال کے اسٹریچر پر لوگوں کے سہارے آئے۔ وارڈ بوائے اسے اٹھائے ایمبولینس کی طرف لا رہے تھے۔ اور اس کا سر آہستگی سے حرکت کر رہا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔"

بیلا کو لگا وہ مر کر بھی روایات کی نفی کر رہا ہے۔ وہ فرسودہ خیال لوگوں کے شکنجے میں آنے سے قطعی انکاری ہے اور بیلا کو بھی یہی آخری درس دے کر جانا چاہتا ہے۔

اور اس کا سر تیزی سے لیے چلے جانے کی وجہ سے ابھی تک لرز رہا تھا۔ خاموش اور مہربان۔ سیدھے ہاتھ پاؤں۔ جو کبھی راہ عمل سے ہٹے نہ بھٹکے اس کے ہنستے ناچتے آنکھوں کے سیاہ گولے بھاری بوجھل پپوٹوں کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ اس نے ان کو آخری لمحوں میں بے رنگ' بے جان پڑتے دیکھا تھا۔

ایمبولینس کے پیچھے چلتے ان کی راکی۔ روانگی کے آخری لمحوں میں دانیال خان اس کی برابر والی سیٹ پر آ بیٹھے۔ سڑک ویسی ہی تھی جیسی آتے وقت اس نے دیکھی تھی۔ اس وقت اس کے دل میں کچھ اور عزائم تھے۔ لیکن اب زندگی میں حرکت ختم ہو گئی تھی اور اسی ساکن ہو جانے کو موت کہتے ہیں۔

کتنی مرتبہ آنسو بہہ کر اس کے گالوں تک آئے۔ کتنی مرتبہ اس نے یونہی بہنے دیے اور کتنی دفعہ اس نے بغیر حرکت کیے کندھے کی معمولی سی جنبش سے گالوں سے خشک کر لیے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"رولو۔" انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

ہاں وہ شخص جو اس کے برابر بیٹھا اپنے اعصاب اور بہادری کے سارے اعزازات سمیت اس کے اندر کہیں گر گیا تھا۔

"رونے میں کوئی حرج نہیں۔ خوش قسمت ہیں جو روتے ہیں۔" وہ ہونٹ بھینچے بڑی سنجیدگی سے ایمبولینس کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔

"کیا اب ان کو راتوں رات ..." وہ ہچکچا کر چپ ہوئی۔ "راتوں رات دفن کر دیا جائے گا۔"

"ہوں۔؟" انہوں نے ایک طویل خاموشی کے بعد سوالیہ انداز میں پوچھا۔ شاید ابھی تک انہوں نے خود بھی طے نہیں کیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ اسی طرح سوالیہ انداز میں بھنویں اچکائے جیسے یہ سوال کسی اور سے بھی کرنا چاہتے تھے۔

صبح تک لوگوں کو یہ علم بھی نہ ہو سکے گا۔ اس چھتے کے مکان میں ایک اور خاموش بھوت مٹی کے نیچے دبا دیا گیا۔ اور وہ ہنستی مسکراتی روز کی طرح بے بے کے پاس جائے گی ان کی خیریت دریافت کرے گی۔

جیسے اس سے پہلے کے سنگین حالات میں اس کو رازداریوں کا بھرم رکھنا پڑتا ہے۔

بے بے کے سامنے ہنسے گی، مسکرائے گی، روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لمبے سوال۔

لیکن شاید اب یہ ہو نہ سکے۔

کہ۔ ہر روز اسٹیج کی ایکسٹرا لڑکیوں کی طرح ایک ہی بھدا سین دہراتے دہراتے اس کا دل اکتا گیا تھا۔ ہر روز وہ سینے پر خنجر کھا کر اسٹیج پر گر جائے۔ پھر اٹھے۔ پھر مرے۔

کیا اس روز روز کی موت سے بندے آل خان کی ایک دن کی موت اچھی نہیں تھی۔

بعض باتیں سوچنے میں اتنی مشکل نہیں ہوتیں لیکن ان کو ادا کرنا کتنا دشوار ہو جاتا ہے۔ بن کہے وہ جانتی تھی دانیال خان کا غم کتنا ہے۔ اور اس کے اپنے غم کی شدت کیا ہے۔ کیا فائدہ وہ ایک دوسرے سے فضول الفاظ استعمال کریں۔ اپنا وقت ضائع کریں اور کہیں کہ وہ شخص جو اب ہمارے درمیان میں نہیں رہا ہمیں یکساں عزیز تھا۔ اور یہ کہ اس قدر عزیز کہ شاید پیمانے کسی اور ترازو میں تولے نہ جا سکیں۔

بہت عرصہ پہلے وہ اس گڑھی میں اسی طرح خاموش اور افسردہ داخل ہوئی تھی۔ لیکن تب زندگی میں ایک منزل تھی۔ کچھ کر گزرنے کی تمنا تھی۔ کچھ ارادے تھے۔ اب سب کچھ خاک ہو چکا تھا۔ نہ کوئی منزل نہ راستہ، نہ نشان۔ اب اس نے پھر ایک عزیز گنوا دیا تھا۔ اب پھر ایک پیارے کا نقصان ہوا تھا۔

وہ کسی سے کیا کہتی۔ دانیال خان سے بھی کیا کہے۔

کہ ان سب چاہنے والوں کو اس پر رونے کا حق ہے۔ کوئی اس کا باپ ہے، بھائی ہے، دوست۔ خادم ہے۔ وہ تو کچھ بھی نہیں۔

نہ کوئی خونی رشتہ ہے نہ جذباتی۔ یہاں ایک روح کا دوسری روح سے ایک خوشگوار سا تعلق تھا۔

دانیال خان نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پر بالوں کو تھپتھپایا تھا۔ باوجود شدید ضبط کے شاید اس کے حلق سے پھر کوئی سسکی پھسلی تھی۔

انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن ہاں مرنے والے پر اس کا کوئی حق تھا۔ کم از کم انہوں نے یہ تسلیم تو کر لیا تھا۔

جس وقت ان کی گاڑی گڑھی کے اس گیٹ سے اندر داخل ہوئی جہاں مسلح گارڈ چوکس کھڑی تھی۔ تو اس کو نامعلوم سی ہنسی آ گئی۔ بعض اوقات ہمارا اسلحہ ہماری طاقت، ہماری زبان، ہماری روایات۔ سب مل کر ہار جاتی ہیں اور سزا یافتہ مجرم چپکے سے کھسک بھی لیتا ہے۔ اب کون سی بندوق اس کا نقصان کر سکتی تھی اب کون سا چیتا اس کو پچھاڑ کھانے کے شوق میں بیتاب ہو گا کہ قدرت ظالموں کے ساتھ بڑا سنگین مذاق کرتی ہے۔

مسجد کا موذن صبح ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ اس اعلان کے ساتھ کہ خدا عظیم ہے۔

واقعی وہی سب سے بلند تر اور برتر ہے۔

لیکن گاڑی ایمبولنس سے آگے نکل کر نہ اپنے گھر کی طرف گئی۔ نہ بندے آل خان کے خاموش چونے کے گھر کی طرف۔ وہ گاڑی دوڑاتے نشیب میں اترے۔ اور بستی کی طرف جانے والے کچے راستے پر بے تحاشا دوڑنے لگے۔ ایمبولینس سے مسلسل ہارن بجایا جا رہا تھا۔ غالباً" وہاں سے اگلی گاڑی کی سمت معلوم کی جانے کی خواہش تھی۔

یا دانیال خان کے ممکنہ ارادوں سے آگاہی کے بعد قیمت خان اور سرجن نثار انہیں چوکنا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کسی کی بھی نہیں سنی۔

وہ اپنی گاڑی سے اترے۔ ایمبولینس کھولی۔ انہوں نے صبح صبح مسجد کے دروازے پر ان کی لاش لا کر رکھ دی۔ مسجد میں نمازی آہستہ آہستہ آ ہی رہے تھے۔

" انہوں نے بلند آواز سے پکار کر کہا۔

"گڑھی والو۔ یہ ہے وہ ذلیل شخص جس کو تم نے مرے ہوئے چوہے کی طرح دھتکار کر پھینک دیا تھا۔ جس کے ناپاک پلید قدموں کو تم نے اپنی پاک بستی سے دور کر دیا تھا۔

یہ آج پھر تمہارے درمیان آ گیا ہے۔ آج اس کی سزا ختم ہو گئی ہے۔

لو اب اپنی روایتوں سے بغاوت کا انتقام۔ لو اب اس کی لاش کے ٹکڑے اڑا دو۔ اس کو چیل کووں کے حوالے کر دو۔ آؤ باری باری میرے سامنے آؤ۔"

دانیال خان کے تمتماتے چہرے اور بلند آواز بن کر لوگ گھروں سے نکل کر باہر آنے لگے۔ وہ سراسیمہ تھے۔ دانیال خان کے کہے ہوئے لفظوں کے مفہوم ان کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

قیمت خان نے پستول کی سختی اپنے ہاتھ پر محسوس کی۔ پیلا اس کے برابر کھڑی تھی۔ اس نے دیکھا وہ جلال سے لرز رہا تھا۔ اگر دانیال خان کی دعوت کے باوجود کوئی شخص اس لاش کی طرف ہاتھ بھی اٹھاتا تو قیمت خان اسے بھون کر رکھ دیتا۔ ذرا ہی دیر میں بندے آل کی زمین پر رکھی لاش کے اسٹریچر کے گرد بستی اکٹھی ہو گئی تھی۔

اس نے گڑھی میں کبھی اتنے لوگ اکٹھے نہیں دیکھے تھے۔

جانے سردار دانیال کس کا جنازہ اٹھا لایا ہے۔

وہ اتنے غصے میں کیوں ہے۔"

اور یہ کیا اول فول بول رہا ہے۔"

جرگے کے کسی بزرگ رکن نے بڑھ کر چادر کا کونا سرکایا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بڑے مالک۔" اور چیخ مار کر گر گیا۔
لمحہ بھر میں پشتو میں پھیلتی یہ خبر مجمع میں بہتی رو کی طرح گردش کر گئی کہ اس چادر کے نیچے کون ہے۔
آوازوں کے شور میں لوگ قیمت خان کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ وہ احتجاج کر رہے تھے کہ بڑے مالک کو اب تک کس پردے میں رکھا گیا۔
وہ اس کے نام لیوا تھے۔ وفادار تھے۔ اس پر اپنی جان نچھاور کرنے پر آمادہ تھے۔
بندے آل نے ہسپتال میں بیلا کو سچ بتایا تھا۔ مجمع کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو گئی تھی۔ محبتوں کے اظہار میں ہم ہمیشہ کام چوری اور سستی کرتے آئے ہیں۔
اور اسی غفلت کے نتیجے میں وہ شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتا ہے۔ آپ کا پیار اس کے لیے موت کے بعد کی دوا ہے۔
وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ آوازوں سے چلا رہے تھے۔ انہوں نے جنازہ کندھوں پر اٹھایا اور بستی کی طرف چلے۔ انہوں نے سرداروں کے شایان شان میت کو غسل دینا اور کفنانا تھا اور جنازہ دھوم سے اٹھانا تھا۔ وہ جنازے کو لے کر روتے جا رہے تھے کہ قیمت خان بے تابی سے ان کے پیچھے دوڑا۔
لوگوں کی تیزی میں دانیال خان، سرجن نثار اور بیلا پیچھے رہ گئے تھے۔
اسے لگا دور جاتے جنازے میں بندے آل خان اٹھ کر بیٹھ گئے ہیں اور ہنس رہے ہیں "دیکھا لڑکی۔ اس بستی میں یوں چاہا جاتا ہے۔"
جیسے انہوں نے اپنا استقبال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور تسلی کر لی ہے۔ اگر بستی والے غلطی کرتے ہیں تو غلطیوں پر پشیمان بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا مطلب وہ انسان ہیں۔ ان کے اندر کی انسانیت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ وہ اچھا انسان ان کے اندر بالکل ہی مر نہیں گیا۔
سرجن نثار نے دانیال خان کی کمر کے گرد بازو رکھا اور ان کو آہستگی سے لیے لیے بستی والوں کے پیچھے جانے لگا۔
وہ ایک لمبے چوڑے میدان میں تنہا رہ گئی۔
وہ سامنے مدرسہ تھا۔ دوسری طرف اسکول۔ اور بستی کی ان عورتوں کے گھر جہاں کے چپے چپے سے وہ آگاہ تھی۔ جہاں قدم قدم بیج بویا تھا۔
پتا نہیں کتنے عرصے سے وہ اس ویرانے میں بالکل اکیلی تہی داماں اور خاموش کھڑی تھی۔
یا شاید لمحوں میں یہاں طوفان اٹھا اور چلا بھی گیا۔ بربادی اور تباہی کے نشانات پھیلا کر۔ وہ چپ چاپ ساکن کھڑی رہی۔ بغیر جنبش کیے۔ بغیر ایک لفظ منہ سے ادا کیے۔
"بیلا۔" اسے کسی نے پکارا تھا۔
اس نے گھوم کر دیکھا اور چپ ہی رہی۔ وہ خان گل تھا۔
پتا نہیں وہ بھی اس تماشے میں شامل تھا یا بعد میں کہیں سے نمودار ہو گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل بہت دیر کے لیے خاموش کھڑے رہ گئے۔
"چلو بیلا۔" اس نے دھیمے سے کہا۔ "میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"
"ہاں خان گل۔" اس نے طویل اور گہرا سانس لیا۔

"لگتا ہے ہزاروں سال پہلے مجھے تم ہی یہاں گاڑ گئے تھے۔ خان گل! تم ہی مجھے لائے تھے۔ تم ہی مجھے چھوڑ آؤ۔ ابھی اسی وقت میں پشاور جانا چاہتی ہوں خان گل۔ کیا تم مجھے چھوڑ آؤ گے؟"
"ہاں۔" اس نے بلا تامل کہا۔
"چلو۔"

☼ ☼ ☼

گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم میں داخل ہوئی۔ تیز روشنیوں اور پیٹرومیکس کے چھینکوں والی ریڑھی گاڑیاں ٹرین کے ساتھ ساتھ جانے لگیں۔ لاہور کے پلیٹ فارم کا مخصوص طوفان اور غلغلہ کھڑکیوں کے راستے در آیا۔ آگے جانے والے کھڑکی دروازوں سے اپنا سامان اندر پھینک رہے تھے اور اترنے والے تیزی میں چھلانگیں مار رہے تھے۔
اسے نہ اترنے کی جلدی تھی نہ چڑھنے کی۔ سارے راستے، ساری منزلیں بے نشان رہ گئی تھیں۔
یہ وہی جگہ تھی جہاں سے سال بھر پہلے وہ نئے ارادوں، نئے ولولوں سے نکلی تھی۔ کچھ کر گزرنے کی خواہش، کچھ بن جانے کی حسرت۔ گاڑی آہستگی سے آواز پیدا کر کے رک گئی۔ اس نے اپنا اکلوتا سوٹ کیس اٹھایا اور خاموشی سے افراتفری مچانے والوں کا تماشا دیکھنے لگی۔ لینے والوں اور رخصت کرنے والوں کی رفتار مسافروں سے دگنی تھی۔ اور وہ مسافروں سے زیادہ مشتاق اور مسافروں سے زیادہ بدحواس تھے۔
گاڑی کا ڈبہ اور پلیٹ فارم ہمواری سے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ اس نے سکون سے قدم رکھا۔ یہ لاہور کا ریلوے اسٹیشن تھا۔ پاکستان کا سب سے زندہ اور بھرپور اسٹیشن۔ یہاں لوگ تھے اور اپنے ہونے کا ثبوت دیتے تھے۔ لوگ لوگوں سے مل رہے تھے۔ چھوڑ کے آنے والوں کا حال دریافت کر رہے تھے۔ آگے جانے والوں کو بے تابی سے نصیحتیں کر رہے تھے۔
اسے نہ کوئی لینے آیا تھا نہ رخصت کرنے۔ اس کا کوئی مہمان نہیں تھا۔ یہاں سے جاتے وقت رحیم چاچا اور ان کی پوٹلیاں تو تھیں۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ اس نے ایک مدت بعد اتنا شور سنا تھا اور اس کے کان اس شور کے عادی نہیں ہو پا رہے تھے۔ محض ایک سال۔ اور ایک سال نے اس کو سناٹوں کا اس قدر عادی کر دیا تھا کہ یہ زندہ جاوید، جیتا جاگتا ہنگامہ اس کے اعصاب کو توڑ پھوڑ رہا تھا۔
اس نے اپنے سوٹ کیس کا تسمہ پکڑا اور پالتو کتے کی طرح کھینچتی نکلتی چلی گئی۔ قلیوں نے "لیڈی سواری" کو تنہا بیگ گھسیٹتے دیکھا۔ جیسے وہ اپنے گھر کے سامنے بنے فٹ پاتھ پر شام کی تفریح کے لیے نکلی ہو۔ قلی بے قراری سے اس کی طرف لپکے۔ ایسی مجبور سواریاں پیسے زیادہ دے بھی جاتی ہیں۔
لیکن وہ محض سامنے دیکھتے نپے تلے قدموں سے پلیٹ فارم کی سیڑھیاں عبور کرتی رہی۔ جیسے اس کے ہاتھ میں وزن نہیں۔ اس کا نامہ اعمال تھا۔ اس کا سارا کچا چٹھا تھا۔ اس کا سارا ماضی اس کے سامنے تھا۔ اور آگے کچھ بھی نہیں۔ اس نے پلیٹ فارم نمبر پانچ اور چار بالترتیب عبور کر کے ایک مدت بعد میدانوں کی زمین پر قدم رکھا۔ اب وہ پہاڑوں پر سے اتر آئی تھی۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔
زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے جس طرح ہوتا ہے اب اس کی بلا سے۔
گول دائرے والے چوک کے گرد بے تحاشا بھاگتا ٹریفک گاڑیوں کے ہارن۔ اونچے اونچے قد آور قمقمے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اشتہارات اسٹیشن کے آس پاس اونچے اونچے ہوٹلوں کی تعمیر۔ جیسے ایک سال پہلے وہ جو کچھ چھوڑ کر گئی تھی۔ سب یہیں اسی جگہ کھڑا اس کا منتظر تھا۔ صرف اس نے اپنا ہاتھ اٹھالیا تھا۔

ٹیکسی والوں کے اڈے کے پاس رک کر اس نے رکشا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ دوڑتی بھاگتی رواں دواں ٹریفک کے درمیان کھڑی جیسے اجنبی شہر کے اجنبی حصے میں کھڑی تھی۔ اس نے رکشا ٹیکسی روکنے کی کوشش کی لیکن اس کو بہت عجیب سا لگا۔ وہ سب اس سے اجنبی تھے اور کسی اجنبی زبان میں اس سے جانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔ پتا نہیں۔ وہ الفاظ ہی نا آشنا تھے۔ یا اس کے سننے والے کان شناسا نہیں رہے۔

وہ بیگ گھسیٹتی بے تحاشا ہارن دیتی ٹریفک کے درمیان سے نکلتی۔ آگے چلی آئی۔ راستہ طویل تھا۔ اور وہ اسٹیشن سے کچھ آگے نکل آئی تھی کہ کسی رکشا والے نے رکشا روک کر اس کا سامان سیٹ پر رکھا۔ اس کو بیٹھنے کا راستہ دیا۔

"کہاں جانا ہے بی بی۔"

"کہاں؟" وہ سوچ میں گرفتار ہو گئی۔ رکشا کی مسلسل گھڑگھڑاہٹ اس کے اعصاب ناکارہ بنا کر اس کو چڑچڑا کر رہی تھی۔ اور وہ یہ فیصلہ کرنے سے بالکل عاجز تھی کہ سینکڑوں میل دور سے بھاگتی دوڑتی یہاں تک پہنچی تھی۔ اور یہاں سے اسے کہاں جانا ہے۔ یہ اس کے علم میں نہیں تھا۔ رکشے والے نے رکشا اسٹارٹ کر دیا ہلکے ہلکے رینگتا وہ پچھلی سواری کے جواب کا منتظر تھا۔

پہلی مرتبہ اس کو پتا چلا کہ اتنی مختصر سی دنیا کتنی وسیع و عریض ہے۔ اور کتنی گنجان۔ جہاں اس کا وجود بے نام و نشان تھا۔ اسے کس کے گھر جا کر دستک دینی ہے کون اس کا منتظر ہے۔ اس نے رکشے والے کو کس۔ کے گھر کا پتا دیا۔ کون سے موڑ مڑتی' کون سے راستوں پر گھماتی وہ رکشے والے کی رہبری میں۔ جس منزل پر اتری تو وہ دنگ سی رہ گئی۔

وہ اپنے گھر آ گئی تھی۔

گھر... کہ جب بھی قدم ان راستوں پر اٹھتے اور نکلتے یہیں تک لے آتے تھے۔ یہ وہ گھر تھا جسے وہ ایک سال تک مسلسل اپنے خوابوں میں دیکھتی رہی۔ خواہش کا کوئی حصہ' آرزو کا کوئی گوشہ اس گھر کے کسی کونے سے خالی نہیں تھا۔

گھر؟؟

جس پر اب اس کا حق تھا نہ فرض۔ حتی کہ کالے سیاہ گیٹ پر جھولتا سرخ لاکھ میں لپٹا تالا بھی عدالت عالیہ کا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اس عمارت کی طرف دیکھا۔ جہاں سے وہ بھاگی تھی لیکن شاید اسی طرف بھاگی تھی۔ یا پھر دنیا اتنی گول تھی کہ وہ پھر بھاگ بھاگ کر ایک دن اسی پتھر اور سیمنٹ کے بے جان تودوں کے سامنے کھڑی تھی۔

اسے ہمیشہ لگتا تھا وہ جب بھی گھر جائے گی۔ گھر اسے دیکھ کر بے تاب ہو جائے گا۔ جیسے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا۔ جیسے اس کے چلے جانے کے گلے' اس کے چھوڑ کر بھاگ جانے کے شکوے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔

لیکن وہ اسی طرح کھڑا تھا۔ بے جان۔ بت اسے کسی کے آنے جانے اور چلے جانے میں کوئی دلچسپی

نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی اپنی بلند قامت گھر کی طرف دیکھتی رہی۔

جیسے ہم کسی بت اپنے کو بہت دور سے دیکھتے ہیں۔

"نیلا۔" اسے جیسے کسی نے یقین کرنے اور نہ کرنے کے انداز میں پکارا تھا۔ وہ اس وقت پہچان کے موڈ میں بھی نہیں تھی لیکن اس ایک صدا نے اس کا سارا طلسم توڑ دیا۔ رکشے کا انجن اسی طرح شور کر رہا تھا۔

وہ رک سی گئی۔

"ریاض بھائی۔" ہیجان کی ایک لہر اس کے چہرے پر چڑھی اور اتر گئی۔

"کب آئیں تم۔ اس طرح کیوں کھڑی ہو۔ اندر کیوں نہیں آتیں۔"

"اندر۔"

وہ چپ سی ہو گئی۔ وہ تو یہ جاننے سے بھی قاصر تھی کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچی تھی۔ پتا نہیں۔ وہ کہاں سے نکلی تھی اور کہاں چل پڑی۔ اس جگہ تک آنے کا بظاہر اس کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس شہر میں اس کے قدم انہی گلیوں' انہی سڑکوں کے عادی سے تھے۔ ریاض نے اس کو اس طرح گم صم دیکھا۔ اور خاموشی سے اس کا بیگ رکشے سے گھسیٹ لیا۔

"اور کوئی چیز تو نہیں ہے؟" اس نے نیلا سے پوچھا۔ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

"بل دے دیا۔" اب کے وہ رکشے والے سے مخاطب تھا۔

اس نے خاموشی سی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا بٹوہ گھسیٹا۔

"تم چلو اندر۔" اس نے خاموش کھڑے اسے ٹوکا۔ لیکن جب وہ ادائیگی کر کے پلٹا تو وہ اسی طرح چپ چاپ کھڑی زمین دیکھ رہی تھی۔ پہلے اس نے اپنا سر قدرے بلند کر رکھا تھا۔ اب زمین کی طرف نیہوڑائے جیسے کسی سوچ میں گم تھی۔ ریاض کو اس کی یہ حرکات کچھ عجیب سی لگیں لیکن وہ اس سے بہت مدت بعد مل رہا تھا۔ اور اس مدت میں جو انقلابات آئے تھے وہ ان سب کو بھی سن بیٹھا تھا۔ وہ اب اس کو کیا کہتا۔ مجھے بہت افسوس ہوا جیسا گھٹیا فقرہ اس کے باپ کے غم کا مداوا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

"آپ کب آئے ریاض بھائی؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"کریں گے کریں گے فرصت سے بات چیت۔ مجھے تو ابھی تمہارے کان کھینچنے ہیں اچھی طرح۔ پرایا تو بس میں ہی تھا۔ مجھے ہی تم نے بے خبر رکھا۔ دو لفظ لکھ کر ہی ڈال دیتیں۔"

"سوری ریاض بھائی۔"

"بڑے بڑے رسمی فقرے سیکھ آئی ہو اور ایسے بول رہی ہو جیسے صبح گئی تھیں۔ شام کو آ گئی ہو۔"

"آپ بھی تو ایک مدت سے غائب تھے۔"

"ہاں۔ لیکن لاپتا تو نہیں تھا۔ جہاں تھا تمہارے علم میں تھا۔"

پھر وہ چپ ہو گیا۔ بعض اوقات بڑی بڑی باتوں کو درگزر کرنے کے لیے دل بہت چھوٹا کرنا پڑتا ہے۔ تعزیت کے دو رسمی بولوں کے عوض اسے اور کتنی بکواس کرنی ہوگی۔ وہ بچہ سا بن گیا تھا۔

لیکن اس نے اپنے بڑے بزرگوں والے سروپ کو پھر سے اپنے اوپر تان لیا۔

"دیکھنا میں سب کو کتنا حیران کرتا ہوں۔"

اس نے اس کا سوٹ کیس فرش پر چھوڑا۔ اور زور سے وسل دی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"گوشی۔ دیکھو میں کسے کان پکڑ کر لایا ہوں۔"

وہ اس سادہ سی پرسکون گیلری میں کھڑی بے چین ہو رہی تھی۔ بھائی کی آواز کی شدت کے ساتھ گوشی کی دھم سے چھلانگ کی آواز آئی۔ گوشی نے بچپنا نہیں چھوڑا۔ پتا نہیں اس وقت وہ کہاں چڑھی کیا کر رہی تھی۔ ممی شاید نزدیک تھیں وہ کھلے دروازے سے چاپ سے سامنے آ گئیں۔

"ارے ہائیں۔" ان کے منہ سے نکلی مبہم سی آوازوں نے گوشی کے قدم تیز کر دیے۔

جیسے چاروں طرف افراتفری کا دور دورہ مچ گیا۔ ممی اسے گلے لگائے ایک تواتر سے رو رہی تھیں۔ لوگ کمروں سے نکل نکل کر جمع ہونے لگے۔ چاروں طرف ایک بھیڑ سی مچ گئی۔ سب لوگ منہ اٹھائے اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے صبر کر بیٹھے ہوں۔ ہر شخص اپنی بولی بول رہا تھا۔ آیا سے لے کر مہترانی تک۔ وہ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہے تھے۔ لیکن بہرکیف اس سے کوئی خفا نہیں تھا۔ وہ اس کا استقبال کر رہے تھے۔ وہ کتنی دیر سے ان کے درمیان چپ چاپ جیسے پتھر کی مورتی کی طرح ساکت بغیر پلکیں جھپکائے کھڑی رہی پھر اس کو اچانک اپنی بے حسی کا احساس ہوا۔ جو کچھ اس پر گزری تھی وہ اس کی ذات کا ایک حصہ تھا اور دنیا والوں کی شراکت اس میں مناسب بھی نہیں۔ اس کو اپنی تقدیر کے ساتھ کیے سارے ستم خود سہنے ہوں گے۔ لوگوں کو ہم راز بنا کر مظلومیت کا ڈھونگ رچانے سے کیا حاصل۔ اس نے اپنا پرس گرا دیا۔ اور باری باری لوگوں سے گلے ملنے لگی۔

گوشی دوڑی دوڑی آئی تھی۔ اسے گمان سا ہوا کہ آنے والا بیلا کے سوا کون ہو سکتا ہے۔

لیکن اسے کانوں پر یقین تھا نہ آنکھوں پر۔

حالانکہ اس نے ریاض بھائی کی آواز بھی سن لی۔ اور اس نے اس کو کھڑے بھی دیکھ لیا تھا۔

لیکن ہر چیز جیسے یقین سے ماورا ہو چکی تھی۔

لیکن یہ تو بیلا ہی تھی۔

بالکل وہی بیلا۔ لیکن خاموش گم صم۔ سال بھر کی طویل مسافت نے اس کو تھکا ڈالا تھا۔ یا جیسے اس کی یادداشت ہمیشہ کے لیے کھو گئی تھی۔ وہ انجان نظروں سے ایک ایک کو دیکھتی۔ زبان اور دل سے ادا ہونے والے ہزاروں سوالوں کی یلغار میں گھری جیسے کسی کا بھی جواب نہیں دے رہی تھی۔ جواب نہ ملنے کے باوجود لوگوں کے سوال ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ پھر وہ طویل گہرا سانس لے کر مسکرا دی۔ اور خوشی خوشی ہنستے مسکراتے فقرے لٹانے لگی۔

ہاں۔ یہ وہی بیلا تھی۔

اگر اسے خود پر قابو پانا یاد ہے۔ اگر اس نے اپنے آپ سے اختیار نہیں کھویا تو یہ وہی بیلا ہے۔

اور دونوں ایک دوسرے کے سامنے آ کر مسکرا دیں۔

"یہ منظر دیکھنے کے لیے میری آنکھیں بے چین تھیں۔" ریاض بھائی نے شرارت سے کہا۔

گوشی کی آنکھیں چھلک گئیں۔ ممی نے خاموشی سے اپنے آنسو رگڑ ڈالے اور انکل جمشید بردباری سے بار بار اس کے نزدیک سے گزرتے رہے۔ آیا اماں کچن میں چلی گئیں۔ آج انہیں بہت اہتمام کرنا تھا۔

"کچھ خیال کرو گوشی۔" ممی کی آواز میں لرزش ابھی تک باقی تھی۔

"بیلا کو کمرے میں لے جاؤ۔ اس کو آرام کرنے دو۔"

"ہاں۔" گوشی اس طرح اٹھی جیسے وہ کانچ کا کھلونا تھی اور ذرا سی غفلت اس کو ریزہ ریزہ کر دے گی۔

"آؤ بیلا۔"

اس نے بیلا کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس تو کر لیا تھا لیکن وجہ سمجھنے سے قاصر ہی رہی۔ اس نے ابھی تک اپنے حالات نہیں بتائے تھے۔ وہاں کے بارے میں زبان نہیں کھولی تھی۔ اور شاید زبان کھول کر پھنسنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے گرد آلود چہرہ اور بال آئینے میں دیکھے اور غسل خانے میں گھس گئی۔

اس نے گوشی کی توقع سے بھی کہیں زائد وقت غسل خانے میں بسر کیا۔ البتہ نہا دھو کر جب وہ باہر نکلی تو اتنی ہشاش بشاش نہیں تو تھوڑی سی تازہ دم ضرور ہو گئی تھی۔ چھوٹی تپائی پر رکھی چائے کے سامنے اس کی عزیز دوست اسی طرح اس سے خوف زدہ اس کی منتظر بیٹھی تھی۔

"اور گوشی۔ زندگی کیسی گزری؟" گوشی کو لگا وہ اس کا سوال اسی پر ڈال کر بچ رہی ہے۔

"اب تمہیں کیا جواب دوں۔ کہ مہربانی ہے اس کی وہ جس حال میں رکھے۔ یا زور سے کہوں۔ بس۔"

بیلا خاموش رہ گئی۔ چائے کے گھونٹ بھرتے بھرتے بھی اسے شبہ رہا۔ وہ اب بھی اس سے شکوہ کرے گی۔ کہ وہ اسے ملے بغیر یا وجہ بتائے بغیر کیوں چلی گئی۔

لیکن بیلا کے سارے خدشے بے بنیاد رہے اور کسی نے بھی اس سے کوئی آزمائش میں ڈال دینے والا سوال نہیں کیا۔ رات تک وہ اس کو گھیرے میں لیے سیاست سے فیشن تک ہر موضوع پر بات کرتے رہے۔ اس کی خاطر مدارات اس کی دلجوئی۔ جیسے کوئی پری بھولے سے انسانوں کی بستی میں آ جائے۔

وہ اس قابل تو نہیں تھی۔ اس نے شرمندگی سے سوچا۔ لیکن پیار ہمیں بہت سے عذابوں سے بچا ڈالتا ہے۔ کھانے کی میز یہاں سے وہاں تک بھری ہوئی تھی اور وہ اس ذائقے کو ترس بھی گئی تھی۔ پیاز لہسن اور مرچوں والا یہ کھانا جس میں ہلدی کی رنگت بھی شامل تھی۔ بیلا سے کوئی اس کا تمسخر بنائے لیکن اس آلو گوشت سے بڑی نعمت تو کوئی اور نہیں اتری۔ اس نے نوالے ڈبو ڈبو کر پتا نہیں کیا کیا کھایا اور کتنا۔ ریاض بھائی اس کا مذاق بنائے محفل کو ہلکا پھلکا رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔

لیکن رات کی خاموشی میں اسے لگا وہ سو نہیں سکے گی۔ کتنی دیر وہ ساکت لیٹی نیند سے لڑنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس سے ذرا فاصلے پر لیٹی گوشی جیسے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہی تھی۔ اسی لیے اس نے کروٹ لینے کا ارادہ بالکل ترک کر کے نگاہ چھت پر جما دی۔

کتنی دیر اس نے چھت پر آنکھیں گاڑے سوچنے کی کوشش کی کہ اس وقت گڑھی میں کیا ہو رہا ہو گا۔ کس نے اس کی کمی محسوس بھی کی ہو گی۔ یا شاید نہ بھی کی ہو۔

کہ وہ اپنے غم میں پھر سے ادھ موئے ہو گئے ہوں گے۔

اور خان گل نے شاید ان لوگوں تک اطلاع پہنچا دی ہو۔ لیکن اس وقت اس کو یاد کرنے کی فرصت بھلا کس کے پاس ہو گی۔ ہاں "البتہ جب کچھ دن بعد۔ ایک دن بے بے ایک دم سوچیں گی بیلا کہاں ہے۔ بیلا نظر نہیں آ رہی۔ تب خان گل انہیں بتائے گا اور شاید وہ خود دل میں سوچے گا کہ اس نے کیا غلطی کی۔ (یا کتنا درست فیصلہ کیا شاید)

لیکن اس کی ایک معمولی ضد سے وہ بندے آل کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکا ہو گا۔

اور سر جن نثار۔ وہ وقفے وقفے سے ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالتے تھے۔ لیکن اس وقت وہ بھی دانیال

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خان کے ساتھ بہت آگے نکل گئے تھے۔ وہ شاید گڑھی سے فوراً واپس چلے بھی گئے ہوں۔

اور دانیال خان کیا ان کے پاس اتنی مہلت ہوگی۔ کیا اس وقت ان کو اس کی ضرورت ہوگی۔ کتنی مرتبہ انہوں نے اسے کڑے وقت میں پکارا تھا۔ اب اگر وہ پکاریں بھی تو شاید ان کی آواز یہاں تک نہ پہنچ سکے۔

بیلا۔ بیلا۔

اپنے کان کے بالکل قریب جیسے درد میں ڈوب کر کسی نے اسے آواز دی تھی۔ یہ صدا اتنی واضح اور اتنی بے چین کر دینے والی تھی کہ وہ بے تابی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس وقت کس کو اس کی ضرورت ہے ؟

کون اس کو یوں بے تابی سے آوازیں دے رہا ہے؟

"نیند نہیں آ رہی۔" کوشی کی تفکر بھری نرم آواز نے جیسے رات کی سیاہی کو ہلکا سا دھندلا کر دیا۔

"نہیں۔ تمہارے بستر پر آجاؤں ؟" کوشی کو لگا جیسے اس کا جواب ایک آہ تھی۔

"آجاؤ۔" اس نے جلدی سے اٹھ کر اس کے لیے وافر سی جگہ بنالی۔

"تم کیا سوچ رہی ہو بیلا؟" وہ سمٹ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"خواہ مخواہ ہی چھپا رہی ہو۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں سوچ رہی تھی۔ اب۔ اب۔" اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ "اب کیا کروں گی۔ میرا مطلب ہے آئندہ۔ مجھے عجیب عجیب سی آوازیں ڈرا رہی ہیں۔ مجھے آئندہ سے ڈر آ رہا تھا کوشی۔"

"تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔" اس نے سکون سے کہا۔

"آتے ہی تمہیں سنانے سے منع کر دیا۔ ممی کا خیال تھا تم برداشت نہیں کر سکو گی۔ دراصل ایک مہربان آدمی نے تمہارے مقدمے کا سارا کام مکمل کر دیا ہے۔ بابا کا پارٹنر بڑا فراڈی تھا۔ اس نے بابا سے دھوکے سے کاغذات سائن کروا لیے۔ وہ کسی مشترکہ کمپنی پر سرمایہ لگا رہے تھے۔ جو فراڈ تھی۔ اور سنا ہے اپنی وفات سے پہلے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے۔

دیکھو بیلا۔ دنیا میں کتنا فریب ہے۔ وہ ان کا گیارہ سال پرانا پارٹنر تھا۔ ان دونوں نے مل کر گھر کا اثاثہ تک گروی رکھ دیا تھا۔ اس میں ان کو بے پناہ منافع کی توقع تھی۔ لیکن اس کے دل میں بے ایمانی آگئی۔ وہ تو شکر کرو خدا کے ایک نیک بندے نے سارا مسئلہ حل کروا دیا۔ تفصیل تو تمہیں ڈیڈی بتائیں گے۔ لیکن عدالت نے گھر اور گھر کا سارا سامان تمہارے حوالے کر دیا ہے۔" اس نے ایک طویل گہرا سانس لیا۔

یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ اور یوں نہ بھی ہوتا تو اب اس نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا۔

قدرت ہر روز آپ کو ایک نیا سبق سکھاتی ہے۔

پہلے اس نے اس گھر کے اور ان کے مالکوں کے بغیر جینے کا ڈھنگ سیکھا تھا۔ اب کے اس کو ایک اور گھر اور اس گھر میں بسنے والے افراد کے بغیر زندہ رہنے کی تربیت لینی ہوگی۔

ہاں اس وقت وہ بے شک کمزور پڑ رہی تھی۔ لیکن یہ کمزوری محض رات کی تاریکی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ صبح دم وہ پھر ہشاش بشاش ہوگی۔ ہر طرح کی نئی ذمہ داریاں اور نئے حالات کو نمٹانے کے لیے چاق و چوبند۔

پھر وہ اس سے پرانے دوستوں کی بابت ہلکی پھلکی سی باتیں کرنے لگی۔ یونیورسٹی کو ادھورا چھوڑ دینے کے قصے۔ پھر اس نے پاؤں پھیلائے۔ تھوڑا سا تکیہ کھسکایا۔ سر ٹکایا۔ اور جیسے بے فکری کی نیند سو گئی۔

وہ تو بے فکری کی نیند سو گئی۔ لیکن کوشی کو مستقل تشویش میں مبتلا کر گئی۔ آخر وہ وہاں کی باتیں کیوں نہیں کرتی۔ وہ جہاں ایک سال بسر کر کے آئی ہے اس سے مستقل پیچھا کیوں چھڑا رہی ہے۔

کیا اس شہر سے کوئی المناک بات وابستہ ہے۔ اگر ہے تو اسے چھپایا کیوں جا رہا ہے۔ بیلا کئی راتوں سے جاگ رہی تھی۔ وہ خود تو گہری نیند میں چلی گئی۔ البتہ کوشی کی نیند ہوا ہوئی۔ وہ کتنی دیر اٹھ اٹھ کر ٹہلتی رہی۔ آپا اماں تہجد کے لیے اٹھی تھیں۔ باقی ماندہ کمروں میں گہرا سکوت تھا۔ اور ہلکی سبز روشنی۔ پتا نہیں بیلا کے ساتھ کیا بیتی۔ وہ اپنے بارے میں کب کھلے گی۔ کب بتائے گی۔ اور بتائے گی بھی کہ نہیں۔

لیکن واقعی۔ اس کے کچھ بتانے کے ارادے بھی نہیں تھے۔ اس نے زندگی کو اس طرح نئے سرے سے بسر کرنا شروع کر دیا جیسے یہ ایک سال اس کی زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔ ہاں صرف اپنی خود سری ترک کر کے وہ ہر روز صبح ریاض بھائی اور ڈیڈی سے مشورہ کر لیتی۔

☆ ☆ ☆

"ریاض بھائی۔ مجھے ایم۔ اے کر لینا چاہیے۔ کیا خیال ہے۔ میری پڑھائی ادھوری رہ گئی تھی۔" کوشی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پتا نہیں پڑھائی کے ادھورے رہ جانے میں کس پچھتاوے کا دخل ہے۔ گزشتہ ایک برس کے بارے میں وہ شرمسار ہے بھی یا نہیں۔ وہ اپنے فیصلوں پر اب شرمندہ بھی ہے کہ نہیں۔

پھر وہ ریاض بھائی کے ہمراہ یونیورسٹی جاتے ہوئے ڈیڈی سے اجازت لیتی اور ممی سے دعا۔

وہ جاتے وقت جتنی تلخ سی ہو رہی تھی اتنی ہی تابعداری سے اس کی واپسی اس کی شخصیت کو مشکوک بنا رہی تھی۔ ممی ڈیڈی اس کی واپسی سے اس قدر شاداں تھے کہ انہوں نے کبھی اس کی شخصیت کی اس تبدیلی پر غور کی بابت سوچا ہی نہیں۔ "بیلا کو دال چاول بہت پسند ہے۔ دوپہر کو چنے کی دال پکا لینا۔" ممی اس کی یونیورسٹی سے واپسی سے پہلے بوکھلا بوکھلا کر باورچی خانے کے چکر لگاتیں۔

"سلاد بنایا ہے کہ نہیں۔ پھر بینگن کا رائتہ۔ تمہیں کہا نہیں بیلا بینگن نہیں کھاتی۔"

لیکن ممی نے کبھی غور نہیں کیا۔ اس کا لاڈ اس کی ضد، سرکشی سب کیسے ہوا ہوئی۔ وہ کس سکون سے بینگن کا رائتہ الٹ لیتی ہے اور اطمینان سے کھاتی رہتی ہے۔ نہ دال کے لیے رغبت کا اظہار کرتی نہ بینگن سے اکتاہٹ کا۔

وہ واپس آگئی تھی۔ اور ان کی اپنی تھی۔ بس۔

ریاض بھائی کی کینیا سے واپسی اتنی مدت بعد ہوئی تھی کہ بیلا کی شخصیت کی بدلتی تہوں کے بارے میں نہ ان کو علم تھا نہ آگہی۔ وہ ان کی بہن کی دوست تھی اور پیدائش سے وہ اپنی دیوار کے اس طرف اس چھوٹے سے خاندان کو آباد دیکھ رہے تھے۔ بچپن میں انہوں نے کوشی ہی کی طرح اس کی ضدیں پوری کی تھیں۔ اس کے نخرے اٹھائے تھے۔ وہ بہت عرصے بعد ملے تھے۔ اب شاید وہ بڑی ہو گئی ہے اور بردبار۔ بس۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن یہ گوشی تھی جو جانتی تھی وہ واپس بھی آگئی ہے۔ ضدی بھی نہیں رہی۔ بردبار بھی ہو گئی ہے۔
لیکن کیوں؟ کیوں؟

جب عدالت نے ان کے گھر کے تالے کھولے اور متعلقہ سامان اس کی تحویل میں دیا تو گوشی کو گمان گزرا۔ اب وہ ہسٹریک ہو جائے گی۔ چیخیں مار مار کر روئے گی۔ گھر کی ایک ایک چیز سے لپٹ کر پاگلوں کی طرح بین کرے گی لیکن اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ دھول اور مٹی سے اٹے گھر میں اس نے اس سکون سے قدم رکھا جیسے یہاں کوئی نئی بات تھی ہی نہیں۔ جیسے یہاں اس کا سرمایہ کبھی لٹا ہی نہیں تھا۔ پھر اس نے سکون سے اپنے وکیل صاحب سے پوچھا تھا۔

بابا کا وہ پارٹنر جس نے فراڈ کیا تھا۔ اب کہاں ہے؟"

"ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں بی بی۔ جیل میں۔"

"کیا اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر میں اسے معاف کرنا چاہوں۔"

"نہیں بی بی۔ یہ تو اسٹیٹ کا مقدمہ ہے۔ آپ تو اس مقدمے میں پارٹی بھی نہیں بنیں۔ اور اگر ایسے لوگوں پر رحم کھایا جاتا رہے تو قانون، مقدمے، عدالت، فیصلے سب بے ہودہ باتیں بن جائیں گی۔"

انھوں نے فائل بند کر دی۔ چیزوں کی سپردگی کی رپورٹ وصول کر لی۔ اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں آپ کے والد صاحب کا پرانا قانونی وکیل ہوں۔ اور آپ کا خادم۔ آپ کو جس طرح بھی ضرورت ہو میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ انکل۔" اس کے لہجے میں وہی اطمینان اور سکون تھا۔

پھر وکیل صاحب، منیجر صاحب چلے گئے۔ گرد اور مٹی سے بھرے گھر اس کی بیک گراؤنڈ پر کھڑے لوگ۔ اس کے اپنے اس کے بہت نزدیک۔ لیکن پتا نہیں کتنی دور۔

"اگر آپ کی اجازت ہو ڈیڈی۔ میں اس گھر میں رہ لوں۔"

"کیوں نہیں۔" ڈیڈی نے بے ساختگی میں کہا تھا۔

"دونوں گھر تمھارے لیے ہیں۔ جہاں تم خوش رہو۔ تمھیں اطمینان ہو۔"

وہ اکیلی بیٹھی رہی۔ باری باری سب واپس چلے گئے تھے۔ گوشی نے سست قدموں اور مری مری چال سے سوچا تھا۔ اس کو ضرور روکے گی۔ وہ کبھی اس کے بغیر اس گھر میں رہی نہیں تھی۔ اس کو تو دو پل بھی اکیلے بیٹھنا دوبھر ہوتا۔ وہ بہانوں بہانوں سو دفعہ ان کے گھر چکر لگا لیتی اور ہزار دفعہ اسے بلاتی تھی۔ وہ دروازے تک چلی گئی اور بیلا نے اسے نہ پکارا۔

گوشی نے اس کی مدد کے لیے صفائی کروانے کے لیے جن افراد کو روانہ کیا تھا اس نے انھیں بھی واپس کر دیا۔ اب وہ شاید بہت بڑی ہو گئی ہے اسے کسی کی ضرورت نہیں رہی۔ گوشی نے جل کر سوچا تھا۔ لیکن اس کی ذات کی بے چینی کم نہیں ہوئی۔ پتا نہیں وہ وہاں کیا کر رہی ہے۔ کہیں وہ اکیلے بیٹھ کر چپکے چپکے رو نہ رہی ہو کہیں اسے کچھ ہو نہ جائے۔

رات کو ڈیڈی اسے واپس لینے گئے۔ گوشی جلے پیر کی بلی کی طرح صحن میں تڑپتی پھر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ ڈیڈی کے ساتھ بحث کرے گی اور ان کے گھر رہنے کے بجائے اکیلے گھر میں رہنے کو ترجیح دینے

کے لیے دلائل لائے گی۔

لیکن وہ ان کا کہنا مان کر سکون سے ان کے ساتھ چل پڑی۔ اور گوشی نے دیکھا نہ وہ روئی تھی نہ اس کا چہرہ سرخ تھا نہ اس پر کوئی یاسیت طاری تھی۔

صرف اس نے اپنا کمرہ ٹھیک کیا اور فائلیں پڑھنے کی کوشش کی تھی۔

آخر وہ اپنی تزکیہ نفس کے کن مراحل سے گزری ہے۔؟

اس نے اپنی ذات کو کن بڑے امتحانوں سے گزار کر اتنی جلا دی ہے۔ کس نے اس کو کندن بنا ڈالا ہے۔؟ (کون ہے جو آئے اور ان سوالوں کا جواب دے کہ اس نے تو ایک چپ طاری کر لی تھی)

پھر کیمپس سے واپسی پر وہ کھانا کھا کر گھر چلی جاتی۔ کوئی آواز دیتا تو تابعداری سے اتر آتی۔ ورنہ تنہا بیٹھ کر جانے کون کون سی ریاضتیں حاصل کرتی رہتی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کو بیلا عجیب نہیں لگتی ریاض بھائی۔"

وہ صوفے میں اور اخبار میں بیک وقت غرق تھے۔

"عجیب کیوں بھئی۔" انھوں نے لاپروائی سے پوچھا تھا۔

"وہ بہت بدل گئی ہے۔" اس نے خفگی سے کہا۔

"اس کا سب کچھ بدل گیا۔ کیا اسے بدلنا نہیں چاہیے تھا۔" ریاض بھائی نے حیرت سے اس کو دیکھا۔

"اس کے ماں باپ۔ اس کا گھر۔ اس کا شہر۔ اس کے دوست، ساتھی۔ ہر چیز تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ نہ بدلتی؟"

"لیکن یہ سب کچھ اس نے اپنی ضد سے تبدیل کیا تھا۔ اس کو سب منع کر رہے تھے۔"

"اس نے اچھا کیا۔ یہی دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ وہ سال بھر ان حالات سے دور رہی۔ اسی لیے اب اسے صبر آگیا ہے۔"

"وہ اب کسی سے پیار نہیں کرتی۔ اسے ہم میں سے کسی کی ضرورت نہیں۔"

"ارے۔" ریاض بھائی کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ انھوں نے اخبار اٹھا کر دور پھینک دیا۔

"لیکن میں جو کرتا ہوں تم سے پیار۔ اور وہ موٹو بھی۔ وہ کرتا ہے کہ نہیں۔" وہ شرارت سے ہنس رہے تھے وہ ہلکا سا سرخ پڑ گئی۔

"اسے تو کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ اس نے تو مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا۔"

"او وہ۔ تو یہ بات تھی۔" انھوں نے گرا ہوا اخبار دوبارہ اٹھا لیا۔ "میں کہوں گا اس سے۔ کہ بھئی ہماری گوشی سے اس کی منگیتر کی باتیں کیا کرو۔"

وہ دوبارہ غرق ہو گئے۔" وہ خود کو بیلنس کر رہی ہے گوشی۔ خوشیاں اس کو ملیں بھی اور بچھڑتی بھی رہیں اب اگر وہ خود کو رحم کی سی کیفیت میں غرق رکھے اور ایک ہی بات کا رونا روئے تو گزارہ کیسے ہو گا۔"

وہ چپ سی ہو گئی۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ درست۔ لیکن وہ لوگوں کو کیونکر سمجھا پائے کہ اس کا اور بیلا کا تعلق رسم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دنیاداری ایسا نہیں تھا۔ وہ تو سو نہیں سکتی تھی جب تک دن بھر کی روداد اسے سنا نہ لیتی۔ وہ جانتی تھی اب بھی وہ اسی لیے جاگے جا رہی ہے۔ کہ اس نے اپنے دل میں کوئی پہاڑ ایسا راز چھپا رکھا ہے۔

بیلا واپس آئی تو مسلسل ضبط کی وجہ سے خود سے بلند اور بہت برتر لگ رہی تھی۔ جیسے وہ آہستہ آہستہ بہت دور جا رہی ہو۔ خدا جانے اسے 'سپرمین' بننے کا شوق کیوں چرایا ہے۔ لیکن وہ جانتی تھی وہ جہاں بھی جائے اس سے زیادہ دور نہیں جا سکتی۔ ایک دن اسے پلٹ کر آنا ہی پڑے گا۔ بس گوشی کو صرف اس کی واپسی ہی کا انتظار تھا۔

اب وہ لڑکی سی نہیں رہی تھی۔ وہ ریاض بھائی اور ڈیڈی سے بات کرتی تو دفتری فائل کی 'بزنس کی اور دنیا میں جیسے کوئی رو ہی نہیں رہا۔ آدھا دن کیمپس اور آدھا دن گھر سے ملحقہ دفتر میں گزار کر وہ رات کو سونے کے لیے گھر آتی تو باقی وقت دفتری ادق فائلوں کو سمجھنے کے لیے ڈیڈی کے کان کھاتی رہتی۔ ان کے سابقہ مینجر ایک سال کی طویل بیروزگاری کے بعد حال ہی میں کسی کمپنی سے وابستہ ہوئے تھے۔ مالک کی وفات سے جیسے دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اور بیلا کے ساتھ کام کرنے پر وہ خود کو آمادہ نہیں کر پا رہے تھے۔ انہوں نے بیلا کی واپسی کا سنا تو اس سے ملنے آئے۔ مقدمہ جیتنے کی مبارک دے کر اور کام نہ کر سکنے کی معذرت کر کے چلے گئے۔

ریاض بھائی کی چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ سو وہ اس سے زیادہ عرصہ رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور آفس کی جتنی فائل وہ کھول سکتے تھے انہوں نے دفتر چالو کرنے کے لیے شروع کر ہی دی تھیں۔ لیکن دفتر کو بہرکیف ایک باقاعدہ مینجر کی ضرورت تھی۔ کچھ سابقہ لوگ جو ابھی تک بیروزگار تھے بحال ہو گئے۔ جن آٹھ دس لوگوں کی مزید ضرورت تھی ان کی تقرری مینجر کے بعد کی جا سکتی تھی۔ اب بہرکیف اس کے پاس ایک ذمہ داری کی جاب آ گئی تھی۔

اس نے پہلے پہل پاپا کی کرسی سنبھالی تو اسے بہت عجیب لگا۔ لیکن بہرکیف یہ دنیا ہے۔ اس نے سوچا۔ اور اس کو اسی طرح چلنا ہے۔ اور یہ بڑی سستی سی جذباتیت ہو گی اگر وہ کمرہ بدل لے یا کرسی بدل لے۔ ہاں دنیا والوں کے سامنے اسے بہادر ہی بن کر رہنا ہے۔ اور ویسے بھی اب تو بہادری کے بڑے ڈھول کو بجانے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ اس سے ہمیشہ یہی توقع کی جاتی رہی ہے کہ وہ بہادر ہے اور بہادر بن کر دکھائے۔ ہاں ایک شخص جو ہر آزمائش میں اس کی بہادری آزمانے اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ (اور اس شخص کے تصور نے پھر اس کی آنکھیں نم کر دیں) اب جیسے اس کو امتحانوں میں پڑنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

اس نے غیر مرئی سی کنکر آنکھوں کو رگڑ کر پھینک دیا۔

سامنے آویزاں سنہری کلاک 'بروقت اسے اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہتا تھا۔ یہ صبح کے دس بجے ہیں اب دوپہر کے ڈھائی بج گئے ہیں۔ شام کے پونے سات بج چکے ہیں۔

بے بے نے صبح دس بجے کی چائے پیتے ہوئے میرے بارے میں کیا سوچا ہو گا۔ کہ میں دھوکے باز تھی' فراڈ تھی۔ ان سب کو جل دے کر نکل آئی۔ اور آ کر ان سے معذرت کے دو لفظ بھی تحریر نہیں کیے۔ لیکن وہ خان گل سے جھگڑتے وقت ضرور اس کی ڈھال بن جاتی ہوں گی۔ لیکن وہ شخص۔ ہاں جو اس کی لیڈری چمکانے والی عادت سے تنگ پڑ چکا تھا۔ اپنی اسٹڈی میں بند ہمیشہ اس کے خلاف سوچتا ہو گا۔ کہ وہ بھی ایک

لڑکی تھی جو گڑھی اس غرض سے آئی تھی کہ کوئی انقلاب لائے گی۔ دوپہر کے ڈھائی بجے کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں بند خوب خوب اس کو برا بھلا کہتا ہو گا۔ اس کے گلے میں پھر کوئی گولا سا اٹک گیا۔

اس وقت شام کے پونے سات بجے ہیں۔ آہستہ آہستہ ڈائننگ ہال میں جمع ہونے والے لوگوں کو یہ یاد بھی نہیں رہا ہو گا کہ ایک مستقل طور پر آباد رہنے والی کرسی اب خالی پڑی ہے۔

ہاں ایک شخص تھا۔ جو اس کے لیے گھڑی دیکھتا تھا۔ جو اس کا منتظر تھا۔ لیکن اب وقت اور زمانے کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔

اس ڈوبتی شام میں جب گڑھی میں سردی اور اندھیرا بڑھتا جا رہا ہو گا تو کیا ڈھائی تین ماہ کا یہ وقفہ ان کو ایک لڑکی کے بھلا دینے کے لیے کافی نہیں ہو گا۔

کیا وہ واقعی اتنی غیر اہم ہے۔ کیا اس کو بھلا دینا بالکل آسان ہے۔

اس کا جی چاہا وہ کسی کو کچھ سنائے۔ کچھ کہے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح جرات کے اعلیٰ ترین اعزازات دے کر اس کو پیڈسٹل پر بٹھا دیا گیا ہے۔ لہٰذا اب اسے اپنے آنسو بھی خود ہی خشک کرنے ہوں گے۔ کون اس کی مدد کو آئے گا۔ سوائے کاروباری معاملات کے۔ کہ ریاض بھائی کو جانا تھا اور جانے سے پہلے ایڈمنسٹریشن کے سارے سبق گھول کر پلا دینا چاہتے تھے۔

"بزنس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھو۔ ویسے تو دنیا میں آنکھیں کھول کر ہی جینا پڑتا ہے۔ اور جب ضرورت پڑے آنکھیں ماتھے پر رکھ لو۔

جب کسی فائل کے بارے میں فیصلہ کرو آس پاس کی ہر چیز کو بھلا دو۔

جب تک کاغذ کا ایک ایک لفظ نہ پڑھ لو ہرگز دستخط نہ کرو۔ خواہ وہ تمہارا نکاح نامہ ہی کیوں نہ ہو۔

کسی پر اعتبار مت کرو۔ لیکن ہر شخص کو یہ یقین دلا دو کہ وہ آخر شخص ہے جس پر تم یقین رکھتی ہو۔"

اس کا مطلب بزنس کا دوسرا نام منافقت ہے۔ اور منافقت کی زندگی وہ گزار نہیں سکتی۔ اس نے حتمی لہجے میں سوچا۔ لیکن اب جو بھی فیصلہ اس نے کر لیا تھا اس پر بہرکیف اس کو عمل کر کے دکھانا تھا۔

رات کی خاموشی میں وہ بستر پر پڑی گوشی کو رشک سے دیکھتی جو بے خبر نیند سوتی تھی۔ اس کی زندگی میں نہ پچھتاوے تھے نہ دکھ نہ رنج و ملال۔ اسے ملنے کی خوشی تھی نہ بچھڑنے کا خوف۔ ریاض بھائی اور ڈیڈی نے بتایا تھا اس کے گڑھی میں قیام کے دوران ایک بہت معقول آدمی سے اس کی منگنی ہو گئی تھی۔ جس کا تعلق بھی ان کی بزنس برادری سے تھا۔ اس نے گوشی کو اپنے منگیتر کے لیے تڑپتے دیکھا تھا نہ مچلتے۔ ہاں دو ڈھائی ماہ کی تیاری کے بعد ان کی شادی ہو جانا تھی اور بس۔ کتنی قابل رشک زندگی ہے۔ غیر محسوس طریقے پر اس کو احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں سے کوئی گیلی گیلی چیز مسلسل ٹپک رہی ہے۔

کسی ایسے شخص سے علیحدہ ہونا کتنا تکلیف دہ ہے جب کہ آپ خود کو بھی ساری عمر یہی یقین دلاتے رہیں کہ وہ شخص کبھی بھی آپ کے لیے اتنا اہم نہیں کہ آپ اس سے بچھڑ کر آنسو بہائیں۔

اور کون جانے یہی منافقت ہے یا عزت نفس پر چلنے والا سیدھا راستہ۔

اس نے پچھلے آنسو پونچھے تو آگے بہہ آنے والے آنسوؤں نے آنکھیں اور چہرہ تر کر دیا۔

کتنے افسوس کی بات ہے بیلا رانی۔ اس نے خود کو بڑے دلار سے تنبیہ کرنے کی کوشش کی۔ رات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے اس پہر میں سولہ سال کی لڑکیوں کی طرح کسی ایسے شخص کے لیے آنسو بہاتا جو اپنے گرم اور آرام دہ کمرے میں چین کی نیند سو رہا ہوگا۔

☼ ☼ ☼

"بیلا۔ بیلا۔" کوشی اسے تواتر سے پکارتی جھنجھوڑ رہی تھی۔

مجھے اب کسی کو یاد نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے خاموشی سے اٹھ کر اپنا تھکا ہوا سر دن بھر کے مشقت کرتے بازوؤں پر ٹکا لیا۔

"بیلا پلیز کیا ہوا ہے۔" کوشی ننگے پاؤں ہراساں سی کھڑی تھی۔

بیلا شرمندہ سی ہو گئی۔ وہ جانے کتنا روئی تھی۔ اور کتنی دیر سے رو رہی تھی۔

"سوری۔ کوشی۔ میں نے کوئی فضول سا خواب دیکھا تھا۔"

"کیا دیکھا تھا تم نے خواب میں۔" وہ خاموش ہو کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ "تم نہیں تمیں کر رہی تھیں۔"

"میں خود کو سمجھا رہی تھی کوشی کہ مجھے رونا نہیں چاہیے۔" کوشی نے چڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا غصہ ڈھکا چھپا نہیں تھا اس۔ لیے اس نے جھنجھلا کر کہہ دیا۔

"تم کیا چھپا رہی ہو۔ بیلا اور کیوں؟"

"میں کیا چھپاؤں گی۔ اور کیوں؟" اس نے بے ساختگی میں ہی جواب دیا۔

کوشی چپ سی رہ گئی۔ "ٹھیک ہے اگر تم سمجھتی ہو تمہیں مجھ سے کچھ نہیں کہنا چاہیے تو یہ بھی ٹھیک ہے۔" اس نے اس کو اٹھتے اور روٹھتے دیکھا۔

"بات یہ ہے کوشی۔" اس نے اطمینان سے کہنا چاہا۔

"میں جہاں رہتی تھی۔ اس علاقے میں ایک بہت بڑی ٹریجڈی ہو گئی تھی۔ وہاں کے سردار کے بڑے بھائی اچانک فوت ہو گئے۔ جس دن میں نے سفر کیا ناں۔ اس دن۔"

"سردار کے بڑے بھائی۔ تو پھر سردار تو وہ خود ہوئے۔"

"ہاں۔" وہ ہچکچائی۔ "یہ ایک لمبی کہانی تھی۔ وہ روپوش تھے اچانک سامنے بھی آئے اور ختم بھی ہو گئے۔"

"کیا تم ان سے محبت کرتی تھیں؟"

"نہیں۔ لیکن ہاں۔"

"نہیں بھی۔ اور ہاں بھی۔۔۔"

"میرا مطلب محبت تو کرتی تھی لیکن اس طرح نہیں جس طرح تمہارا مطلب تھا۔"

"جس طرح میرا مطلب تھا اس طرح تم کس سے محبت کرتی تھیں؟" اس نے ایک دم کوشی کی قطعی سنجیدہ اور سنگین سی آنکھوں کو دیکھا۔

ارے یہ تو دہی تھی۔ اس کی ساری عمر کی دوست۔ بے جھجک کو جانے والی۔ بے دھڑک دخل دینے والی۔ جو اس کی اتھاہ کو پہنچاتی تھی۔ جو اس کے اندر جھانکنا جانتی تھی۔ اور اس سے زیادہ اس کو کون پہچان

سکتا تھا۔ اور اس سے بچ کر بھاگ کر بھی کہاں جا سکتا تھا۔

اس نے فرار کے بہت راستے چنے تھے۔ لیکن اب ہر راستے پر ایک رکاوٹ تھی۔ اس کی دو شتابہ سی تیز اور ذہین نظریں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ اب شاید بچنا مشکل تھا۔ خالی راستہ کہیں بھی نہیں تھا۔

(ہاں بیلا۔ مجھے تمہاری واپسی کا انتظار تھا۔ مجھے پتا تھا یہ راستے میری طرف ضرور آئیں گے۔)

"وہ ایک شخص تھا۔" اس نے آہستگی سے کہنا چاہا۔

"ظاہر ہے بہت اچھا ہوگا۔ لیکن یہ رونا دھونا کیوں۔"

"دراصل۔" اس نے ہچکچا کر کہنا چاہا۔ "پتا نہیں۔ یہ کہنا کتنا مشکل کام ہے لیکن دراصل اس کو مجھ سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں تھی۔"

"کیوں۔ یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا۔"

"کیونکہ اس نے اس سے مختلف اور کوئی بات کبھی نہیں کہی۔"

"یہ کہی تھی کہ اسے تم سے دلچسپی نہیں۔"

"نہیں۔ یہ بھی نہیں کہی۔ مگر۔"

"مگر کیا۔ self pity اگر اسے تم سے محبت نہیں تو تم اس کے لیے کیوں رو رہی ہو۔"

"اتفاق سے اس وقت میں خود کو یہی والی بات سمجھا رہی تھی کوشی۔" وہ کھسیا سی گئی۔

"لیکن میں تمہیں یہ نہیں سمجھا رہی۔ جو تم بھی ہو۔ کیا اسے پتا ہے تم کہاں رہتی ہو۔"

"نہیں۔"

"اس سے مل کر آئی ہو؟"

"نہیں۔"

"بتا کر۔؟؟"

"نہیں۔"

"تم ہمیشہ اسی طرح فرار حاصل کرتی ہو۔ تم نرگسیت کا شکار تو نہیں۔ تمہیں یہ سوچ سوچ کر مزا آتا ہوگا کہ لوگ تمہارے لیے کیسے تڑپتے ہیں؟"

"بکواس مت کرو۔"

"اچھا نہیں کرتی۔" وہ اپنے بستر پر واپس چلی گئی۔

"انا کے زخم بڑے کاری ہوتے ہیں۔ اور اس کا درد دو چار دن کے لیے نہیں عمر بھر کے لیے ہوتا ہے۔ سوچ لینا بیلا۔ پھر آخری فیصلہ کرنا۔" کوشی یہ اطمینان قلب کر کے لیٹ گئی تھی۔

لیکن بیلا کو بے چین کر گئی۔ سو یہ آخری رات تھی جو اس نے رو کر کاٹی۔ آئندہ اسے رونا نہیں ہے۔ آنسو جیسا قیمتی سرمایہ یوں داؤ پر لگانے کے لیے نہیں ہوتا۔ اس وقت گڑھی کے پرسکون وسیع کمرے میں سونے والے کے لیے آنسو بہانا حماقت ہی تو تھی اور جانے اس سے بار بار ایسی ہی حماقتیں کیوں سرزد ہوتی تھیں۔ پھر اس نے خود کو کام میں گم کر لیا۔

ڈائری رجسٹرز نکال کر اس نے پرانی پرانی چٹھیوں کے جواب لکھوائے ڈسپیچ شدہ لیٹرز کے ریمائنڈرز

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روانہ کیے اور دفتر کو باقاعدہ دفتر بنا کر اس نے اپنی زندگی باپ کے راستے ہی کے لیے وقف کر دی۔

اس دن ان لوگوں کو دفتر کا منیجر تلاش کرنا تھا۔

یہ بے روزگاری کی حد تھی کہ ایک بے حد موٹی فائل اس کی میز پر آج کے انٹرویو کے لیے تیار ہو گئی۔ ڈیڈی کسی ضروری کام سے ان دنوں اپنے آفس میں مصروف تھے۔ اور ریاض بھائی نہایت لاپروائی سے اسلام آباد روانہ ہو گئے تھے۔ انھیں فارن آفس سے متعلق کوئی کام تھا۔ ورنہ بھی جاتے لیکن جانے سے پہلے انھوں نے ببلا سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کی عادت ڈالو۔ انگلی پکڑ کر بزدل چلتے ہیں یا بچے۔ تم بچہ ہو نہ بزدل دھوکا تو کوئی بھی کھا سکتا ہے۔ میں بھی اور تم بھی۔ بہتر ہو گا کہ اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرو۔ نقصان اٹھانے کی عادت ڈالو گی تو فائدے میں بھی مزا آئے گا۔"

ریاض بھائی دشمن نہیں تھے۔ وہ فیصلہ بھی ٹھیک ہی کرتے تھے۔ اسے دشمنوں کے درمیان گزاری بہت سی شاموں میں سے دوستوں کو تلاش کرنا تھا۔

اس نے موٹی سی فائل کھولی جس میں کچھ نہیں تو ساٹھ ستر درخواستیں مع بائیو ڈیٹا موجود تھیں۔ ان سب کو آج ہی میں تو نمٹانا ناممکن تھا۔ اور اس نے ریاض بھائی کی پہلی نصیحت ہی یک قلم رد کر رکھی تھی۔ اس نے اس فائل کو کھولا تھا نہ پڑھنے کی زحمت کی تھی۔

شاید آہستہ آہستہ وہ عادی بھی ہو جائے۔ لیکن فی الحال تو اسے شدید کوفت ہوتی۔

نام۔ ولدیت۔ سن پیدائش۔ ڈومیسائل۔

وہ اتنی موٹی فائل کی ایسی بے ہودہ باتیں کہاں تک پڑھے۔ ہاں انٹرویو دینے لوگ آئیں گے تو ان کا صفحہ بھی تفصیل سے پڑھ لے گی۔

پرویز رحیم۔ ولد رحیم الدین۔ سن پیدائش انیس سو فلاں۔ سابقہ تجربات اور ڈگریوں کا ڈھیر۔ اس نے پرویز رحیم کو بلایا اور انٹرویو کرنے لگی۔ دوست اور دشمن کو برت کر تو تمیز کرنا مشکل نہیں ہوتا لیکن صرف ایک صفحے پر لکھی روئیداد اور التجا کرتی نظروں سے کیا دیکھے اور کیسے پہچانے۔

دلدار علی۔ عبداللطیف اعوان۔ محمد اسلم۔

پندرہ پندرہ بیس بیس منٹ کے اس انٹرویو کے شروع والے حصے نے ہی اسے تھکا ڈالا تھا۔

غیر معمولی صلاحیتوں والے نوجوانوں کی کمی نہیں اور بے روزگاری عام ہے۔

چوہدری سعید۔ اس نے فائل گھسیٹی اور نیا صفحہ پڑھنے لگی۔

چپڑاسی کی ہمراہی میں آنے والے نئے امیدوار نے لمحہ بھر کے لیے اس کو ساکن کر دیا۔ پتا نہیں زمین اپنی جگہ سے سرک گئی یا آسمان کی گردشوں میں کوئی انقلاب آ گیا یا...

رات کی بے خوابیوں میں دیکھے جانے والے ایک بے ربط سے تصور نے کسی زندہ خواب کی شکل اختیار کر لی۔

وہ کشاں کشاں دروازے سے چلتا آ رہا تھا۔ اس کا اٹھتا ایک ایک قدم جیسے اس کے دماغ اور اعصاب

پر دھمک کی طرح بج رہا تھا۔ دھم۔ دھم۔ دھم۔

وہ نظریں اٹھا کر دیکھے

اپنی نگاہوں پر یقین کر لے یا بے یقینی کے اس لمحے کو آنے والے سفر کی گرد سے اٹے جوتوں پر نظریں جمائے جمائے ٹال جائے۔

اس نے کرسی گھسیٹی اجازت بھی چاہی۔ اور بیٹھ بھی گیا۔

وہ وہیں تھی اس طرح۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں الجھائے۔ بے سبب اور بے طرح دھڑکتے دل کو ڈپٹ کر قابو میں کرنے کی کوشش میں مگن۔ نہ اس نے مخاطب کی طرف دوسری نظر پھینکنے کی جسارت کی تھی نہ فائل پر دھرے کاغذ کو ایک سے دوسری مرتبہ دیکھنے کی جرأت۔ وہ جنبش کا خطرہ مول لینے کو بھی تیار نہیں تھی۔ جانے یہ طلسم کدہ کس نے بنایا ہے۔ اور کب ٹوٹ جائے۔ کب کا سینے میں اٹکا ہوا ایک دبا دبا سانس آہستگی سے اس کے دھڑکنوں سے آزاد ہوا۔

"ہوش میں آ گئیں آپ؟" بلاشبہ یہ لہجہ اجنبی تھا نہ انداز تخاطب۔ وہ دل چیرتا ہوا طنزیہ لہجہ اور لہجے کا ساتھ نہ دیتی مسکراتی آنکھیں۔ آپس میں الجھی ہوئی انگلیاں ہلکے سے لرز گئیں۔

"میں آپ کی تلاش میں بہت دور سے آیا ہوں۔ امید ہے آپ نظر کرم کریں گی۔" وہ طنز اڑاتا سا مسکراتا لہجہ مؤدب انداز میں اس کی طرف جھکا۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اس جاب کے لیے مجھ سے بہتر آدمی آپ کو پورے پاکستان میں کہیں نہیں ملے گا۔"

"ٹھیک ہے رجب دین۔" کتنی دیر بعد اس کے حلق سے مرے مرے انداز میں پھسلا۔ "تم جاؤ۔" وہ خاموشی سے جیسے چپڑاسی کے دروازے کی طرف بڑھتے قدموں کو گنتی رہی۔ ایک دو۔ تین پھر باقی امیدواروں اور ان دونوں کے درمیان بڑا سا چوبی دروازہ حائل ہو گیا۔

ایک طویل اور پراسرار گہرے سکوت کے درمیان وہ اس کی گھیراؤ کرتی نظروں سے بچنے کے جتن کرتی بوکھلاتی رہی۔

"کیسے آئے آپ؟" اس طویل الجھن سے بچ نکلنے کا صرف یہی سرا اس کے ہاتھ لگا۔

"آپ نوکریاں بانٹ رہی ہیں۔ ہم نے سوچا لگے ہاتھوں ہم بھی گنگا میں ہاتھ دھو لیں۔"

"آپ تو خود نوکریاں بانٹتے ہیں۔" اس نے میز کی شفاف سطح سے نظریں اٹھائے بغیر پوچھا تھا۔ "آپ نوکری کا کیا کریں گے؟"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"اور سب لوگ کیسے ہیں؟" کتنی دیر سے روکتے روکتے اس کے اندر سے نکلا۔

"آپ کی بلا سے۔" انھوں نے کرسی گھسیٹ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "باہر جتنے بھی امیدوار ہیں ان میں مجھ سے زیادہ مستحق اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اجازت چاہوں گا۔"

وہ آئے بھی۔ بیٹھے بھی اور چلے بھی گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے اس طرح حیران اور ساکت چھوڑ کر جیسے رات کی اولین نیند میں کوئی ادھورا سا کچا کچا خواب دیکھے۔ وہ اپنا کوئی پتا نشان چھوڑ کر نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں اس شخص کو ان راستوں کی نشاندہی کس نے کی تھی۔ رجب دین میکانکی انداز میں دوسرا امیدوار لے آیا۔ شاید یہ اصلی چوہدری سعید تھا۔ یا کوئی اور تھا۔ اس کا بے ربط، بے خبر ذہن جیسے کسی ایک نقطے پر مرکوز ہونے سے قاصر رہ گیا۔

"بے بے کے پاس اس کا پتا تھا یا نہیں تھا؟"

کبھی اس نے بندے آل کو تفصیل سے اپنے بارے میں بتایا تھا۔ کیا انھوں نے اپنی موت سے پہلے دانیال خان کو کچھ بتایا ہوگا۔ یا جذبہ دل اور اس کی کشش وغیرہ جیسی بے ہودہ باتوں میں کوئی حقیقت ہے؟۔

اس کا دل کسی دلیل پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ سکون سے بیٹھ کر تجزیہ کرنے کا وقت آنے اور جانے میں ہی نکل گیا۔ ہاں اگلا امیدوار منتظر تھا۔ آنکھیں جھکائے لیکن سر اٹھائے۔ کہ بیگم صاحبہ سوالوں کا سلسلہ شروع کریں۔ اور روزگار اور بے روزگاری کے چکر سے آزاد ہو پائیں۔

اس نے ساری ذہنی صلاحیتوں کو جمع کرنے کی کوشش کی لیکن ذہن جیسے سویا سویا ناکارہ اور بے کار سا ہو گیا۔ اچھل کر حلق میں آکر دھڑکنے والا دل ابھی تک ہموار نہیں ہوا تھا۔ اور اب تو ذہن اس بے یقینی کی کیفیت سے گزر رہا تھا کہ آیا اس نے حقیقت میں کچھ دیکھا بھی تھا یا نہیں۔

اس کا دل چاہا وہ اس انٹرویو کو ادھورا چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے سب کو بھول بھال جائے۔ انٹرویو کو ریاض بھائی کے آنے تک اٹھا رکھے کہ اس کا نیم خوابیدہ سا ذہن غلط اور درست فیصلہ کرنے میں ناکام جا رہا تھا۔

وہ معذرت کر کے اٹھی۔ ملحقہ غسل خانے میں پانی کے بہت سے چھینٹے اس نے اپنے چہرے پر ڈالے۔ تولیے سے منہ خشک کرتے ہوئے اس نے خود سے کہا۔ یہ بچکانہ پن ہے اور جب سال بھر اس نے اس آگ کے شعلوں سے اپنا دامن بچائے رکھا تو اب برف کے تودوں میں جھلسانے میں کیا دانشمندی ہوگی۔ ایک گرم چائے کی پیالی امیدوار کو دے کر اور ایک اپنی پی کر اس نے عارضی طور پر خود کو ہموار کر ہی لیا۔

پھر وہ بظاہر اطمینان سے انٹرویو کے شغل میں مصروف ہو گئی۔

کہ دو بجے اس کو چیف اکاؤنٹنٹ کی چٹھی موصول ہوئی جس پر لکھا تھا۔

"آپ کو لنچ پر بلوایا جا رہا ہے۔ امیدواران کو کل بلوا لیجیے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔"

ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اس نے حیرت سے دیکھا صبح سے انتظار میں بیٹھے امیدواران کو کل پھر بلوا لیا جائے۔ کیا زندگی میں ان کو کوئی کام نہیں کرنا سوائے ایک قطار میں آکر لگ جانے کے۔

اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ مجید صاحب اپنی جانب سے معذرت کر کے انہیں رخصت کر رہے تھے۔ اور شاید ایسا ہوتا ہی رہتا تھا کہ انھوں نے برا نہیں منایا۔ وہ حیرت اور افسوس سے دیکھتی رہ گئی اور لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔

وہ کھانے پر جانے کو ٹالنا ہی چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کوشی اس کو پکڑ ڈالے گی۔ چہرے سے گری ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی اور شیشہ بتا رہا تھا کہ اس پر گزری ساری واردات حرف بہ حرف اس کے چہرے پر

لکھی ہے۔ اس نے تھوڑا سا ماتھا اور دھویا۔ وہ کوشی سے خوفزدہ سی یوں تھی وہ جان جائے گی لیکن منہ سے کچھ نہیں کہے گی۔ ایک اور پیغام کھانے کے سلسلے میں اس وقت موصول ہوا جب وہ غسل خانے کے شیشے کے سامنے کھڑی چہرے پر لکھی داستان کھرچ رہی تھی۔

اسے اب جانا ہی ہوگا۔ پہلے وہ دیوار کے اس طرف اسٹول رکھ کر دوسری طرف چھلانگ لگا جاتی تھی لیکن اب اسی دیوار میں شگاف ڈال کر ایک عارضی دروازہ بنا دیا گیا تھا۔ تاکہ سڑک پر جائے بغیر اندر ہی اندر تعلق رکھا جا سکے۔

وہ برآمدے میں پہنچی تو کھانے والے کمرے میں شور سا برپا تھا۔ یقیناً" ریاض بھائی اس کے ساتھ دھوکا دہی کی واردات کر کے فارن آفس نہیں گئے تاکہ اسے ان تمام جھمیلوں سے تنہا ہی نمٹنا پڑے۔

اور اسی لیے لنچ پر اس قدر زور دیا جا رہا ہے۔

ریاض بھائی سے اچھی طرح نمٹنے کے لیے اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اپنی جگہ پتھر ہو گئی۔ سارے جسم سے خون جمع ہو کر اس کے چہرے پر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ تپتا ہوا سرخ چہرہ۔ جیسی کڑھی کے آتشدان میں سلگنے والے انگارے۔ ہاں اگر گڑھی سے کوئی چیتا آکر کوشی کے برابر والی کرسی پر بیٹھا ہنس رہا ہوتا تو اسے اتنی حیرت نہ ہوتی۔ لیکن وہ چیتا نہیں تھا۔ اور یہ دن دہاڑے تصور کی دنیا میں دیکھے جانے والے ڈے ڈریمز بھی نہیں تھے۔

"السلام علیکم۔" انھوں نے بہت دیر پہلے کہا تھا۔ اور وہ اس کے احترام میں جب سے مودب کھڑے بھی تھے۔

"بیٹھو بیٹی۔" ڈیڈی نے پلیٹ کر اس کی طرف تنبیہ سے دیکھا۔ "کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

وہ ہوش میں آگئی تھی۔ اور اس کو ہوش و حواس سے بیگانہ کرنے والا شخص بڑے اطمینان سے اس کے اعصاب بکھیر کر اپنی کرسی سنبھال چکا تھا۔

"تم نے خان صاحب کو کھانے پر اتنی دیر کروائی۔ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" ڈیڈی کے لہجے کی شفقت اور جھڑک دونوں ہی پاپا جیسی تھیں۔ اور اس کی ان کو ہمیشہ کی عادت سی ہو گئی تھی۔

"سوری ڈیڈی۔" اس نے مدہم سے لہجے میں کہا۔

"ڈیڈی۔ بیلا کا انٹرویو تھا نا آج۔" کوشی نے چہرے کی سنجیدگی بحال کر کے ذرا سا سر باہر نکالا۔

"بیلا تم دانیال بھائی سے کیوں نہیں ملیں؟"

وہ جھینپ سی گئی۔ جیسے وہ مدتوں ان کے درمیان رہتے رہے ہوں۔ جیسے وہ اس گھر کے ہی فرد تھے اور ابھی کہیں چھٹی گزار کر واپس آئے تھے۔

"میں ملی ہوں۔ اسلام علیکم۔"

وہ سکون سے کرسی پر بیٹھے تھے۔ مسکراتی آنکھوں اور طمانیت سے مسکراتے چہرے کے ساتھ صبح کے مقابلے میں بالکل تازہ دم اور ہشاش بشاش تھے۔ جیسے واقعی یہ ان کا گھر تھا۔ اور یہاں کچھ بھی اجنبی نہیں تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہم تو ہمیشہ دانیال خان کے ممنون رہے ہیں۔" ڈیڈی نے ڈونگے ان کی طرف بڑھائے۔

"یہ دانیال خان ہی تو تھے جو تمہاری خیریت کی اطلاعات ہم تک پہنچاتے رہے۔ تمہارے بھیجے ہوئے تحائف لاتے۔ اور تمہارے پیغامات۔ اور اگر دانیال خان اتنی محنت نہ کرتے تو اتنی آسانی سے تمہارا کاروبار واپس بھی نہ ملتا۔"

اس کا منہ حیرت سے کھلا تھا لیکن زبردستی اس نے بند کر لیا۔

ان کے چہرے پر خفت تھی نہ شرمندگی۔ جیسے اس میز پر کسی نے کوئی غلط بیان دیا ہی نہیں اس نے پلیٹ سامنے کی اور خاموشی سے سر نیچے کر لیا۔

گوشی چونچال ہو رہی تھی۔ اور ایسی شوخی اور چونچالی اچھے دنوں کے بعد اس نے بھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔ وہ مسلسل دانیال خان سے کیا کہہ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں تو ایک لفظ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ دماغ میں بجتے ہوئے جیسے ہتھوڑے کی ٹھک ٹھک اور شاں شاں کرتے کان۔

ممی نے اس سے دن بھر کی مصروفیت کے بارے میں پوچھا تھا۔

اور ڈیڈی نے انٹرویو کی تفصیل مانگی۔ اور اس کو پتا بھی تھا کہ روزگار کی خاطر دنیا ہی ترک نہیں کر بیٹھتے لیکن ایک مکمل فقرہ۔ ایک پورا جملہ اس کے کانوں نے نہیں سنا۔

"آپ کھانا شروع کیجیے نا۔" دانیال خان نے ہی اس کو مشکل سے نکالا تھا۔ وہ بھی اس سہولت سے جیسے یہ ان کا اپنا گھر ہے۔ وہ اس کے سامنے گھر پر اپنا حق جتا رہے تھے۔

"بیلا نروس ہو رہی ہے۔" گوشی کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ اس کا جی چاہا گوشی کی اس حماقت پر اس کو چانٹا مارے۔ اس نے اچھا اس کو چوک میں کھڑا کر کے تماشا بنایا تھا۔

"کیوں۔ نروس کیوں ہو رہی ہے؟" ممی بوکھلائیں "تھک گئی ہو گی۔ خاک گوشی۔ کبھی تو ڈھنگ کا لفظ بولا کر۔"

"سوری ممی۔ میرا ذخیرۂ الفاظ اچانک ختم ہو گیا ہے۔ میں اس وقت اپنے آپ میں نہیں ہوں۔" سوری ممی کے بعد کا سارا فقرہ اس نے زیر لب بڑبڑا کر کہا تھا۔

اس نے ایک نظر گھور کر گوشی کی طرف دیکھا۔ گوشی اس کی ناراضگی سے ہمیشہ خائف رہی تھی۔ لیکن اس وقت وہ سود و زیاں سے بالاتر ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ اپنے ساتھ بیٹھے شخص کی شہ پر اس کا تماشا لگوا رہی تھی۔

اس نے ایک نظر دانیال خان کی طرف ڈالی۔ وہ اس کو جیسے جادو کی پھونک سے ساکن کر کے بے نیاز سے ہو گئے تھے۔ لاپروائی سے کھانا کھاتے اس کو خاص طور پر بے توجہی سے نوازتے ایک ایک شخص سے مخاطب تھے۔

تم میرے دل کے ہر موسم سے آگاہ ہو۔ مسٹر دانیال خان۔
میں بھی تمہیں بھسم کر سکتی ہوں۔ تم جانتے ہو بدلہ لینے میں میرا ابھی کوئی مقابلہ نہیں۔
اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

"اور گھر میں سب لوگ کیسے ہیں؟" اس نے تمسخر اڑاتی نگاہوں سے عین ان کی شرارت کرتی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اور ذرا اب کہہ کر دکھاؤ۔ آپ کی بلا سے۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے جیسے بے یقینی کی کیفیت میں رہے۔ اس نے خود پر قابو پا لیا ہے۔ ہاں وہ اسی طرح خود کو سرزنش کرتی رہتی ہے۔ اسے اپنے آپ پر بلا کا عبور حاصل ہے۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔" وہ بالکل سنجیدہ ہو گئے۔ "آپ کو یاد کرتے ہیں۔"

"بے بے؟"

"بے بے بھی اور سب بھی۔"

سب سے زیادہ یاد کرنے والا تو اب تھا ہی نہیں۔ وہ تھوڑی دیر چپکی رہی۔ پھر اس نے بال دوبارہ اپنے رنگ میں کر لی۔

"اور انہوں نے میرے لیے کیا بھیجا ہے؟"

"آپ کے لیے۔" انہوں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور خالی نکال لیا۔

"کچھ بھیجا تو ہے۔ شاید بیگ میں ہے۔"

"کیا چیز ہے؟ کس نے بھیجی ہے؟"

"پتا نہیں۔ میں نے کھول کر نہیں دیکھی۔ بے بے نے بھیجی ہے۔" انہوں نے سنجیدگی کا خول چڑھائے رکھا۔

"اور آپ انہیں لے کر کیوں نہیں آئے؟" وہ جال بچھا رہی تھی اور قدم قدم پر ان کو لڑکھڑا کر گرانے میں اسے مزا بھی آ رہا تھا۔ وہ اب تک کامیاب تھی۔ انہوں نے ایک نظر اس کی آنکھوں کی فاتحانہ چمک کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کا ڈرامائی وقفہ دے کر انہوں نے اس کی آنکھیں اپنی گرفت میں کر لیں۔

"آپ کہتی ہیں تو انہیں بھی لے آؤں گا۔"

ان کے لہجے کی معنی خیزی کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ کم از کم میز کے چاروں کناروں پر۔ وہ لڑکھڑا گئی اس کی ساری حاضر جوابی اور ذہانت ایک دم جیسے بھاپ ہو گئی۔

انہیں تھوڑا سا ملال بھی ہوا۔ خوامخواہ خود کو سکندرِ اعظم سمجھنے والی لڑکی کو انہوں نے چاروں شانے چت کر دیا تھا اس کے چہرے پر ہلکی سی زردی آ گئی۔ اس نے ڈیڈی اور دانیال خان کے مابین گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا۔

اسے آفس میں کچھ کام تھا۔ اس نے گھر والوں اور ان کے مہمان سے معذرت کی اور خاموشی سے گھر آ گئی۔ دن کی تیز شعاعیں کھڑکی کے راستے کمرے میں آ رہی تھیں۔ اس نے پردے گرا دیے۔ بیڈ کور الٹ کر پھینکا۔

یہ وہی کمرہ تھا۔ اور وہی اس کا محبوب پلنگ۔

کہ جب وہ یہاں سے گئی درد کی اس نوعیت اور غم کی اس شدت سے ناواقف تھی۔ اس کے گرد ایک جال سا بچھایا جا رہا ہے۔ اس میں کون کون شریک ہے؟ کون کون ہے جو یوں سرِ محفل اس کا ڈرامہ رچا کر خوش ہو رہا ہے۔ وہ نہ اس کہانی کے خالق سے آگاہ تھی نہ کرداروں سے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہاں وہ کمرہ بند کر کے سکون کے بہانے ان سے چھپ سکتی تھی۔ سو چھپ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس نے رائی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی سنی اور اس کا مخصوص ہارن بھی جو اس گھر کے سامنے خوب زور سے بجایا گیا تھا۔ یہ ہارن بجانے والا ہاتھ گوشی کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا۔ پھر جیپ نکل گئی۔

وہ کہاں گئے تھے۔ وہ کیا چاہتے تھے۔

اور یہاں تک کیسے آ پہنچے تھے؟ وہ یہ سمجھنے سے بالکل عاجز تھی۔

کتنی دیر وہ سیدھی پڑی چھت کو تکتی اپنی ذہنی صلاحیتیں استعمال کرتی رہی۔ پھر تھک کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ یہاں جس لیے بھی آئے تھے ان کے رویوں میں واضح فرق ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ یہ ان کا گھر نہیں تھا۔ لاکھ وہ اس کے مالک بن کر بیٹھیں۔

اسے لگا اس نے آنکھیں ہی بند کی تھیں اور کھول دیں۔

کوئی اس کا دروازہ پیٹ رہا تھا اور گرے ہوئے پردوں کے پیچھے تاریکی پھیل رہی تھی۔

بے ساختگی ہی میں اس نے کلاک دیکھا۔ وہ سات آٹھ گھنٹے سوتی رہی تھی۔

اب دروازے کے پیٹے جانے میں شدت آ گئی تھی۔ جیسے دروازہ توڑ دیا جائے گا۔

یہ آیا اماں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ یا رحیم چاچا۔ وہ کتنے دنوں سے اس کے اٹھتے رکتے قدموں پر بسم اللہ پڑھ پڑھ کر پھونک رہے تھے۔

اس نے دروازہ چوپٹ کھولا اور خجل سی ہو گئی۔

غیر معمولی نیند سے بوجھل متورم آنکھیں۔ الجھے بکھرے بال۔ سلوٹوں سے بھرے بے ترتیب لباس میں۔

"آئی ایم سوری۔" آنے والے نے آہستگی سے کہا۔

"سب گھر والے سمجھے آپ ہمارے ساتھ ہیں۔ ابھی ابھی آپ کی گمشدگی کی اطلاع عام ہوئی ہے۔"

"میں دیر تک سوتی رہی۔ سوری۔" وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے رسمی سے فقروں کی زد میں کھڑے رہے۔

وہ کتنی دیر اس کے چہرے پر پھیلی زردی اور دن بھر سوئے رہنے کے باوجود اس کا پژمردہ چہرہ دیکھتے رہے تھے۔

"میں نے یہاں آ کر تمہیں پریشان کر ڈالا ہے۔ ہے نا؟" انھوں نے نرمی سے اس کے دروازے کی چوکھٹ سے کمر لگالی۔

"اور یہ عجیب بات ہے میں ہمیشہ تمہارے لیے پریشانی کا سبب بنا رہا ہوں۔ حالانکہ ایسا میں نے کبھی نہیں چاہا بیلا۔" وہ خاموش رہی۔ اس کے پاس ان سارے الزامات کا جواب بھی نہیں تھا۔

"میں جانتا تھا جو خوشیاں تم سے چھن گئیں۔ وہ تو میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ لیکن تمہیں مزید الجھنوں سے بچانے کے لیے شاید اس سے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ بہت مدت ہوئی، گوشی کا ایک خط میرے نام آیا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس نے یہ پتا یونیورسٹی لائبریری سے پرانے اخبار کھنگال کر نکالا ہے۔ اس نے یہ معلوم کرنا چاہا تھا کہ آیا بیلا نام کی کوئی لڑکی یہاں ہے؟ اس سے مجھے اندازہ ہوا شاید تم گھر سے ناراض ہو کر آئی ہو۔

میں تمہارے بارے میں تفصیلات لینے گوشی کے گھر تک آیا تو مجھے انکل جمشید نے سب باتوں سے آگاہ کیا۔ یہ اتفاق ہی تھا بیلا۔ یا شاید تمہاری گھر کی ہمسائیگی جس نے ایک مدت مجھے اس گھر میں رکھا۔ بے بے کو میں نے اطلاع دی میں مرغزار میں ٹھہرا ہوں۔ لیکن جب تک یہ مسئلہ مکمل طور پر حل نہیں ہوا۔ میں نے تمہارا سامنا نہیں کیا۔ مجھے گوشی نے بہت مرتبہ نصیحت کی تھی کہ کوئی تمہارا دل نہ دکھانے پائے۔ یہ اس وقت کی بات ہے بیلا تم خوب اچھی طرح کئی مرتبہ میرا اپنا دل دکھا چکی تھیں۔"

"میں نے آپ کا دل کبھی نہیں دکھایا۔" وہ جیسے بے بسی سے کھڑے سے بیٹھ گئی۔ اسے لگا اس کے پیروں میں مزید کھڑے رہنے کی جان نہیں ہے۔

کواڑ سے ٹیک لگائے اس نے رندھی سی آواز میں کہا۔

"الٹا۔ آپ ہر وقت مجھے برا بھلا کہتے رہے ہیں۔"

"تم نے مجھے کوئی اچھی بات کہنے کا موقع ہی کب دیا ہے۔ ہر وقت گھوڑے پر سوار تم ہنٹر اٹھائے رکھتی ہو۔ اور اپنا آپ بچانے کے لیے مجھے کسی بھی لڑکی کے حوالے کرنے کو ہر وقت تیار۔" وہ گھٹنوں کے سہارے اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

"بے بے کو تو میں تمہاری خواہش کے مطابق لے ہی آؤں گا۔ لیکن فی الحال یہ انگوٹھی میرے ہاتھ سے ہی پہن لو۔" انھوں نے انگوٹھی ڈبیا سے نکال کر ڈبیا دور کھاس پر اچھال دی۔

"جی نہیں۔ میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔" اس نے اپنی انگلیاں ان کے ہاتھ کے شکنجے ایسی گرفت سے چھڑانی چاہیں۔

"گو انگریزوں جیسی رسم ہے سر کیف۔" انھوں نے اس کی انگلی میں وہ سنہری سا چھلا چڑھا ہی دیا تھا۔

"اور کمال۔ بہنہ میں نے تو سنا ہے آپ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی بھی رہی ہیں۔ اور خود کو منع بھی کرتی رہی ہیں کہ محبت جیسا موذی مرض آپ کو نہ لگے۔ کہیں آپ کی دعائیں قبول نہ ہو جائیں۔ اسی لیے تو ہم بھاگتے دوڑتے یہاں پہنچے ہیں۔"

وہ بری طرح جھنجھلا کر اپنے ہاتھ ان کی گرفت سے آزاد کرانے لگی۔ "یہ گوشی کی بچی سے تو میں نمٹ لوں گی۔" بے ساختگی میں قہقہہ لگا کر ہنستے اس نے انہیں پہلی دفعہ ہی دیکھا تھا۔

"دیکھا۔ تم ہمیشہ اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا کر بھاگتی رہی ہو۔ حتیٰ کہ مجھے زخمی حالت میں چھوڑ کر بھی۔"

"ہے بیلا یہاں۔" ٹوٹے دروازے کے شگاف سے ہانپتی کانپتی گوشی نے اندر قدم رکھا اور اس کے دوڑتے قدم ڈیہار پر آ کر رک گئے۔ جس کی انگوٹھی کا نگینہ اس کی عزیز از جان دوست کی انگلی میں جگمگا رہا تھا۔ جس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کا دمکتا رنگ انگوٹھی کے قیمتی پتھر کو ماند کیے دے رہا تھا۔

"گڑھی کے لوگوں کو تمہارا شدید انتظار ہے بیلا۔ بے بے کو شیریں اور نثار کو خان لگل کو۔ حتیٰ کہ قیمت خان کو۔ وہ ایک اور جان کو قربان کرنے پر تیار نہیں۔ بستی کے لوگ۔ وہ تم سے کتنا پیار کرتے ہیں' یہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انھیں اب معلوم ہوا ہے۔"

بیلا کے خوبصورت سے ہاتھ دو مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں تھے۔ محفوظ اور مامون۔
دل کا اطمینان اس نے پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر برستے دیکھا۔ رنگوں کی پھوار اور نرم محبت بھرے جذبوں کی بارش میں۔ جھینپ کر مسکراتی اس کی دوست۔

اس نے دوڑتے دوڑتے دونوں باہیں پھیلا کر ان دونوں کی گردن میں اٹکا دیں۔

○ ○ ○ ○ ○